ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

آدمی کے روپ

مصنّف

یش پال

مترجم

سہیل عظیم آبادی



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
نئی دہلی

۱۹۸۴ء (۱۸۹۶)

Original Title : MANUSHYA KE ROOP (Hindi)

Urdu Translation: AADMI KE ROOP

قیمت :- -/12

تقسیم کار

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

نئی دلی ۱۱۰۰۲۵ ، دلی ۱۱۰۰۰۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۳ ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا A-5 گرین پارک نئی دلی ۱۶ نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج دلی ۶ میں چھپوا کر شایع کیا۔

نذر

جو ساتھی انسانیت کی بگڑی ہوئی شکل کو اس کی اصل حالت
میں لانے کے لیے نہ صرف اپنی جان بلکہ سب کچھ قربان کر رہے
ہیں، انھیں سب ساتھیوں کو : : : : : : :

یشپال

فہرست

یش پال اور ان کا ناول - آدمی کے روپ

ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح ہندی میں بھی ناول کا ارتقا انیسویں صدی کی پانچویں دھائی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ کئی لحاظ سے افراط وتفریط کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ان کی زبان، ادب اور تہذیب سے ہندوستانیوں کا ربط پیدا ہوا اور بڑھتا گیا۔ جدید ادب کے ارتقا کا پہلا قدم ہندی میں "بھارتندو یگ" کے نام سے مشہور ہے۔ ہندی میں آج بھی یہ بحث جاری ہے کہ ہندی کا پہلا ناول کسے مانا جائے۔ کچھ دنوں پہلے تک لالہ شری نواس داس کے "پریکشا گرو" (1882) کو عام طور پر ہندی کا پہلا ناول سمجھا جاتا تھا لیکن اچاریہ رام چندر شکل نے اپنے ہندی ساہتیہ کا اتیہاس (تاریخ ادب ہندی) میں شردیا رام پھلوری کے "بھاگیہ وتی" (1877) کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ناول بہت دنوں تک نایاب تھا مگر اب شایع ہو گیا ہے۔ البتہ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ انگریزی طرز کا پہلا ناول جو شایع ہوا وہ لالہ شری نواس کا "پریکشا گرو" ہی ہے۔

ان ابتدائی ناولوں کے بعد بالکرشن بھٹ، رادھا کرشن داس، لجا رام شرما، کشوری لال گوسوامی، اجودھیا سنگھ اپادھیائے، ہری اودھ اور برج نندی سہائے وغیرہ کے ناول آتے ہیں۔ ان ادیبوں کی ساری توجہ سماجی برائیوں اور ان کی اصلاح کی طرف رہی ہے۔ بال کرشن بھٹ کے "نوتن برہم چاری"، کا مقصد نوجوان طلبا کو بے راہ روی سے بچانا تھا انھیں کے دوسرے ناول "سو انجان ایک سجان" کا موضوع بھی بری صحبت کی خرابی اور اس کی اصلاح ہے۔ رادھا کرشن داس کا "نسہائے ہندو" گاؤ کشی کے مسئلے کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ ہری اودھ کا "ٹھیٹھ ہندی کا ٹھاٹھ" اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ وہ پریم چند سے بہت پہلے ذات پات اور بے جوڑ شادیوں جیسی رسم وروایات کے

خطرناک نتیجوں کی طرف اشارے کرتے ہیں۔
ان سماجی، اصلاحی اور نصیحت آموز ناولوں کے کچھ ہی بعد ناولوں کا ایک دوسرا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور طلسمی، عیّاری، جاسوسی اور تفریحی ناول سامنے آتے ہیں۔ ان ناولوں کا سرچشمہ عربی اور فارسی کی تخلیقات اور طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ تھیں۔ دیوکی نندن کھتری، گوپال رام گہمری اور کشوری لال گوسوامی وغیرہ اسی قبیلے کے ناول لکھنے والے ہیں۔ ان ناولوں میں راج کمار، راج کماریوں کے عشق و محبت اور ان کی اس سلسلے میں کارگزاریوں کا دل چسپ بیان ہوتا ہے۔ کہانی کے چھوڑے ہوئے سروں کو تو کئی کئی حصّوں کے بعد پھر پکڑا جاتا ہے جس سے تجسّس اور کش مکش کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سے سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کے درمیان کہانی ابھرتی ہے اور آخر میں حریف کو شکست دے کر اور طلسم کو توڑ کر ہیرو ہیروئن کو حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح ان ناولوں کی بنیاد خیالی واقعات پر ہوتی ہے۔ اسی روایت کے علم بردار تیسرے ادیب کشوری لال گوسوامی ہیں۔ اس دور میں یہ اکیلے ناول نگار ہیں جنھوں نے سماجی، جاسوسی، طلسمی اور تاریخی ناول لکھے ہیں۔ پہلے کے ناول نگاروں کے مقابلے میں ان کے ناولوں میں کرداروں کے ارتقا اور مکالموں کی برجستگی پر زیادہ توجّہ دی گئی ہے۔ ان کے تاریخی ناول بنیادی طور پر رومانی ہیں جن میں تاریخی واقعات کے بدلے عشق و محبت کا بیان زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے۔ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے ان کے ناول کرداروں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ کہاوتوں اور محاوروں کا برجستہ اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ ان سے کھڑی بولی کی ترقی میں بڑی مدد ملی ہے۔
چالیس پینتالیس برسوں میں ہندی ناولوں کی اس ترقی کو کسی حد تک سُست رفتار کہا جا سکتا ہے خاص کر پریم چند کے ہم عصر ناول نگاروں کی تخلیقات کو پیش نظر رکھ کر۔ پریم چند کو ان کے سوانح نگار بیٹے نے انھیں قلم کا سپاہی پریم چند کہا ہے۔ پریم چند کے ابتدائی ناولوں کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو بھی ہندی میں ان کا تخلیقی دور صرف اٹھارہ برسوں (1938 – 1918) تک محدود ہے۔ اس مدت میں ناولوں کی ہیئت اور مواد میں انھوں نے انقلابی تبدیلی کی۔ صرف تفریح اور دل چسپی کو واحد مقصد ماننے سے انکار کرتے ہوئے انھوں نے اس کی دل چسپی کو برقرار رکھا اور اپنے دور کی سیاسی اور سماجی ہلچلوں کی وسیع کینواس پر تصویر کشی کی۔ کسانوں پر ہونے والے مظالم کو بے نقاب کر کے

اس کے خلاف احتجاج کیا ہے، وہ ہندی ہی نہیں دوسری ہندوستانی زبانوں کے لیے بھی سرمایۂ افتخار رہے ہے۔ ان کے ناول "پریم آشرم"، "رنگ بھومی"، "کرم بھومی"، اور "گئودان"، وغیرہ میں ان دو دہائیوں کے ہندوستان میں سماجی و سیاسی تبدیلیوں اور عوامی بیداری کا بڑا دل کش اور مکمل بیان ملتا ہے اور اسی معنی میں پریم چند کے ان ناولوں کو ڈاکٹر نامور سنگھ نے "کامیڈی ہیومن" کہا ہے۔

پریم چند کے بعد ہندی افسانوی ادب میں سماجی احساس کی اس رو کو آگے بڑھانے والے ناول نگاروں میں یش پال کا نام سرفہرست ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند نے اس کام کو جہاں چھوڑا تھا یش پال نے وہیں سے اٹھا کر اس میں سیاسی شعور، عوامی بیداری اور ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز اٹھائی اور دوسرے آواز اٹھانے والے ادیبوں کی حمایت کی۔ یش پال کا راستہ جینندر، اگیہ، اور الاچندر جوشی کی طرح نفسیاتی الجھنوں کے بیان کا راستہ نہیں ہے اور نہ اپنے احساس کے کرب اور تصوراتی و غیر حقیقی انقلابی زندگی کا طویل ذاتی تجربہ ہے۔ ان کی زندگی جدوجہد کی بھٹی میں تپ کر اسپات بنی تھی۔ وہ بھگت سنگھ، آزاد، سکھدیو اور بھگوتی چرن کے قریبی ساتھی رہے تھے اور برطانوی سامراج کے خلاف ان کی نفرت بہت تیکھی تھی۔ اس دور کی بڑی دل چسپ یادداشت انھوں نے تین حصوں میں "سنگھاؤلوکن" کے نام سے لکھی ہے۔ دراصل ان یادداشتوں کو پڑھے بغیر یش پال کی نفسیات کا پورا اور صحیح تجزیہ کیا ہی نہیں جا سکتا جو ان کی ساری تخلیقات میں رواں دواں ہے۔

جہاں تک یش پال کے ناولوں کا تعلق ہے ان میں شروع سے آخر تک گہرا سماجی اور سیاسی شعور رچا بسا ہوا ہے۔ لیکن اس سیاسی شعور کے باعث ان کی مخالفت بھی کم نہیں ہوئی اور اس مخالفت میں غیر مارکسی تو تھے ہی، مارکسی نقاد بھی شریک تھے۔ خاص طور پر ڈاکٹر رام بلاس شرما کا نام پیش پیش ہے۔

"دادا کامریڈ" (1941) سے "میری تیری اس کی بات" (1972) تک (یہ طویل ناول ابھی ہندی میں کتابی شکل میں شایع نہیں ہوا ہے) یہ سماجی اور سیاسی شعور کسی نہ کسی شکل میں یش پال کے یہاں موجود ہے۔ 'دادا کامریڈ' میں 1929—33 کے درمیان ہندوستان کے سیاسی پس منظر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جب ملک میں برطانوی سامراج کی شیطانی طاقتیں سرگرم عمل تھیں۔ بڑے بڑے انقلابیوں کو یا تو پھانسی دی جا چکی تھی یا جیلوں میں

ٹھونس دیا گیا تھا اور جو چند لوگ باہر رہ گئے تھے وہ مہم کی ناکامی پر جھلائے ہوئے تھے۔ ستیہ گرہ کے گاندھی وادی طریقوں پر ان کا ذرا بھی یقین نہیں تھا اور روسی انقلاب اور اس سے متعلق لینن کے تجزیے سے یہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ تشدد کا راستہ بہت کارگر نہیں ہے ورنہ یہ بھی کہ ملک گیر تحریک کے لیے عوام کا تعاون بے حد ضروری ہے۔ 'دادا کامریڈ' کا ہریش اسی خیال کا نمائندہ ہے۔ اس کے فکر اور عمل کے پس منظر میں یش پال کے گہرے اور عملی تجربوں کی چھاپ ہے۔

تشدد پسندی سے سماج واد تک کا ذہنی سفر شروع کر کے "دیش دروہی" (1942) "تین پارٹی کامریڈ" (1946) اور "منش کے روپ" (1946) میں یش پال نے اپنے خالص کمیونسٹ کرداروں، ڈاکٹر بھگوان داس کھنہ، گیتا اور بھوشن وغیرہ کی تخلیق کی ہے۔ ان ناولوں سے جہاں متوسط طبقے کے نوجوانوں کے سیاسی رجحان پر روشنی پڑتی ہے وہیں کمیونسٹ کارکنوں اور ان کے خیالات پر لگائے جانے والے الزامات کی تردید بھی ہوتی ہے حالاں کہ ان کرداروں پر بھی کم الزامات نہیں لگائے گئے۔ یش پال کے یہ سارے کردار انسانی کمزوریوں سے بھرپور مگر سچے، سادہ دل، ایمان دار اور نیک ارادوں کے لوگ ہیں جو اپنے سیاسی آدرشوں اور باہمی تعلقات کو لے کر گہری انسانی ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ "ودّیا" (1945) اور "اپسرا" (1956) تاریخی پس منظر پر مبنی ناول ہیں جو مردوں کے بنائے ہوئے سماج میں عورتوں پر ہونے والے مظالم اور زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے عورت کی آزادی پر زور دیتے ہیں اور غلاموں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کی بڑی مؤثر اور کامیاب تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اپسرا میں اشوک کے پس منظر میں امن عالم کے مسئلے کو ابھار کر توسیع پسندی کی پالیسی پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

سماجی ناولوں میں "جھوٹا سچ" (دو حصوں میں 1958 اور 1960) یش پال کی سب سے اہم تخلیق ہے جس میں ملک کی تقسیم کی دردناک کہانی بڑے وسیع کینوس پر پھیلائی گئی ہے۔ اس کے ہیرو جے دیو پوری کی وساطت سے یش پال نے ان خطروں کی طرف اشارہ کیا ہے جو کسی متوسط طبقے کے نوجوان کے ادبی شعور اور انقلابی فکر کو آسانیوں کی زندگی میں کند کر کے سماج دشمن کردار کی شکل میں کھڑا کر سکتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے ذاتی مفاد اور برطانوی حکومت کی سازشوں کے شکار عوام (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل

ہیں) کے کرب کی بڑی پُر اثر تصویر اس ناول میں کھینچی گئی ہے۔ دوسرے حصے "دیش کا بھوشیہ" میں حکمران نیتاؤں کی شکل میں جو ایک نیا طبقہ ملک کی دھرتی پر پھیلا اس کی گھناؤنی حقیقت کا یش پال نے پردہ فاش کردیا ہے۔ 'جھوٹا سچ' کا خاتمہ اس پُراعتماد اعلان کے ساتھ ہوتا ہے .... "دیش کا مستقبل چند نیتاؤں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس کی جنتا کے ہاتھ میں ہے"!....

زیرِ نظر ناول ایک پہاڑی بیوہ نوجوان عورت سوما کے ذریعہ مختلف حالات اور سماج کے مختلف طبقات میں آدمی کے بہت سے روپوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ناول کا کینواس بہت وسیع ہے جو کانگڑا کی پہاڑی سڑک سے شروع ہوکر بمبئی میں ختم ہوتا ہے اور درمیان میں دھرم شالہ، لاہور اور شملہ بھی ناول کی گرفت میں آتے ہیں۔ پہاڑی سڑک پر پہلی بار دھن سنگھ کے ٹرک سے کچلتے کچلتے بچنے والی شرمیلی اور شکی سوما کن کن حالات سے گزر کر مشہور فلمی ہیروئن پہاڑن بنتی ہے اور حالات کے دباؤ ہیں، جس نے دھن سنگھ کے پیار میں اپنا گھر چھوڑا، آخر میں اسی دھن سنگھ کو پہچانتے ہوئے بھی پہچاننے سے انکار کردیتی ہے۔ یش پال محبت کو مثالی اور نہ بدلنے والی حقیقت مان کر چلنے والے خیالات کی تردید کرتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ محبت بھی ہماری سماجی اور معاشی حالات کی پیداوار ہے اور حالات میں تبدیلی آجانے پر وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح بھوشن اور منورما کے تعلقات میں بھی طبقاتی احساس موجود رہتا ہے جو منورما کو بھوشن پر کامل اعتماد رکھنے کے باوجود اس سے بہت دور دھکیل دیتا ہے اور اسی باعث بہت معمولی جان پہچان کی بنیاد پر اسے ستلی والا سے شادی کرلینی پڑتی ہے جو بالآخر طلاق پر ختم ہوتی ہے۔ الگ الگ نوجوان لڑکیوں کے تعلق سے یش پال سماج میں عورت کی خود اعتمادی کی بات کرتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خود کفیل اور خود اعتماد عورت ہی ہر سمت سے ہونے والی زیادتیوں کا مقابلہ کرسکتی ہے۔

بیرسٹر جگدیش نرولا، اس کے کلب کے ساتھیوں یا پھر ستلی والا وغیرہ کے ذریعہ یش پال نے نام نہاد باعزت لوگوں کے سماجی اور اخلاقی کھوکھلے پن کو بڑی صفائی اور خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ طنز کے فن میں یش پال ماہر ہیں، اور ایسے مقامات پر وہ اپنی مخصوص ادا کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ کے دنوں میں فوج اور پولیس کا تشدد، سرکار کی دھاندلیوں اور فوج میں کالے گورے کے فرق کو یش پال نے بڑے سنجھے

انداز میں پیش کیا ہے اور عوام پر جنگ کے ہولناک نتائج کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔
خواہ پہاڑوں کی کٹھن زندگی ہو یا فلموں کی چمک دمک والی زندگی، ہر جگہ مرد عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ جنگ میں شوہر کے مارے جانے کے بعد سسرال میں جانور سے بھی زیادہ خدمت کرنے کے باوجود سوما کو دو روٹیوں کا ٹھکانا نہیں۔ اور منو شاہ کے مشورے پر اس کے ساس سسر اسے بیچنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ بمبئی میں بھی جب وہ مالی لحاظ سے خوش حال اور مطمئن ہے ... "دنیا میرے گلے میں باہیں ڈال کر کھیلنا چاہتی ہے لیکن بانہہ تھام کر سہارا دینے کو کوئی تیار نہیں ہے ...." اسی طرح یش پال نے سماج میں پھیلے ہوئے بے جوڑ اور متضاد خیالات کو تیکھے انداز میں اُبھارا ہے۔ منورما کے طلاق کے معاملے میں پارٹی، دفتر کے ساتھیوں اور خاص طور پر کامریڈ بنیتا کا رویّہ، اس سلسلے میں یش پال کے نقطۂ نظر کو واضح کر دیتا ہے طلاق کے خیال سے منورما کو آزادی اور توہین کا ملا جلا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو سمجھا لیتی ہے ... "نجات کے لیے غلط روایات سے بھی نجات ضروری ہے ..."
آخر میں 'منشیہ کے روپ' (آدمی کے روپ) کی زبان کے بارے میں بھی کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے شایع ہونے پر دھن سنگھ اور اس کے ساتھیوں، ٹرک ڈرائیوروں اور کلینروں کی زبان، خاص طور پر بول چال میں ان کی گالیوں پر ہندی میں سخت اعتراضات کیے گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے ذہنی آلائشوں کا نتیجہ بھی کہا ہے۔ لیکن اسی کتاب میں اور بہت سے ایسے کردار ہیں جو گالی نہیں دیتے ہیں۔ کسی آدمی کی زبان اس کے ماحول سے وابستہ ہوتی ہے اور اس ماحول کی کامیاب عکاسی کے لیے اسے اس کی اصلی شکل میں پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ زبان آزادانہ طور پر نہ مہذب ہے اور نہ غیر مہذب۔ وہ کسی خاص حالت میں ہی کوئی مطلب رکھتی ہے اور خاص موقعوں پر ہی اس کے ذریعہ اس کی معنویت یا لغویت کو پرکھا جاسکتا ہے۔ حکومت، انتظامیہ وغیرہ کی مخالفت سے لے کر زبان کے آدرش تک یش پال میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو انھیں نئے ادب سے وابستہ کر دیتی ہیں اور شاید یہی چیزیں ہیں جن میں ان کے خیالات کے سرچشموں کی تلاش کی جانی چاہیے۔

"مدھو رلینش"

پہاڑی سڑک پر

انگریزی سرکار نے طے کر لیا تھا کہ پٹھان کوٹ سے آگے پہاڑی علاقے میں بھی ریل چلائی جائے۔ کانگڑہ کے پہاڑوں کو چیر پھاڑ کر اُن پر لوہے کے راستے بنا دیے گئے۔ چھوٹے چھوٹے انجن اپنے پیچھے چھوٹی چھوٹی ریل گاڑیاں باندھے، ہانپتے، دم توڑتے، چھک چھک شور مچاتے اور بہت سا دُھواں اُگلتے، لوہے کے راستوں سے پہاڑوں کے پھیلے ہوئے جسموں پر کھنکھجوروں کی طرح رینگنے لگے۔

پہاڑوں کی مغرور فطرت نے انسان کے اِس پندار اور غلط جُرأت کی مخالفت کی، جیسے بھینس سُدھ میں آنے پر اپنے بدن پر رینگنے والے کیڑوں کو گرا دینے کے لیے اپنے بدن کو تھرکا دیتی ہے، ویسے ہی یہ پہاڑ ریل گاڑیوں کے رینگنے کی سرسراہٹ محسوس کرکے اپنے بدن کو ہلانے لگے۔ کبھی پہاڑ کا کوئی حصّہ بھربھرا کر لائن پر آ گرتا، یا دراڑ پھٹ جاتی۔ لوہے کی لائنیں اور شہتیریں کچّے دھاگے کی طرح تڑخ جاتیں۔ سرکار نے اپنی ریل لائن کو بیچ ناتھ سے سمیٹ کر نگروٹا تک ہی محدود کر لیا۔

اب بھی پٹھان کوٹ سے کلّو منالی تک مسافروں اور مال کی آمد و رفت سوا دو سو میل سے زیادہ فاصلے تک زیادہ تر سڑک کی راہ سے موٹروں کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ یہ سڑک ایسی ہے کہ مسافروں کو "موٹر لگ جاتی ہے"۔ میدانوں میں رہنے والوں کے لیے موٹر لگ جانا ایک پہیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن پہاڑوں پر رہنے والوں کے لیے نہیں۔ موٹر لگ جانے کا اندازہ اُونچے جھُولے میں بہت دیر تک لگاتار جھُولنے کے نتیجے میں لگایا جا سکتا ہے۔

اِس سڑک میں زیادہ تر اُونچی چڑھائیاں، پھسلتی ڈھلوانیں اور قدم قدم پر کوہنی جیسے موڑ ہیں۔ ایک طرف ہریالی اور پھولوں سے بھری چٹانیں اُونچے قلعوں کی دیواروں کی طرح کھڑی ہوئی ہیں۔ اِن چٹانوں کی چوٹی کو دیکھنے کی کوشش میں سر سے ٹوپی گر جاتی ہے۔ سڑک کے دوسری طرف پتھّروں سے بھری پہاڑی کھڈیں ہیں یا پچاس ساٹھ ہاتھ کی گہرائی پر سفید جھاگ اُگلتے نیلے دھارے

ہیں۔ سڑک کے موڑوں کی وجہ سے کبھی سامنے، کبھی داہنے، کبھی بائیں اور کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑی برف ایسی دکھائی دیتی جاتی ہے جیسے دُھوپ سے بچنے کے لیے پہاڑوں نے سر پر سفید انگوچھے ڈال لیے ہوں۔

کہیں کہیں سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے پہاڑی کھیت چوڑے چوڑے زینوں کی طرح اُترتے یا چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اِن کھیتوں میں یا ڈھلوانوں پر چرتے پہاڑی جانور، تیز چال سے چلتی گھرگھراتی موٹروں کی طرف دیکھنے کے لیے، پھیلی، چمکتی آنکھیں اُٹھا کر جمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کبھی یہ بھیڑ بکریاں، چھوٹے قد کی گائیں یا خچر سڑک کے کنارے بنی ہوئی مُنڈیر کو پھاند کر سڑک پر آجاتے ہیں۔ اور موٹروں سے ملاقات یا مذاق کرنے کے لیے موٹر کے سامنے جھجک جاتے ہیں۔ یہ جانور موٹروں کو اور موٹر ڈرائیور اِن جانوروں کو بھانپ چکے ہیں۔ پل بھر کو موٹر سے آنکھ ملائی، جھجکے، سہمے، ذرا سینگ دکھائے، موٹر نے ذرا سی گھُڑکی دی اور راہ کاٹ لی، اور وہ جانور مُنڈیر پھاند کر کھیت یا ڈھلوانوں میں کود جاتے ہیں۔

سڑک سے دکھائی دینے والے اِن نظاروں کا لطف مسافر عام طور پر نہیں لے پاتے۔ وہ چکّر کھاتی موٹر کی چال سے چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے، کپڑے کا کنارہ مُنہ میں دبائے رہتے ہیں۔ اِن کا رُواں رُواں سہرتا رہتا ہے۔ اگر موٹر داہنے یا بائیں ایک اِنچ بھر جگہ بھی چُوک جائے تو اُن کا کہیں پتہ بھی نہ ملے۔ وہ یہ سفر خطرے میں پورا کرتے ہیں۔ روزانہ اِن سڑکوں پر چلنے والے موٹر ڈرائیوروں کی عمر کیا ہوتی ہوگی؟ ۔ وہ اپنی چوکس اور ساکت نظر سڑک پر جمائے کوئی گیت گنگناتے یا سگریٹ پھُونکتے چلے جاتے ہیں۔ انھیں اِس کی عادت ہوگئی ہے۔

دھن سنگھ لگ بھگ ڈیڑھ برس سے اِس سڑک پر موٹر چلا رہا تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ وہ دوپہر سے کچھ پہلے کلّو سے چلا تھا۔ منڈی پار کر کے ڈر پیدا کرنے والی سیدھی اور ڈھلوان سڑک پر بیج ناتھ کی طرف بے فکری سے عادت کے مطابق ہوشیاری سے چلا جا رہا تھا۔ اُس کی جمی ہوئی نظر سڑک پر لگی ہوئی تھی۔ سڑک تیزی کے ساتھ اُس کی لاری کے پہیوں کے نیچے سے پھسلتی جا رہی تھی، جیسے مشین کے پہیوں پر پٹّا پھسلتا جاتا ہے۔ موٹر کے اسٹیئر پر اُس کی جمی اُنگلیاں سڑک کی حالت کے مطابق اسٹیئر کی رفتار کو تیز یا کم کر رہی تھیں۔ موٹر کے بائیں طرف پھیلی ہوئی گھاٹی کے کنارے کنارے موٹر پہاڑیوں پر سے چلی جا رہی تھی۔ گھاٹی کی ہریالی جاڑے پالے سے پیلی پڑ کر سنہری رنگت اختیار کر چکی تھی۔ سورج ڈھل رہا تھا جیسے گھاٹی کی پچھمی سرحد پر چیڑ کے درختوں سے ڈھکی پہاڑیوں کے تکیے پر اپنا سر ٹکا دینا چاہتا ہو۔

دھن سنگھ کو صرف نو میل آگے سیج ناتھ تک ہی پہنچنا تھا۔ سواریوں کی چیں چیں اور بخ بخ کی اُسے کوئی فکر نہیں تھی۔ لاری میں آلو کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔

دھن سنگھ کا مددگار، لاری کا کلینر کرمو، لاری کے پچھلے حصّے میں آلوؤں کی بوریوں میں گھونسلہ بنا کر لیٹا ہوا تھا۔ وہ منھ اُوپر اُٹھائے، کانوں میں اُنگلیاں دیے، گلے کی پوری طاقت اور ولولے سے ایک پہاڑی گیت گا رہا تھا۔

"دِلاں دیاں کُنڈیاں کھلائی کنے بو،
پریتاں دیاں ریتاں بُھلائی کنے بو،
دِتا بچھوڑا ابند یا جو۔"

(دل کے کواڑوں کی زنجیر کھول کے
پریت کی ریتیں بُھلا کر
داسی کو ہجر میں تڑپا دیا)

کرمو کی آواز سُریلی تھی اور اُس میں درد بھی تھا۔ لاری کی چال اور انجن کی آواز ساز بن کر گیت کے بیچ تال دے رہی تھی۔ اُونچے سُر سے گائے گیت کا اکثر سُر گاڑی کی تیز چال کی وجہ سے پیچھے اُڑ جاتا تھا۔ دھن سنگھ کو گیت دُور گھاٹی میں سے آتا ہوا سُنائی دیتا تھا۔ دھن سنگھ کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر، پاؤں پیڈلوں کو چھوتے ہوئے، آنکھیں اُڑتی ہوئی سڑک پر، کان گیت کے سُر میں اور دل گیت کے مضمون اور معنی میں ڈُوبا ہوا تھا۔ اِس کی چوکس نظروں میں نمی اور چہرے پر پیار کا جذبہ تھا۔

سڑک پر موٹر کے سامنے کچھ بکریاں اور میمنے دکھائی دیے۔ دھن سنگھ کی اُنگلیوں نے فوراً بھونپو بجا دیا۔ بکریاں اور میمنے کچھ چونکے اور سڑک کی مُنڈیر کی طرف ہو گئے۔ لیکن دو چھوٹے چھوٹے میمنے اپنی دونوں ٹانگیں اُٹھا کر پھر موٹر کے سامنے آ کودے اور اُن پر سایہ کی طرح آ گری ایک عورت۔

مشین کی طرح اچوک پُھرتی سے دھن سنگھ کے پاؤں کلچ اور بریک پر جا پڑے۔ گاڑی اپنی رفتار میں رُکاوٹ پا کر سڑک پر اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ گاڑی کا پُرزہ پُرزہ بول اُٹھا۔ دھن سنگھ کے روئیں روئیں سے پسینہ چھوٹ گیا۔ عورت گاڑی کے مڈگارڈ کا دھکّا کھا کر گر پڑی تھی۔ ایک چھٹپٹاتے میمنے کی ٹانگ اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھی اور دوسرا میمنا اُچھل کر سڑک پار کی چٹان پر کھڑا اِس کھیل سے خوش ہو کر ممیا رہا تھا۔ عورت نے ہاتھ کے میمنے کو محفوظ دیکھ کر اسے چھوڑ دیا۔ اُٹھنے سے پہلے اُس نے آنچل سنبھال کر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

دھن سنگھ کا غصّہ اُبل پڑا تھا۔ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دائیں ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ کھول، سڑک پر کُود کر وہ گاڑی کے سامنے پہنچا۔ بڑی مشکل سے اُس نے پھڑکتی ہوئی باہنوں کو عورت کو پیٹ دینے سے روکا۔ آخر عورت ذات تھی مگر گالیاں اُس کے مُنہ سے نکلتی ہی گئیں ــــ "تیری ماں ــــ پھانسی لگوائے گی ہمیں ؟ بہن۔ ۔ ۔ ۔ توفالتو ہے گھر میں ؟ ۔ ۔ غصّے میں وہ کتنی ہی گالیاں بک گیا۔

وہ عورت ایک ہاتھ سے چوٹ کھائی کمر کو دبائے اور دوسرا ہاتھ سر کو چوٹ لگنے سے بچانے کے لیے اُٹھائے، ڈر سے پھیلی آنکھوں سے، بالکل چُپ دھن سنگھ کو دیکھتی رہی۔ دھن سنگھ نے غصّے کے ساتھ بے بسی محسوس کی۔ وہ اتنی خوفناک شرارت کرنے والے آدمی کو پیٹ کر اپنا غصّہ بھی نہ اُتار سکا۔

جوان عورت یا لڑکی کی آسمانی رنگ کی بڑی بڑی ڈبڈبائی آنکھیں جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔ گھبراہٹ کی وجہ سے سانس جلدی جلدی چل رہا تھا۔ اُبھری ہوئی چھاتیاں پھٹے ہوئے کپڑے سے جھانکنے لگی تھیں۔ لڑکی کو گھبراہٹ میں سینہ آنچل سے چھپانے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ اِس کے اِس گنوار پن نے دھن سنگھ کے بڑھتے ہوئے غصّے کو جھپٹا مار کر بٹھا دیا تھا۔

کرمو یکا یک گاڑی کے رُکنے کے جھٹکے سے گِرتے گِرتے بچا۔ وہ بھی اُتر کر سامنے آگیا۔ جوان عورت کو یوں خوف زدہ نیم عریاں اور کھوئی ہوئی حالت میں دیکھ کر دانت نکال کر دھن سنگھ کو جیسے بناتے ہوئے بولا ــــ "واہ اُستاد، خوب مال ہے۔" اور لڑکی کو پچکارنے کے لیے اُس نے ہونٹوں سے سیٹی بجا دی۔ دھن سنگھ ہنس پڑا۔

دھن سنگھ نے لڑکی سے کہا ــــ "تیرے باپ کو تیرے لیے مرد نہیں ملتا تو یونہی کسی کے ساتھ چل دے۔ ہم غریبوں کا گلا کیوں کٹوانا چاہتی ہے چڑیل۔ دھن سنگھ لڑکی کو سمجھانے کے لیے پہاڑی بولی میں بول رہا تھا۔

لڑکی چوٹ سے سکتہ ہو جانے کی وجہ سے دھن سنگھ کی غصّہ بھری اور تیکھی نگاہوں سے بچنے کا خیال بھی نہ کر پائی تھی۔ اب اپنی بولی میں بات سُن کر اور کرمو کا اشارہ سمجھ کر اُس نے پھٹے پُرانے مَیلے کُرتے سے جھانکتے اپنے بدن کے اُبھاروں کو چھپا لیا۔ اور اُس کی لمبی لمبی پلکیں، آنکھوں کے پانی ملے کچے" دودھ کی سفیدی پر جھک گئیں۔ شرم سے گردن بھی نیچی ہو گئی۔

کرمو نے اپنی خباثت پھر دُہرائی۔ دھن سنگھ بھی ہنس کر بولا ــــ "بھاگوانے، اب اُٹھ! سڑک چھوڑ کر گھر جا! ۔ ۔ ۔ نہیں تو گاڑی میں بیٹھ جا۔ تجھے بھی لے چلوں۔"

لڑکی چوٹ سے کانپتی ہوئی اُٹھی اور سڑک کے کنارے منڈیر کے پاس چلی گئی۔ دھن سنگھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اپنے موٹر کا سوئچ اور اسٹارٹر دبا دیا۔ انجن نے جیسے اُس کے اشارے کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"لے بھائی کرمو"! دھن سنگھ نے کلینر کو پکارا۔ "آگئی مصیبت! شاید بیٹری کے تار ٹوٹ گئے۔"

دھن سنگھ پھر موٹر سے اُترا۔ انجن کا پُرزہ کھول کر دیکھنے لگا۔

کرمو نے لڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا ۔ "ارے بھائی خوب صورت عورت کی نظر بُری ہوتی ہے۔ آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ تو لوہے کی موٹر ہی ہے۔ دیکھو نا انجن مچل گیا۔"

دھن سنگھ نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا جادو کر دیا کالیکا مائی؟ رات یہاں کاٹنی پڑے گی تو کچھ چنا چبینا، روٹی کا ٹکڑا کھانے کو دے گی یا ایسے ہی مارے گی؟"

لڑکی کچھ جواب نہ دے کر سر جھکائے سڑک پار کر کے پاس کی چٹان کے ساتھ کی پگڈنڈی سے اُوپر چڑھ گئی اور نظر سے اوجھل ہو گئی۔

دھن سنگھ نے انجن کھول دیا۔ وہ کبھی ایک پُرزے کو دیکھتا کبھی دوسرے کو۔ موٹر ایسی جمی ہوئی تھی جیسے دل کی رفتار رُک جانے یا پھیپھڑا پھٹ جانے سے کوئی جان دار بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ دھن سنگھ اپنی سمجھ اور ساری صلاحیت لگا کر انجن کو ٹھیک کرنے کا جتن کر رہا تھا۔

کلینر کرمو اپنا ڈھول سے بھرا سر کھجا کر بڑبڑانے لگا ۔ "رات آرہی ہے۔ اِس وقت پیچھے سے کوئی موٹر بھی تو نہیں آرہی۔ تم نے مجھے منڈی میں کھانا بھی نہیں کھانے دیا۔ دو پیسے کے آلوے کر پانی پی لیا تھا۔ میرے پاس کمبل بھی نہیں ہے۔"

دھن سنگھ نے ڈانٹ دیا۔ "کیا بک بک کر رہا ہے۔ پمپ لا کر کنکشن میں ہوا دے۔"

دھن سنگھ موٹر کے نیچے چت لیٹ کر دیکھنے لگا کہ گاڑی نہ ہل سکنے کی وجہ کیا تھی۔ اُس نے وہیں سے پکارا۔ "بھائی کرمو مارے گئے! ارے یونی ورسل جائنٹ ٹوٹ گیا ہے سالی کا۔"

دھن سنگھ چت لیٹا سرک کر باہر آیا۔ ساری کوششیں بے کار تھیں۔ اُس نے گہری سانس لی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب؟"

سامنے تھکاوٹ کی وجہ سے روشنی سے محروم سورج گھاٹی کی سرحد پر کھڑے چیڑ کے جنگلوں کے پیچھے پھسل رہا تھا اور آرام کے لیے سایے اور اندھیرے کی چادر اپنے جسم پر کھینچ رہا تھا۔ نیچے پھیلی ہوئی گھاٹی مٹیلی ہو گئی تھی۔ صرف اُونچائی پر سے گزرتی ہوئی سڑک پر سورج کی آخری پھیکی پھیکی جھلمل

سی کرنیں باقی رہ گئی تھیں۔

دھن سنگھ نے فکر مند اور سنجیدہ آواز میں کہا۔ "بھائی کرمو، میں تو مالک کی گاڑی چھوڑ کر جا نہیں سکتا۔ شاباش بہادر جوان تو چلا جا۔ تو بھوکا بھی ہے۔ یہاں رات میں جاڑے سے پریشان ہوگا۔ پیسے نہیں ہیں تو میں دیتا ہوں۔ یہاں سے دو میل آگے سڑک پر ہولا کی دکان ہے۔ وہاں کچھ کھا لینا۔ تیرے ایسے جوان آدمی کے لیے کیا ہے۔ ذرا لمبے قدم مارتا چلا جا۔ بس آٹھ ایک میل ہوگا۔ دو گھنٹے کی مار ہے۔ بیج ناتھ میں خبر دے دے۔ یونی ورسل جائنٹ ٹوٹ گیا ہے اور انجن میں بھی خرابی آگئی ہے۔ صبح پہلی سروس میں بیج ناتھ سے مستری کو بھیج دیں۔ اِدھر پیچھے منڈی سے تو کل تڑکے پانچ تک کوئی سروس نہیں آئے گی۔"

کرمو غصّے اور جھلاہٹ میں بھنبھناتا ہوا بیج ناتھ کی طرف چلا گیا۔ دھن سنگھ سڑک پر اکیلا رہ گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ میدانی علاقوں کی طرح غروبِ آفتاب اور رات کے درمیان کا شام کا وقفہ دیر تک نہیں رہتا۔ گھاٹی سے اُٹھا اندھیرا جلدی آسمان پر چھا جاتا ہے۔

دھن سنگھ کو پیاس محسوس ہوئی۔ وہ سڑک کے علاوہ اِس علاقے سے بالکل ناواقف تھا۔ سڑک کے دائیں طرف چھوٹی سی چٹان دیوار کی طرح کھڑی تھی اور اُوپر درختوں کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ بائیں طرف گھاٹی میں کھیت، بڑے بڑے، چوڑے زینے کی طرح دُور تک اُترتے، پھیلتے چلے گئے تھے اور دُور کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے تھے۔ گھاٹی کے اِس علاقے کے کھیتوں میں گیہوں کی ادھ پکی فصل لگی تھی۔ کئی کھیت خالی پڑے تھے۔ بائیں طرف کی چٹان سے ایک پگڈنڈی اُتر کر سڑک کو پار کر کے بائیں طرف کھیتوں میں اُتر گئی تھی۔ لیکن کہا نہیں جا سکتا تھا کہ دونوں طرف کی بستیاں کتنی کتنی دُور رہیں۔

گھاٹی میں چھائے ہوئے اندھیرے میں دُور دُھواں سا اُٹھتا دکھائی دینے سے بستی کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ لیکن دُھندلے پن کی وجہ سے دوری کا اندازہ کرنا کٹھن تھا۔ پہاڑوں میں جو چیز ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک پُکار کی پہنچ میں دکھائی دیتی ہے۔ پگڈنڈیوں کی راہ سے دو کوس دور ہو سکتی ہے۔ دھن سنگھ نے اِس غیر یقینی جگہ کی طرف جانے کا خیال چھوڑ کر چٹان کی طرف کی پگڈنڈی پر چڑھ کر دیکھنا ہی مناسب سمجھا۔

دھن سنگھ چٹان پر چڑھ کر پگڈنڈی پر آگے بڑھا۔ پگڈنڈی بانس کی ایک جھاڑی کے پیچھے گھوم گئی تھی۔ آگے گھنی جھاڑیاں تھیں۔ دھن سنگھ نے سوچا، آگے بڑھے یا نہیں۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں

ایک عورت سر پر گھڑا رکھے آتی دکھائی دی۔ عورت کا چہرہ آنچل سے ڈھکا ہوا تھا۔ اِن پہاڑوں میں عورتیں خاندان کے جانے پہچانے لوگوں میں یا زیادہ حیثیت کے لوگوں کے احترام کے خیال سے پردہ کرتی ہیں۔ مگر دھن سنگھ اِس اندھیرے میں گھونگھٹ کی ضرورت کو سمجھ نہ سکا۔ چند قدم نزدیک آنے پر عورت کے چہرے سے آنچل ہٹ گیا۔ دو قدم اور نزدیک آنے پر دھن سنگھ نے عورت کو کپڑوں سے پہچان لیا۔ موٹر کے آگے گرنے والی لڑکی ہی تھی وہ۔ اِس کے سر پر رکھا گھڑا اوندھا تھا۔

"ہم تو پیاس کے مارے پانی مانگنے چلے تھے۔ تیرا تو گھڑا ہی اوندھا ہے۔"

دھن سنگھ اِس انداز میں بولا جیسے اسے جانتا ہو۔

"قسمت اوندھی ہے گھڑا کیا؟" لڑکی نے جواب دے کر گہری سانس کھینچ لی۔

دھن سنگھ نے اپنا پن اور ہمدردی بھرا جواب پاکر، اور لڑکی کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کر کے، اِس کے چہرے کی طرف دھیان سے دیکھا اور پوچھا۔

"رو رہی ہو! بہت چوٹ آگئی کیا؟"

دھن سنگھ کی ہمدردی نے لڑکی کے کسی طرح سنبھالے ہوئے دُکھ کے گھڑے کو ٹھیس لگا دی۔ دُکھ کا گھڑا ڈھلک پڑا۔ لڑکی نے چہرہ پھر آنچل سے ڈھانک لیا اور چُپ کھڑی رہی۔ دھن سنگھ نے اُس کے بدن کی تھرتھراہٹ اور سسکیوں کے پردے میں بھی بھانپ لیا۔ موٹر ڈرائیور کا رُوکھا سلوک ہمدردی میں بدل گیا۔ "بھلی لوگ مجھے کیا معلوم تھا کہ تو یوں سامنے آجائے گی۔ میں نے تو تجھے بچانے کے لیے موٹر توڑ کر رکھ دی۔"

لڑکی نے آنکھیں پونچھ کر آنچل چہرے پر سے ہٹا لیا۔ وہ آنسوؤں کو اپنے بس میں کرنے کے لیے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے تھی۔ بس کا باندھ ٹوٹ جانے پر بول پڑی —— "پردیسیا تجھے مجھ سے ہی کیا بیر تھا، جو اچھی بھلی چلتی موٹر روک دی ورنہ جھگڑا مٹ جاتا روز روز کا۔" رونا بڑھنے کی وجہ سے اُس نے اپنا چہرہ پھر آنچل میں چھپا لیا۔

لڑکی کے رونے کی آواز بھنچے ہوئے ہونٹوں اور آنچل میں دبی ہوئی تھی۔ مگر دھن سنگھ محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ لڑکی تھوڑی دیر رونے کو روکنے کی کوشش میں سسکتی رہی۔ دھن سنگھ کے دل سے ڈرائیور کا چھیڑ خانی کا جذبہ بالکل جاتا رہا۔ اُسے خود تکلیف اور بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ دل، پیاس سے سُوکھے ہوئے حلق تک اُمڈا آرہا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کہے کیا؟ اُس نے پُوچھ لیا —— "پانی کہاں ملے گا۔ بڑی پیاس لگی ہے۔"

لڑکی نے گلے سے سنہ تک اُمڈ آئے آنسوؤں کا بڑا سا گھونٹ پی کر اور آنچل سے آنکھیں پونچھ کر جواب دیا ــــ "پانی پیو گے۔ میں پانی ہی تو لینے جا رہی ہوں۔" لڑکی پگڈنڈی پر آگے بڑھ گئی۔ دھن سنگھ اُس کے پیچھے ہو لیا۔ لڑکی کے پیچھے چلتے دھن سنگھ کے دل میں ہمدردی اور اُسے جاننے کی خواہش اُبل رہی تھی۔ مگر الفاظ راستہ نہیں پا رہے تھے۔ لڑکی چٹان سے نیچے اُتر گئی۔ موٹر کے نزدیک سڑک پار کر کے کھیتوں کی طرف جانے لگی۔ دھن سنگھ نے پوچھا۔ "پانی یہاں دے دو گی یا باؤڑی پر چلا جاؤں۔"

لڑکی نے پیچھے کی طرف گھوم کر جواب دیا ــــ "چاہے یہاں ہی پی لینا، چاہے باوڑی پر آ جاؤ۔ کون لوگ ہو تم ؟"

دھن سنگھ کانگڑہ ضلع ہی کا رہنے والا تھا۔ سوال کے معنی سمجھنے میں اُسے کوئی دیر نہیں لگی۔ اُس نے جواب دیا۔ "کھتری ذات ہیں بھلی لوگ۔ راجپوت ہوں۔"

"تو پھر کیا ہے۔ ہم بھی راجپوت ہی ہیں۔ برتن دے دو۔ بھر لاؤں۔"

"برتن ہی تو نہیں ہے۔ چلو چلتا ہوں۔ گھڑے سے اوک لگا کر ڈال دینا۔ انجلی سے پی لوں گا۔"

پانچ قدم کی چوڑائی کا پہلا کھیت لانگھ کر دوسرے کھیت میں اُترتے ہی دھن سنگھ نے پوچھ لیا۔ "بھلی لوگ اتنا بھی کیوں رو رہی تھی۔ ایسا بھی کیا دُکھ ہے ؟"

لڑکی نے جواب دینے کے لیے پیچھے گھوم کر نہیں دیکھا۔ لیکن شام کے سناٹے میں اُس کے دل سے نکلے بے بسی کے لفظ دھن سنگھ کو سُنائی دے گئے۔ وہ بولی ــــ "دُکھوں کا کیا ہے ؟ جو دُنیا میں بوجھ ہوتے ہیں اُن کا حال ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور کیا۔ موت بھی تو دنیا میں اچھے بھلوں کو ہی جلتی ہے۔"

اپنے سوال کے جواب میں یہ پہیلی سُن کر دھن سنگھ کچھ سمجھ نہیں سکا۔ بدن کی اُٹھان اور چہرے کے کچے پن سے وہ لڑکی کنواری ہی نظر آتی تھی۔ لیکن اِس ضلعے میں اتنی عمر کی لڑکی عام طور پر کنواری دکھائی نہیں پڑتی۔

"ماں باپ کے ہی گھر میں تو ہو نا ؟" دھن سنگھ نے حالت جاننے کے لیے پوچھا۔

"ماں باپ نے اپنے ٹکے تو سیدھے کر لیے۔ اُن کی بلا سے بھیا قصائی کے ہاتھ پڑے تو اپنی قسمت سے۔" لڑکی نے اور گہری سانس لے کر کہا ــــ "ماں باپ کے گھر میں سدا کون بیٹھا رہتا ہے لیکن اتنا تو ہوتا ہے کہ دکھ سکھ میں کوئی چار دن کے لیے میکے بھی ہو آتا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے چار سو روپے میں جانور خریدا ہے۔ جیتا ہے تو کام اِن کا، مر جائے تو چام اِن کا۔ جب تک ہاتھ پاؤں

چلتے ہیں کیسے چھوڑ دیں؟ ماں باپ بھی کس زور پر کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے گٹھری باندھ کر رُوپے نہیں لیے۔"؟

لڑکی کہتی گئی "ہم دو بہنیں ایک بھائی تھے۔ باپ مرا تو کہا کرتا تھا، بڑی بیٹی کو لڑکے کے لیے بٹّے (بدلے) میں دوں گا اور چھوٹی کنیا دان کے پُن میں۔ لیکن بڑی بہن کے پچھلے جنم کے اپنے کچھ کرم تھے۔ وہ شادی سے پہلے ہی بیمار ہو کر مر گئی۔ میں کم بخت اُس وقت چھوٹی تھی۔ بٹّے کے لائق تھی ہی نہیں۔ بھائی کے بیاہ کے لیے باپ کو کھیت میاں (امیر راج پوت) کے یہاں رہن رکھ کر تین سو اُدھار لینا پڑا۔ بھائی کا بیاہ کیسے نہ کرتا! ماں ہماری بچپن میں مر گئی تھی۔ گھر کا کام کون کرتا؟ تم جانتے ہو بیٹی کا کیا بھروسہ! وہ تو ہے ہی پرائے گھر کے لیے۔ بہو تو گھر میں لانی ہی تھی۔ اور پھر اُس قرض سے کھیت چھڑانے کے لیے مجھے نہ بیچتا تو کیا کرتا!" آگے چلتی لڑکی گھر سے بے تعلقی کے انداز میں کہتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے اپنی قسمت کے علاوہ اور کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ پیچھے چلتا وحن سنگھ ہُنکار بھرتا اور سنتا جا رہا تھا۔

وہ دونوں باوڑی پر پہنچ گئے۔ لڑکی گھڑا باوڑی کی جگت پر رکھ کر کہتی رہی "بیاہ کر لیا تھا، بس چھ مہینے بعد ہی بھرتی ہو کر لام پر چلا گیا۔ نویں مہینے چھٹّی آکر گری کہ گولی لگ کر مر گیا۔ ایک لڑکی گود میں آئی تھی، بھگوان نے وہ بھی چھین لی۔ بڑی چھوٹی جٹھانیاں پہلے بھی مجھے برداشت نہیں کرتی تھیں یعنی وہ دونوں بٹّے میں آئی ہیں۔ اُنھیں کچھ کہیں تو وہاں اپنی لڑکیوں پر نہ بیتے! میں مول خریدی ہوئی۔ اور اب رانڈ۔ ہڈیاں کام میں بھی ٹوٹتی ہیں اور مار سے بھی۔ مردوں سے کہنے کی بات نہیں ہے مگر سارے بدن پر نیل پڑے ہوئے ہیں۔ کیا کہوں۔ یہاں تو گاڑی کے نیچے آکر مرتے مرتے بچی۔"

لڑکی کے گھٹنے کے اُوپر بالشت بھر پائجامہ پھٹ گیا تھا۔ گوری گوری جانگھ دکھائی دے رہی تھی۔ لڑکی نے بدن کو چھپانے کے لیے کپڑے کو سمیٹ لیا اور بولی — "یہ کپڑا پھٹ گیا تھا۔ ذرا سینے بیٹھی تھی۔ اندر باہر جانا ہوتا ہے۔ مردوں کی نظر پڑنے سے شرم لگتی ہے۔ بڑی نے اتنی زور سے کوکھ میں لات مار کر گالی دی — "جلنے والوں کا کفن سینے بیٹھ گئی ہے۔ پانی تیری ماں لائے گی!" تم جانتے ہو اب تک بکریاں چرا رہی تھی۔ بکری چرانے نہ جاؤں تو بکری کا دودھ جائے اور مار بھی کھاؤں۔ آس پاس کے چھوکرے بھی تو راکشس ہیں۔ تھن میں مُنھ لگا کر دودھ پی جاتے ہیں۔ چرانے جاؤں تو گالی ملتی ہے کام سے بھاگنے کا بہانہ کر کے یاروں سے ملنے جاتی ہے۔ سب طرح مرن ہے ..... ہائے تمہیں پانی تو

رہا نہیں۔ باتوں میں بھول گئی۔ گھڑا دھو کر دیتی ہوں۔" لڑکی ہمدردی پا کر دل میں اکٹھا دُکھوں کے بہہ جانے سے دیر ہونے کی بات بھول گئی تھی۔

دھن سنگھ باؤڑی کی جگت پر جھک کر بیٹھا ہوا لڑکی کی بات غور سے سُن رہا تھا۔ وہ پیاس کو بھول گیا تھا۔ "ہاں بیٹا ہوں پانی۔" اُس نے جواب دیا۔

لڑکی نے اپنا آنسو بھرا چہرہ دھویا۔ گھڑا دھو کر بھرا اور گھڑا جگت پر رکھ کر ایک ہاتھ کی انگلی سے دھار باندھ دی۔ دھن سنگھ نے جگت کے نیچے اُکڑوں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کی اوک سے پانی پی لیا۔

اندھیرا گہرا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن گھاٹی سیاہی میں نہ ڈوب کر کہرے میں سے چھنتے دودھیا روشنی سے بھر گئی۔ دکھن پورب کی طرف پہاڑی پر پورنماشی کے بعد کی رات کا لگ بھگ پورا اگر ٹھوکر کھایا ہوا ساچاند نکل آیا تھا۔ لڑکی کا منہ دُھل کر گورا نکل آیا تھا۔ کھنجن (ایک چڑیا) کے جوڑے جیسی دو آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ اُس نے لمبی سانس لے کر جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "چل رے منا!" اور بھرے گھڑے کی طرف بڑھ گئی۔

دھن سنگھ نے پوچھا۔ "یہاں راجپوتوں کی بستی ہے؟"

"کچھ گھر راجپوتوں کے ہیں۔ برہمنوں اور گھرتھوں کے بھی ہیں۔" لڑکی نے اپنی اوڑھنی کے گھونگھٹ کو گولائی میں لپیٹ کر گنڈولی بناتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن بس کیا پوچھتے ہو کیسے لوگ ہیں؟" دھن سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا بھلے آدمی نہیں ہیں؟"

لڑکی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "بدمعاش، بڑے بے شرم! تماشہ ڈھونڈتے ہیں۔ اپنے گھر کی عورت کو راہ ہاٹ میں کسی سے بات کرتے دیکھ لیں تو سر کاٹ لیں۔ اور دوسروں کی عورتوں سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ نمبردار کا چھوکرا ہے۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی ہیں۔ میں چیڑ کے جنگل میں ایندھن چُن رہی تھی۔ پاس آ کر سیٹی بجانے لگا۔ میں ہنس دی کہ لڑکا ہے، کوئی بات نہیں۔ وہ تو آ کر ہاتھ پکڑنے لگا۔ بولا۔ اٹھنی لے لو۔ میں نے اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ دیا۔ دانتوں سے خون آ گیا۔ ہائے چلوں، بہت دیر ہو گئی۔ جا کر دیکھوں، آگے رونے کو اور کیا ہے! ضرور بگڑیں گی۔ کیا کر رہی تھی اتنی دیر تک؟ ہائے مر گئی۔ بڑی تو آٹا گوندھنے کے لیے پانی کے لیے بیٹھی ہوگی۔ کہہ دوں گی۔ اندھیرا اور سُونا تھا۔ ذرا نہا لیا۔" دھن سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں جی تو کہاں تک کرے گو کوئی!"

لڑکی گھڑا اُٹھانے کے لیے جھکی تو دھن سنگھ نے اُٹھ کر کہا۔ "لاؤ نا سڑک تک پہنچا دوں۔ تجھے چوٹ بھی لگی ہوئی ہے۔"

لڑکی نے مسکرا کر انکار میں سر ہلایا۔ مشق اور ہوشیاری سے دونوں ہاتھوں کو گھڑے کے منھ میں ڈال، اُلٹی ہتھیلیوں کو ملا کر ایک جھٹکے سے گھڑے کو گھٹنوں کی اونچائی تک اُٹھایا اور پاؤں باوڑی کی جگت پر رکھ کر گھڑے کو اپنے گھٹنے پر ٹکا لیا۔ دونوں ہاتھ گھڑے کے منھ سے پھسل کر گولائی پر آگئے۔ دوسرے جھٹکے میں گھڑا خود بخود اُس کے سر پر پہنچ گیا۔

"تیرا نام کیا ہے ؟" دھن سنگھ نے پوچھ لیا۔

چاندنی سیدھی لڑکی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ مُسکرا اُٹھا۔ "سوما" اُس نے جواب دیا۔ اور چلتے چلتے بولی۔ "تم بہت بھلے لوگ ہو جی! دو برس میں کوئی بھی مجھ سے ایسے نہیں بولا۔ تمہارا بھلا ہو، تمہارا گھر کہاں ہے جی ؟"

"ہمیر پور تحصیل میں۔ بر سٹر تھانے کے پاس۔" دھن سنگھ نے بتا دیا۔

پہاڑی ڈھلوانوں پر چیڑ کے جنگلوں میں سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا گھاٹی میں بہنے لگی تھی دھن سنگھ نے ماگھ کے جاڑے کی لہک محسوس کی۔ اُس نے لڑکی کے پیچھے چلتے چلتے ایک سگریٹ سلگا لی اور دُھواں چھوڑ کر بولا۔ بہت جاڑا ہوگا۔ رات سڑک پر کاٹنی ہے۔"

"جی!" سوما نے جواب دیا۔ بدنصیبوں کے ساتھ کوئی بھلائی کرتا ہے تو ایشور بھی غصہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو نا، اسی لیے تمھاری موٹر توڑ دی اور کیا!"

"ایسا کیوں کہتی ہو!" دھن سنگھ نے سگریٹ کا دھواں بھر اسانس چھوڑ کر پگھلی ہوئی آواز میں کہا۔ ہر روز کی مار اور گالی سُن کر بلبلاتی رہنے والی سوما اِس وقت دھن سنگھ کے آگے آگے چلتی ہوئی خود کو ہمدردی کی پناہ میں محسوس کر رہی تھی۔ سڑک ابھی نزدیک کے ٹیلے اور اُس پر کھڑے پیڑوں کے سائے میں تھی۔ لیکن دھن سنگھ اور سوما کی کمر سے اوپر کے حصّے پر چاندنی پڑ رہی تھی۔ دھن سنگھ نے سڑک پر آکر پوچھا۔ "اچھا، یہاں پاس پڑوس کہیں کچھ کھانے کو ملے گا؟ آٹے کے دام دے دیں گے۔"

سوما نے انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "نا جی، یہاں سڑک کے کنارے تو لوگ راکشش ہو گئے ہیں۔ پردیسی بھی ایسے ہی آتے ہیں۔ جو دیکھتے ہیں، اُٹھالے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں پہلے چوری سنی بھی نہیں تھی۔ اب تو کھیت میں لوکی، تری، کدو، بینگن، داڑی (انار) کیلا، کچھ بھی نہیں رہ پاتا۔ چوروں کے ہاتھ لگنے سے پیڑ گنجیا گئے ہیں۔"

سوما ایک ہاتھ سے سر پر ٹکے گھڑے کو سہارا دیے پگڈنڈی پر چڑھنے کو مُڑ گئی۔ دھن سنگھ نے پوچھا۔

"تمہارا گھر دور ہے ؟"

"دور کیا؟" سومانے چٹان کے اُوپر دکھائی دیتے پیڑوں کی طرف ہاتھ اُٹھاکر جواب دیا۔" وہ تو ہے۔ ٹیلے کے اوپر پیڑوں کے نیچے۔ موٹر کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ یہ کیا بھینس رمبھاتی سنائی تو دے رہی ہے۔ جاکر مری کو دُودھوں۔ وہ رانیاں تو مہندی لگائے بیٹھی رہتی ہیں۔ منجھلی کے لڑکے نے پائخانہ کر کے ڈھیر لگادیا ہے۔ اُس کے کپڑے دھونے کو ہیں۔ بوڑھا سسر کھوں کھوں کرتا رہتا ہے۔ چھوٹا جیٹھ پلٹن میں ہے۔ بڑا اپھا گسو کی کچہری میں نوکر ہے۔" اب چلوں"۔ سومانے گھوم کر دھن سنگھ سے پوچھا۔" اوڑھنے کو کپڑے تو ہوں گے؟ جاڑا لگے تو آگ جلالینا جی۔ اچھا میں چلوں!"

پگڈنڈی پر چڑھتی سوما کو پیچھے سے دھن سنگھ نے پھر پکارا۔" بڑی چٹکتی چاندنی ہے۔ اب تو اِدھر کیا آئے گی۔ سو جائے گی۔"

پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر ہی سومانے جواب دیا۔" جی کہاں! ابھی کہاں مرنے کی فرصت ہے۔" اور چلی گئی۔

دھن سنگھ سڑک پر اکیلا رہ گیا۔ اُس نے سگریٹ کے کش کھینچ کھینچ کر کئی بار لاری کا پھیرا کیا۔ جاڑے میں سڑک پر رات کاٹنے کی جھلاہٹ اُس کے دل میں نہ تھی۔ پہاڑی پر ڈرائیوری کرنے والوں کے لیے سڑک پر رات کاٹنے کی تکلیف زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ ایسی حالت کو اچھی گھڑی بنا لینے کے بھی ڈھنگ جانتے ہیں۔ ایسے ہی موقعوں کی یاد دھن سنگھ کو آئی، جب استاد جمال کے ساتھ بالم پور کے پاس ایک رات گدیوں کی شراب پیتے اور اُن کا ناچ دیکھتے گزاری تھی۔ دوسرے موقع پر گوجروں کے پڑاؤ سے دُودھ لے کر خوب کھیر کھائی تھی۔

شام کا واقعہ بار بار اُس کے تصوّر میں گھوم جاتا تھا۔ میمنے کو بچانے کے لیے موٹر کے آگے گری گھبرائی لڑکی کا ساکت چہرہ، اور خوف سے پھیلی ہوئی آنکھیں .... اندھیرے میں اُس کا پھُوٹ پھُوٹ کر رونا.... دُھل کر چاندنی میں چمکتا ہوا چہرہ اُس کا .... لوچ اور لچک سے اُس کا گھڑا اُٹھانا۔ اُس کی سیدھی سادی باتیں ۔" جی، تم بڑے بھلے لوگ ہو۔ دو برس سے مجھ سے کوئی ایسے نہیں بولا۔" سوما کے یہ الفاظ بار بار یاد آجاتے اور دل میں مصری سی گھول دیتے۔ اِس مٹھاس میں اِس خیال سے کسیلا پن آجاتا وہ سوما سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ راجپوت ہے!

دھن سنگھ جب کبھی یہ جھُوٹ بولتا تھا ایک کھٹک اُس کے دل میں رہتی تھی۔ جنم اس کا راج پوت ماں باپ سے نہیں۔ گھرتھ (کہار) گھر میں ہوا تھا۔ جنم سے اُس کا کام برہمن، راج پوت، کھتری، سود اور کائستھ کی خدمت کرنا تھا۔ اسے ان کی طرح آسن پر بیٹھنے اور اُن سے برابری کے ساتھ بات کرنے کا

حق نہیں تھا۔ اپنا نام اسے دھن سنگھ نہیں دھنا یا دھنو بتانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کا دل اپنی نیچی ذات کو کبھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ اپنا نیچ پن اسے محض دوسروں کے غرور میں، اور اپنے ماں باپ کے غریب ہونے میں محسوس ہوتا تھا۔ یہ جھوٹ وہ بغاوت کے جذبے سے بولا تھا۔ اپنے اوپر لادے گئے نیچ پن کی توہین اور ظلم کو برداشت کرنے سے انکار کرنے کے لیے۔ اور اونچی ذات والوں کے مقابل اور برابری میں بیٹھ سکنے کے لیے، اس وقت بھی اس کے دل میں وہی احساس اور جذبہ تھا کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں نیچا نہ جچے۔ اس کی یہ نفسیاتی بغاوت، اس کی گزری ہوئی زندگی کی یاد دلاتی تھی۔

دھن سنگھ کا باپ بھی کبھی لاہور میں اور کبھی امرتسر میں نوکری کرتا تھا۔ اور کما کر گھر روپیہ بھیجتا رہتا تھا۔ باپ روپیہ بھیجتا تو ڈاک خانے سے ڈاکیہ روپیہ لے کر آتا تھا۔ کبھی کبھی باپ کا خط بھی آتا تھا۔ وہ خط ڈاکیہ ہی پڑھ کر سُنا دیتا تھا۔ ڈاکیے کی دودھ اور چلم پلا کر خاطر کی جاتی تھی۔ اس کی ماں بچپن ہی میں بیماری سے مرگئی تھی۔ دھن سنگھ کو اُن گزرے دنوں کی یادیں، ماں کی لاڈ بھری ممتا کی دُھندلی یاد اور پھر تائی کے کٹھور سلوک کی یاد آتی تھی۔ دو چار چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو تاؤ جوتتا اور بوتا تھا۔ باپ کے کہنے سے تاؤ اسے پڑھنے کے لیے بھیجنے لگا تھا۔ مگر اُسے یہ اچھا نہیں لگتا تھا، لیکن دھنو کا باپ رُوپے بھیجتا تھا، اس لیے اُس کی بات مانی جاتی تھی۔ اسکول ان کے گھر سے دو میل سے زیادہ دُور تھا۔ وہ تین برس اسکول جاتا رہا، لیکن کبھی دو مہینے پڑھنے جاتا اور تین مہینے نہ جا سکتا، پھر نئے سرے سے پڑھنے لگتا۔ ایسے ہی چلتا رہا۔ اُس کا تاؤ اور تاؤ کے دو لڑکے کھیت جوتتے اور پاس پڑوس کے کھیت بھی بٹائی پر جوتتے تھے۔ مکان کی دیواریں مٹّی کی اور چھپّر پھونس کا تھا۔ اِن کے کھیت میاں (اونچے درجے کے راج پوت) بجر سنگھ تھے۔ پڑوس میں ہی میاں کا پتھّر کا، سلیٹ کی چھت کا مکان تھا۔ وہ لوگ میاں بجر سنگھ کے قرض دار تھے۔ دھن سنگھ بچپن میں ہی میاں کے یہاں سے بلاوا آنے پر اُن کے یہاں پانی بھرنے، کبھی لکڑی ڈھونے یا دوسرے کاموں کے لیے جایا کرتا تھا۔

دھن سنگھ کا باپ لاہور میں مرگیا۔ روپیہ آنا بند ہوگیا۔ اُس کا بڑا بھائی (تاؤ کا بڑا لڑکا) گھبرا گاؤں کے سودوں کے یہاں نوکر ہوگیا۔ قرض ادا نہ کرسکنے کی وجہ سے میاں بجر سنگھ نے اُن کے گھر کی قرقی کرالی۔ قرقی کے لیے پٹواری اور پولیس کے دو سپاہی آئے تھے۔ اُس کی تائی کے بدن پر چاندی کے دو چار گہنے تھے۔ تائی نے بہت رو کر دیے۔ گھر میں پیتل کے برتن، ایک بھینس اور چھت کی دھنی پولیس کے سپاہیوں نے اُتروا کر میاں کے حوالے کردی۔ اس کے بعد دھن سنگھ کا تاؤ میاں کی زمین سے اُٹھ کر نیٹھے ساہ کی زمین پر بس گیا۔ اور اُس کے خچّر ہنکانے کی نوکری کرنے لگا۔

دھن سنگھ کی تائی اپنے دونوں لڑکوں کے گھر چھوڑ کر چلے جانے سے دُکھی رہتی تھی اور دھن سنگھ کو گالی دیتی رہتی تھی۔" مرا جوان لکڑ ہو گیا ہے چودہ برس کا! کام کا نہ کاج کا..... اپنے پیٹ کے جائے چھوڑ گئے اور یہ مرا گلے پڑا ہے۔

گکھڑ گاؤں کے بلّے سود نے دھنو کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ وہ بلّے سود کے یہاں دو برس سے کچھ کم رہا تھا لیکن اُس کی یاد بہت واضح تھی۔ لوگوں کو یقین تھا کہ بلّے کے پاس بہت روپیہ تھا۔ مگر بلّے کے طور طریقے اور ڈھنگ سے امیری ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ نفرت سے لوگ اُسے کنجوس اور سود قصائی کہتے تھے۔ اور عزّت سے "میلا ساہ،، پکارتے تھے۔ یعنی وہ دکھاوے کی پرواہ نہ کرکے کام کاج میں میلا رہتا تھا۔ بلّے کے کپڑے اُس کے نوجوان نوکر نظر سنگھ سے زیادہ میلے رہتے تھے۔

نظر سنگھ ہوشیار پور اور کانگڑا سے بلّے کی دوکان کا سامان خچروں پر ڈھونے کا کام کرتا تھا۔ نظر سنگھ کشیدہ والی کاپخ کے ٹکڑے جڑی گول ٹوپی اور کان (کالر) لگی سفید قمیص پہنتا تھا۔ قمیص پر لال دھاگے کی سلائی چمکتی رہتی تھی اور چاندی کے بڑے بڑے زنجیر دار بٹن دکھائی دیتے تھے۔ وہ کالی گبرون کا چوڑی دار پاجامہ پہنتا تھا۔ اُس کے جُوتوں پر کڑوا تیل لگا رہتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اُسے "شہر کا جنٹل مین،، پکارتے تھے۔

بلّے ساہ کی ٹوپی کا رنگ میل اور چکنائی کی وجہ سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ یہی حال اُس کے کُرتے کا تھا۔ پاجامہ پہنے اُسے کسی نے سخت جاڑے میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کمر میں صرف پڑتنی (گھٹنوں تک کا انگوچھا) رہتی تھی۔ پاؤں میں جُوتا اور سر پر پگڑی وہ صرف کچہری یا بارات میں جانے کے وقت ہی لوک لاج کے خیال سے پہنتا تھا۔

بلّے ساہ کی دوکان میں عام طور پر سبھی کچھ تھا۔ کسانوں کے لیے ہتھیار بنانے کے لوہے سے لے کر نمک، کپڑا، شیشہ، کنگھی، سونف اور اجوائن تک۔ اُس کا خاص کاروبار کسانوں کو سود پر روپیہ دینا تھا۔ سود میں وہ عام طور پر اُن کی فصل کا اچھا یا بڑا حصّہ یا گھی سستے داموں میں خرید لیتا تھا اور خچروں پر لدوا کر نادون، ہوشیار پور کی منڈیوں میں بھیج دیتا تھا۔ اس کا مکان دو منزلہ پتھّر کی بھاری بھاری دیواروں کا، سلیٹ کی چھت سے چھایا ہوا تھا۔ اِس مکان میں بلّے ایک بھُوکی اور ڈری ہوئی بلّی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے خدوخال میں دولت مندی کا کہیں کوئی نشان نہ تھا۔ صرف اُس کے کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی، مگر موٹی اور ٹھوس مُرکیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مُرکیوں کے بوجھ کی وجہ سے کانوں کے چھید کھنچ کر پھٹے جا رہے تھے۔ اِس لیے بلّے نے سُوت کے ڈورے ڈال کر ان بالیوں کو

کان کے اوپر سنبھال لیا تھا۔ اس کے بدن کا چمڑا اور ہاتھ پاؤں نرم تھے۔ ان پر خشکی اور سختی نہیں تھی۔

بلّے کے مکان کے اندر بڑا سا آنگن تھا۔ اُس کی پتنی، لڑکیاں اور بہو گاؤں کی دوسری عورتوں سے زیادہ اچھے کپڑے پہنتی تھیں۔ اُن کے بدن پر زیور بھی تھے۔ گاؤں کی دوسری عورتیں صرف چاندی کے ہی گہنے پہنتی تھیں۔ اِس گھر کی عورتوں کی ناک پر اٹھنّی کے برابر چوڑی سونے کی لونگ اور کان اور گلے میں دو دو تین تین سونے کی چیزیں رہتی تھیں۔ لیکن ان کے کپڑے، پاجامے، کرُتے اور اوڑھنیاں چکنائی اور دھوئیں سے کالے رہتے تھے۔ وہ سب کچھ پردہ بھی کرتی تھیں۔ اگر باوڑی کے علاوہ کہیں اور جانا ہوتا تو پاجامے پر بھاری لہنگے بھی پہن لیتی تھیں۔ وہ باوُڑی سے پانی کا گھڑا تو کبھی کبھی لے آتی تھیں۔ لیکن دوسری عورتوں کی طرح گھاس کاٹنے نہیں جاتی تھیں۔

دھنّو کو بلّے نے دو روپے ماہوار اور روٹی کپڑے پر نوکر رکھا تھا۔ پہناوے میں دھنّو اپنے مالک سے مختلف نہیں تھا۔ بلّے وقت ملنے پر ہَل جوتنے کے سوا لگ بھگ سارے کام اپنے ہاتھ سے کرلیتا تھا۔ کھانے میں گھر کے لوگ جب خمیری روٹی اور بھات کھاتے تھے، دھن سنگھ کو مکئی کی روٹی ملتی تھی۔ گھر کے لگ بھگ سارے کام، عورتوں کے کپڑے دھونے کے علاوہ (پہاڑ میں ایسا کام کوئی مرد کرہی نہیں سکتا) دھنّو کرتا تھا۔ چوکے کا کام بھی جب دال بھات کی رسوئی بنتی اسے نہ چھُونے دیا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ کچّی رسوئی سمجھی جاتی تھی۔

بلّے ساہ کا بڑا لڑکا دھن پت رائے دھرم شالہ کے کالج میں پڑھتا تھا۔ جب وہ چھُٹیوں میں گھر پر آکر رہتا تو ہر روز حجامت کر کے سفید سفید کپڑے پہنتا تھا۔ اُس نے کانوں سے سونے کی مُرکیاں بھی اُتار دی تھیں۔ وہ اُس گھر میں ایسا لگتا تھا جیسے سفید بگلا کہیں سے اُڑ کر گندی تلیا کے بیچ میں آ بیٹھا ہو۔ دھن پت رائے کسرت کرتا تھا اور جنگلوں میں سیر کر کے جنگلی پھُولوں کو دیکھتا تھا۔ اس کی ان باتوں پر گاؤں کے لوگوں کو حیرت ہوتی کہ آرام اور سُکھ چھوڑ کر جان بُوجھ کر بدن کو تکلیف کیوں دیتا ہے۔ سب کو یقین تھا کہ وہ جلد ہی ڈپٹی صاحب بن جائے گا۔ گھر کی عورتیں، ماں، بہنیں اور اُس کی بہو بھی اُس سے ڈرتی تھیں۔ اُس کے گھر رہنے پر عام طور سے چُپ رہتی تھیں۔

دھن پت رائے کالج چلا جاتا تو گھر میں بلّے ساہ اور دھنّو کے علاوہ تیسرا مرد بلّے ساہ کا چھ برس کا چھوٹا لڑکا گجپت رہ جاتا۔ لڑکیاں اور بہو دھنّو سے ہنسی مذاق بھی کرلیتی تھیں۔ دھن پت رائے کی بہو دھنّو کو نام لے کر نہیں پکارتی تھی کیوں کہ وہ اُس کے پتی کا بھی نام تھا۔ وہ دھنّو کو سدا اُو، اور اے، کی پکار لگا کر، یا گالی دے کر "برا مرجانا، کھسم کھانا"، کہہ کر پکارتی تھی۔ یہ طریقہ دھنّو کو

بھی اچھا لگتا تھا۔ بہو اور بلّے کی بڑی لڑکی کبھی دھنّو کو کچھ ایسی باتیں کہہ دیتیں یا کچھ اشارے کر دیتیں کہ وہ سمجھ نہ پاتا۔ لڑکیاں ایک دوسرے کو ٹھیل ٹھیل کر خوب ہنستیں اور دھنّو سے اکثر پوچھتیں۔ "تو بیاہ کب کرے گا؟ کیسی لاڑی (دلہن) لائے گا۔ لاڑی سے کیا کہے گا؟ کیا کرے گا؟"

جاڑے کی ایک رات میں بہو نے چوکے کا کام ختم کر کے روٹی دینے کے لیے دھنّو کو پکارا۔ اُس نے دھنّو کو۔ "لے مرجانا" پیار سے گالی دے کر بچی ہوئی گیہوں کی خمیری روٹی دے دی۔ روٹی پر گھی بھی لگا ہوا تھا۔ بہو چولھے کی آگ کے پاس بیٹھی کھا رہی تھی۔ دھنّو ہر روز کی عادت کے مطابق چولھے سے کچھ دور ہٹ کر دیوار کے سہارے اُکڑوں بیٹھ گیا تھا۔

بہو بولی۔ "مرے جاڑا نہیں لگتا؟ ذرا آگ کے پاس ہو جا۔"

دھنّو چولھے کی طرف بہو کے نزدیک کھسک آیا۔ بہو ہنسی کی باتیں کر رہی تھی۔ کبھی اپنے میکے کی بات کہتی اور کبھی اُسے بتا رہی تھی کہ۔ "تو بیاہ کرے گا تو اپنی لاڑی کے لیے ایسا ایسا کپڑا اور زیور بنوانا۔" دھنّو کھانا کھا کر چوکے کے برتن ملنے لگا۔ بہو اُس سے باتیں کرتی برتن ملوانے لگی۔ بہو دودھ میں جامن ڈالنے لگی تو دھنّو سے بولی۔ تھوڑا دودھ پی لے! چوکے میں آجا دے دوں۔"

دھنّو کٹورے میں لے کر دودھ پی رہا تھا۔ اُسی وقت بلّے ساہ نے اُسے دو تین آوازیں دیں۔ "کہاں مرگیا؟ چلم میں آگ دے جا۔"

دھنّو جواب دینا چاہتا تھا مگر بہو نے روک دیا۔ "چُپ رہ۔ یہ مرا بُوڑھا تو دن بھر چلّاتا ہی رہتا ہے۔" بہو نے اپنی چھوٹی نند کو پکار کر کہہ دیا۔ "کہہ دے پانی نہیں تھا۔ گھڑا لے کر باؤڑی پر گیا ہے۔" بہو نے دھنّو سے پوچھا۔ "سُن، تیری بہو تجھ سے ناراض ہو جائے گی تو کیا کرے گا؟ مارے گا یا پیار کرے گا؟"

"ماروں گا۔" دھنّو نے گھونسہ دکھا کر کہا۔

"مرا تو! ایسا نہیں کہتے"۔ بہو نے مُسکرا کر سمجھایا۔ "بہو مر جائے گی تو کیا کرے گا؟"

"دوسرا بیاہ کروں گا۔"

"دھت!" بہو نے محبت سے ڈانٹا۔ "ایسا نہیں کہتے۔ بہو کو پیار سے منا لینا۔ تجھے پیار کرنا آتا بھی ہے؟"

"نہیں" دھنّو نے سر ہلا دیا مگر وہ بدن کے اندر مدھر گرمی اور لطف محسوس کر رہا تھا۔ دیا اور چُولھے کی آنچ کی روشنی میں بہو کا چہرہ گلابی اور آنکھیں نشیلی ہو رہی تھیں۔ اُس نے کہا "سُن تجھے

بتا دوں۔"

"ہاں بتاؤ۔" دھنو نے منہ سے کچھ مُڑ کر ہاں کہہ دیا۔

"یہاں آ۔"

بہو دیوار کے نزدیک کھڑی تھی۔ دھنو اُس کے نزدیک بڑھ گیا۔ بہو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس کی طرف منہ اُٹھایا۔ دھنو کے ہاتھوں نے بہو کو سمیٹ لیا۔ اُسی وقت رسوئی گھر کے دروازے سے بلّے کی گالیوں کی بوچھار سُنائی دی۔ بلّے کا حقّہ اور پھر بھاری چیلا دھنو کے کندھے کو چھیلتا ہوا اُس کے پیچھے دیوار سے جا ٹکرایا۔

بہو چلّا کر رو اُٹھی ۔" ہائے مر گئی۔ مجھے پکڑ رہا تھا۔ میں رو رہی تھی ...."

دھنو بلّے کو رسوئی کے دروازے سے ڈھکیل کر بھاگ گیا۔ اُس نے پیچھے سے پکڑو پکڑو کی آوازیں سنیں۔ مگر وہ سر پر پاؤں رکھے بھاگ گیا۔ وہ آٹھ میل دور سجان پور میں جا کر رُکا اور تیسرے دن کانگڑے پہنچ گیا۔ دھنو نے کئی مہینے تک موٹر کے اڈّے پر قلی کا کام کیا۔ پھر تین برس تک کلینر رہا۔ پھر اُستاد منظہر خاں کی مہربانی سے ڈرائیور بن گیا۔

دھن سنگھ بچپن ہی سے عورتوں کو چالاک بلّی کی طرح سمجھتا تھا، جو دھیمی میٹھی بولی بولتی ہے۔ اوٹ میں رہتی ہے۔ چوری کرتی ہے اور موقع ملنے پر نوچ لیتی ہے۔ تجربہ کار اور بزرگ لوگوں سے بھی اُس نے یہی سنا اور سیکھا تھا۔ اِن سے چوکنّا اور ہوشیار رہنا چاہیے۔ ڈرائیور کی زندگی میں اگر اسے عورت کی صحبت کا موقع ملا بھی تھا تو اُس نے سدا اُسے کانٹوں کی جھاڑی سمجھ کر ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ مردوں کی طرح عورتوں سے بھی وہ اُن کی سماجی حیثیت کے مطابق سلوک کرتا تھا۔ لیکن عورت ذات پر اُسے بھروسہ نہ تھا۔ مگر یہ سوما کتنی سیدھی، کتنی دُکھی تھی۔ اُس میں چھل کپٹ نہ تھا۔

سڑک پر خوب چاندنی پھیل گئی تھی۔ دھن سنگھ کچھ دیر اپنی لاری کے گرد گھومتا رہا۔ پھر وہ سڑک کی منڈیر کے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈی سرسر کرتی ہوا تھی۔ وہ سکڑ سمٹ کر سڑک پر رات گزارنے کی بات سوچنے لگا۔ اُس کا دل گزری زندگی کی باتوں کی طرف پلٹ جاتا تھا۔ پہلے تو اُس نے ٹھنڈک کی پروا نہیں کی مگر جب سردی سے رُواں کھڑا ہونے لگا تو سوچا کہ گاڑی کے اندر جا بیٹھے۔ بھوک بھی معلوم ہو رہی تھی۔ بھوک کی وجہ سے جاڑا بھی زیادہ لگ رہا تھا۔ اس دوپہر کو وہ اور کرمو دونوں ہی کچھ نہیں کھا سکے تھے۔ وہ بھوک کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی سیٹ کے نیچے سے کمبل نکالا۔ اور اوڑھ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دل بہلانے کے لیے وہ کرمو سے

سنا گیت گنگنانے لگا۔

وہ گیت کسی گوری کا برہ الاپ (نالۂ فراق) تھا۔ پردیسیا تم نے ہی میرے دل کے کواڑوں کے پٹ کھولے۔ تم ہی سے میرا دل لگا۔ پردیسیا میری آنکھوں نے آدھی زندگی تک تمہاری آنکھوں کو دیکھنے کا انتظار کیا۔ باقی زندگی میری آنکھیں تمہاری آنکھوں کو دیکھنے کے لیے ترستی رہیں گی۔ آؤ پردیسیا، ساون میں آسمان اور زمین پانی کے دھاروں سے بندھے ہوتے ہیں اور تمہارے انتظار میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑی اِس برسات کو خوشی سے جھیلتی رہتی ہوں۔ مجھے دُکھ اُس وقت ہوتا ہے جب ساس ٹوکتی ہے کہ تو باہر کیوں کھڑی ہے۔ پردیسیا جب جاڑوں کے موسم میں اوس کے تیروں سے چھد کر، چیڑ کے پیڑ بھی سر دُھن دُھن کر، سی، سی کر کے روتے ہیں، تب تمہارے انتظار میں راستے پر خوشی سے کھڑی رہتی ہوں۔ مجھے دُکھ اُس وقت ہوتا ہے جب ساس کہتی ہے "باہر کیوں کھڑی ہے۔ کپڑے اوڑھ کر بیٹھ۔"

دھن سنگھ کو تصوّر میں دکھائی دینے لگا۔ دُکھیا، بھولی سوما برسات اور سردی میں انتظار کر رہی ہے۔ پردیسی وہ خود ہے۔ گیت اُس کے لیے سچ بن گیا۔ اُس کے دل پر گیت کا اثر اتنا گہرا ہوا کہ وہ اور گنگنا نہ سکا۔ چپ ہو گیا۔ شام کا واقعہ اور سوما سے سُنی باتیں اُس کی آنکھوں اور کانوں میں زندہ ہو گئیں۔ گہری سانس لے کر وہ سوچنے لگا۔ صبح وہ پانی کے لیے باؤڑی پر آئے گی۔ اُسی وقت ملنا ہوگا۔ دھن سنگھ کا دھیان اپنے تصوّر سے ذرا ہٹا تو بہت تیزی سے بھوک محسوس ہوئی۔ سوچا، کیوں نہ کچھ آلو بھُون کر کھالے۔ وقت بھی کٹے گا اور تاپنے کو آگ بھی ملے گی۔ وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔ چاندنی میں اُس نے ایندھن کے لیے اِدھر اُدھر آنکھیں دوڑائیں۔ چاندنی کی جھلملاہٹ میں روشنی بہت تھی، مگر کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے جس ٹہنی یا گھاس پھُوس پر ہاتھ ڈالتا، ہری، لچکیلی اور اُوس سے بھیگی ملتی۔ چلیری (چیڑ کے جنگل) میں ایندھن مِل سکتا تھا لیکن بہت دُور تھا۔ وہاں تک جائے اور اتنے میں کوئی آدمی آلو کی بوری اُٹھا لے جائے تو۔۔۔؟ آگ جلانے کا خیال چھوڑ کر وہ کمبل اوڑھ کر لاری میں آبیٹھا۔ دل میں اُمید ہوئی کہ کرمو سے خبر پا کر بیج ناتھ سے اُسی وقت کوئی دوسری لاری آجائے۔

دھن سنگھ بھُوک کو بھُلا نہیں پا رہا تھا۔ بھُوک کا خیال صرف اُسی وقت ہٹتا جب وہ سوما کے بارے میں سوچتا۔ اُس کی آنکھیں بار بار اُس پگڈنڈی کی طرف اُٹھ جاتیں جس پر سے سوما

ٹیلے کی اوٹ میں گئی تھی۔ اُس نے سوچا، نیند تو نہیں آ رہی ہے۔ ایک بار اُس گھر کی طرف ہو آئیں تو کیا ہے! پردیسی ڈرائیور کے طور پر مدد مانگے گا۔ کچھ نہیں ملے گا نہ سہی، سوما کو تو دیکھ آئے گا۔ یکایک خیال آیا، اگر بیج ناتھ سے رات ہی میں لاری آجائے تو سوما سے مل بھی نہیں پائے گا۔ اُسے یہ تو کہنا ہی تھا کہ آتے جاتے وقت کبھی ملا کرے۔ سوما سے اتنی بات کہہ دینی دھن سنگھ کو بے حد ضروری معلوم ہونے لگی۔ اُسے شک ہونے لگا، شاید بیج ناتھ سے لاری ابھی آجائے گی۔ ایسے موقعوں پر سڑک کے پاس کی بستیوں میں مدد کے لیے پُکارنے میں ڈرائیوروں کو جھجک معلوم ہوتی۔ لیکن اُس وقت دھن سنگھ کو جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ جھجک کو دبا کر پگڈنڈی کی طرف چل دیا۔ چند ہی قدم چل کر وہ اُسی جگہ پہنچ گیا جہاں سوما اُسے پگڈنڈی پر روتی ہوئی ملی تھی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ بانسوں کے جھنڈ دکھائی دیے۔ پھر آڑے ترچھے، ٹین، چھپّر، مٹّی کی دیواریں دکھائی دیں۔ دھن سنگھ نے سوچا۔ نہ جانے کون سا گھر ہے اُس کا۔ یاد آیا۔ سوما نے کہا تھا، پہلا ہی چھپّر!

کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُپلوں اور چیڑ کی لکڑی کے دھوئیں کی بُو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ مکئی کی روٹی کوئلے پر سینکنے کی سوندھی بُو آ رہی تھی۔ لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔ دھن سنگھ کو ہمدردی ملنے کی اُمید ہوئی۔ پہلا چھپّر چاروں طرف سے گھنی باڑ سے گھرا تھا۔ اور اُس کا آنگن پتھر کی ٹیڑھی سِلوں سے پٹا ہوا تھا۔ چاروں طرف شہتوت اور جامُن کے پیڑ تھے۔ دھن سنگھ سہم سہم کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ خیال آیا، ایسی حالت میں کوئی آدمی یا کُتّا دیکھے تو اُسے چور سمجھے گا۔ اُس نے کھانس کر آہٹ پیدا کی۔ آنگن کے دروازے پر کھڑی دوشاخہ لکڑی میں بانس کی ارگلا (دروازہ بند کرنے کی لکڑی) لگی ہوئی تھی۔ دھن سنگھ نے بانس کو کھٹکھٹا کر پُکارا۔ "ارے گھر والو، جاگتے تو ہو!"

"کون ہے بھائی؟" عورت کی آواز نے سوال کیا۔

"پردیسی مسافر ہیں۔ سڑک پر موٹر ٹوٹ گئی ہے۔"

"تو ہوگا بھائی۔ یہاں کوئی ہاٹ دکان نہیں ہے....." عورت جواب دے رہی کہ ایک بوڑھے کی آواز آئی۔ "جاؤ بھائی جاؤ۔ یہاں کوئی سرائے، دکان نہیں ہے۔ خوب جانتے ہیں ایسے پردیسی مسافروں کو۔ چوری بدمعاشی چھوڑ کوئی دوسرا کام نہیں۔ کھیت میں پھلی فصل ترکاری نہ چھوڑیں۔ گھروں میں عورت نہ چھوڑیں۔" بوڑھے کو کھانسی آگئی۔

دھن سنگھ نا اُمید ہو کر مٹی سے پُتی دیوار میں دُور دروازے کے اندھیرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دروازے میں اُجالا دکھائی دیا۔ اور دوسرے ہی پل ہاتھ میں جگنو (چیڑ کی لکڑی کی مشعل) تھامے سوما آتی دکھائی دی۔ دھن سنگھ کا دل اُچھل پڑا۔ لیکن پیچھے سے سنی للکار سے سوما کے قدم رُک گئے۔ بہت تیکھی اور اُونچی آواز میں دوسری عورت نے ڈانٹا۔ "تو کہاں جا رہی ہے چڑیل چوکا چھوڑ کر۔ پرائے مرد کی مہک آئی کہ ٹکڑے پر کُتیا کی طرح جھپٹ پڑی۔"

للکار سے ایک بچہ نیند سے چونک کر چلّا کر رو پڑا۔

"دیکھ رہی تھی کون ہے۔" سوما نے جواب دیا۔

"ہاں تو ہی ہے نا گھر کی سب سے بڑی بزرگ، بے شرم کہیں کی؟ ہائے دیکھو تو کتنی مشکل سے بچے کو سلایا تھا۔ ہلا کر کے جگا دیا۔ مصیبت کر دی میری جان کے لیے۔ اپنے پیٹ کو تو ڈائن نگل گئی۔ دوسروں کے دیکھے نہیں جاتے۔ ایشور بچھے اِس چڑیل سے۔"

سوما نے گھوم کر دھن سنگھ کی طرف دیکھا اور چپ چاپ لوٹ گئی۔ بوڑھا کھانستا ہوا کچھ کہتا جا رہا تھا۔ لیکن اُس کو سُننے اور سمجھنے کی فکر دھن سنگھ نے نہیں کی۔ وہ اپنی بے وقوفی پر نادم ہو کر لوٹ پڑا۔ فضول ہی بے چاری کو گالیاں سنوائیں۔

دھن سنگھ بدن میں کمبل لپیٹ کر اور گھٹنے سمیٹ کر گاڑی میں اپنی سیٹ پر لیٹ گیا۔ باہر چاندنی میں آسمان سے گھنا کہرا جھڑ رہا تھا۔ چٹکیلی چاندنی دودھیا اور دھندلی ہو گئی تھی۔ وہ پھر بات سوچنے لگا۔ وہاں جا کر کیوں بے وقوفی کی...... صبح تو سوما پانی لینے آتی ہی۔ دوسرا خیال آیا۔ کرموہیج ناتھ کبھی کا پہنچ گیا ہو گا۔ کھاپی کر وہ لوگ لاری لے کر چلے ہوں گے تو آیا ہی چاہتے ہوں گے۔ نو ہی میل تو ہے۔ گھنٹے بھر میں آ جائیں یا صبح تک پہنچ جائیں۔ سواریاں ہوتیں تو ضرور اُسی وقت آتے!..... منڈی جانے سے پہلے سوما سے ملنے کے لیے یہاں رُکا کروں گا۔ باؤڑی تو یہاں ہے ہی۔ انجن میں پانی ڈال لیا کروں گا۔ لیکن کتنی دیر کے لیے۔ دس منٹ تو رُک سکوں گا۔ اوپر نیچے دونوں طرف گیٹ کا ٹائم لگتا ہے.... کتنی بھلی عورت ہے بے چاری۔ ظالموں کے پنجے میں پھنسی ہوئی کیسے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے۔ اُس کا اِن لوگوں کے یہاں ہے کیا؟ کیوں رہے اِن لوگوں کے پاس؟ میں اِس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میرا بھی اپنا دنیا میں کون ہے۔ دھن سنگھ کو بڑ بڑ میں اپنا گھر یاد آیا جو اُجڑ چکا تھا۔ یہاں سے پولیس کے سپاہیوں نے اُس کے گھر کے لوگوں کو نکال دیا تھا۔ لیکن اُس کا تاؤ بھی تو اُس کا نہیں تھا، جیسے سوما کی سسرال والے۔ لیکن مرد کا کیا

ہے ؟ اُس کے لیے دنیا پڑی ہے۔ عورت تو ایسا نہیں کر سکتی۔ بے چاری مرد کے آسرے کے بغیر نہیں رہ سکتی ۔۔ ۔۔ ۔۔ میں کیا مرد نہیں ہوں۔ میں اُسے آسرا دوں گا۔"

کہرا بہت گہرا ہو گیا۔ سردی بہت بڑھ گئی۔ دھن سنگھ کی سانس موٹر کے شیشے کے پردے پر جم گئی۔ شیشہ دھندلا ہو گیا۔ باہر دیکھنے سے آنکھوں میں بھی جاڑا لگتا تھا۔ ٹھنڈی سانسوں سے کلیجہ اندر تک کانپ جاتا تھا۔ دھن سنگھ نے منہ پر بھی کمبل ڈھانپ لیا اور آنکھیں بند کر کے وہی بات سوچنے لگا۔ اپنے مرد ہونے اور عورت کو آسرا دینے کی بات سے اُسے اپنے یہاں کا خیال آیا۔ جانے پہچانے لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ ابھی تک کنوارا ہے تو اُنھیں حیرت معلوم ہوتی۔ اِس پر رحم آتا۔ اِس ضلعے میں کسی اچھے بھلے آدمی کا اتنی عمر تک کنوارا رہ جانا عام بات نہ تھی۔ یا تو آدمی میں کوئی خرابی ہے یا اُس کی بدنصیبی۔ بیاہ کا دھن سنگھ کو زیادہ خیال نہیں تھا۔ لیکن بن بیاہا ہونے کی بے عزّتی ہونے کا رنج کبھی کبھی دل میں پیدا ہو جاتا تھا۔ اِس قلق کو وہ دھن پت رائے کی بہو کی بات یاد کر کے دل سے دور کرنے کی کوشش کرتا۔ جو مرد گھر میں عورت کی رکھوالی نہیں کر سکتا اُس کی عورت اچھی نہیں رہ سکتی .... ڈرائیور خلیل سچ کہتا ہے۔ زر۔ زن۔ زمین زور کی، نہیں تو اور کی۔ ڈرائیور کو بیاہ سے کیا فائدہ ؟ ڈرائیور کا گھر کیا ؟

دھن سنگھ کا پختہ خیال تھا، عورت کو ستی ساوتری ہونا چاہیے۔ لیکن عورتیں بلّیوں کی طرح چھپ کر دودھ اور گوشت چرا کر کھاتی ہیں۔ اور دیکھنے میں سیدھی اور خاموش بنی رہتی ہیں۔ امیروں کی عورتیں اپنے مزے کے لیے اور غریبوں کی لالچ سے۔ ساتھی ڈرائیوں سے وہ روز ہی ایسے قصے سُنا کرتا تھا اور دیکھتا بھی رہتا تھا .... دل چاہے تو کیا عورت نہیں مل سکتی۔ پھر اُس سے ناطہ باندھ کر اپنی بے عزّتی کیوں کرائے ؟ اپنی بے عزّتی کرانے سے دوسروں کی بے عزّتی کرنا اچھا۔ سب سے بڑی مشکل، اپنے بیاہ کے لیے اپنے گھر بار اور خاندان کا پتہ دینے کی ضرورت تھی۔ دھن سنگھ وہ سب کچھ ظاہر کر کے، پھر سے گھر تھ بن کر دوسروں کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا تھا۔ سڑکوں سے دُور ٹیکریوں سے پیچھے اپنی جائے پیدائش کو چھوڑ کر وہ اِس بے عزّتی سے بھی چھوٹ چکا تھا۔ اسے پھر کیوں اپنائے۔

اونگھ جانے کی وجہ سے دھن سنگھ کے خیالات تتر بتر ہوتے جا رہے تھے۔ نیند میں سوما کی تیرتی ہوئی تصویر دکھائی دی۔ روتی ہوئی، آنچل آنکھوں پر رکھے اور اپنے ہاتھ سے سوما کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ وہ مُسکرانے لگی۔ "جی تم بڑے لوگ ہو جی ! جی ! جی ! او جی ، سو گئے کیا ؟

او جی پر دیسیا!" آدھی نیند میں دھن سنگھ یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ تصوّر تھا یا سچ مچ کی پکار تھی؟ پھر سُنا۔"جی! او جی پر دیسیا دیکھو تو!"

دھن سنگھ نے چہرے سے کمبل ہٹا لیا اور گھوم کر موٹر کی کھڑکی سے دیکھا۔ سچ مچ سوما کھڑی تھی۔

"جی سو گئے تھے کیا"؟ سوما نے آنچل کے کونے سے بندھی، سوندھی سوندھی مہکتی ہوئی ایک پوٹلی دھن سنگھ کی طرف بڑھا کر کہا۔"جی تم یوں ہی آئے اور گالیاں سُنیں۔ میں تو کہہ ہی گئی تھی کہ یہ لوگ بڑے راکشس ہیں۔ بھلا دروازے پر آئے پردیسی مہمان کو بھی کوئی بھوکا رکھتا ہے؟ میں تو روٹی لے کر آتی ہی۔ اسی لیے تو بھینس دُوہ کر اُٹھی تو میں نے پڑیا کی رسّی کھونٹے سے نکال دی کہ اُسے ڈھونڈنے کے لیے مجھے ضرور بھیجے گی۔"

دھن سنگھ سوما کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔ سوما اُس کے چھُونے سے سمٹ گئی جیسے شبنم سے ٹھٹھری پیٹھ پر پانی کی دھار پڑ گئی ہو۔ دھن سنگھ نے دیکھا، اُس کے کپڑے پالے سے تر ہو رہے تھے۔ دھن سنگھ نے موٹر کا دروازہ کھول دیا اور آہستہ سے کہا۔"پالے میں کھڑی ہے۔ اندر جا۔"

"اب چلوں گی، مرگئی میں پڑیا کو بھی دیکھوں!" سوما نے سکڑ کر جواب دیا۔

"نہیں پل بھر کو آؤ۔" دھن سنگھ نے اصرار کیا۔

"جی نہیں، اب جانے دو نا۔" سوما کے قدم موٹر کی طرف بڑھے اور پیچھے ہٹنے کی ہچکچاہٹ میں لڑکھڑا گئے۔

"میری قسم۔" دھن سنگھ نے ضد کی۔

سوما کا دل پگھل گیا۔"ہائے قسم کیوں دیتے ہو جی۔ ایشور تمھیں رکھے۔ تم بڑے بھلے لوگ ہو جی۔" اُس نے کہا اور دھن سنگھ کو قسم سے بچانے کے لیے سوما کا ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھ کر دھن سنگھ کے سر کی طرف بڑھ گیا۔

دھن سنگھ نے سوما کو موٹر میں اپنے برابر بٹھا لیا اور اُسے آدھا کمبل اُڑھانے لگا۔ سوما گھبرا گئی۔ اُس نے سمٹ کر مخالفت کی۔"مجھے سردی نہیں لگتی۔ تمھیں کپڑا لو۔"

دھن سنگھ مانا نہیں۔ اُس نے اپنی بانہہ سوما کی پیٹھ پر رکھ دی۔ سوما پالے سے بھیگے کپڑوں میں سکڑی جا رہی تھی۔ لیکن اِس پالے سے زیادہ تیکھی اُسے دھن سنگھ کی قربت لگ رہی تھی۔ سوما نے سمجھایا۔"جی نہیں، ایسا نہیں کرتے۔" لیکن کوشش کرنے پر بھی وہ دھن سنگھ سے

دُور نہ ہٹ سکی۔

"سوما ایک بات مانو گی؟" دھن سنگھ نے اُس کے کان میں پوچھا۔

"کیا جی؟"

"مانو گی؟"

"تم بڑے بھلے لوگ ہو جی، کہو نا۔"

"میرے ساتھ چلو گی؟"

سوما چپ رہی۔ دھن سنگھ نے سوال دُہرایا تو رو پڑی۔ دھن سنگھ کا دل بیٹھ گیا۔ اُس نے سوما کے نزدیک جھک کر بے چینی کے ساتھ پوچھا۔ "ناراض ہو گئی، کیوں؟"

سوما نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے سر ہلا کر رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "جی، تم بڑے بھلے ہو جی۔ میری جان بچائی تم نے! میں کہاں جاؤں گی! میں تو یہیں مروں گی۔ ایشور مجھے جلدی سے اُٹھا لیں۔" سوما رونا دبا کر سسکیاں لینے لگی۔ دھن سنگھ اپنی پگڑی کے کونے سے اُس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ سوما کے آنسو رُک ہی نہیں رہے تھے۔ وہ دھن سنگھ سے سمٹی رہنے کی بات بھول گئی۔ سسرال کی سختی اور بے رحمی اُسے پناہ کے لیے دھن سنگھ کے سائے میں ڈھکیل رہی تھی۔

"رو مت سوما میرے سر کی قسم۔ روئیں تیرے دشمن ..... روؤ تو مجھے کھاؤ۔" دھن سنگھ نے اس کا سر اپنے سینے پر دبا لیا۔ سوما قسم کے ڈر سے آنسوؤں کے بہاؤ کو پی گئی۔ اُس کا جسم تھکن سے چُور ہو کر دھن سنگھ کی باہوں میں آ گیا۔ دھن سنگھ نے گہرا سانس لے کر سوما کو اپنی گرم آغوش میں دبا لیا۔ ہوشیار ہونے پر سوما آغوش سے الگ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ "جی نہیں نہیں۔" لیکن زیادہ مخالفت نہیں کر سکی۔ کچھ دیر وہ دونوں ویسے ہی بیٹھے رہے۔

سوما نے دھن سنگھ کی باہوں سے چھوٹتے ہوئے کہا۔ "جی! اب چلوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دھن سنگھ نے اُسے سہارا دے کر موٹر سے اُتارا اور پگڈنڈی تک اُس کے ساتھ گیا۔ سوما اُوپر چڑھ گئی تو دھن سنگھ نے دبی آواز سے پُکار کر پُوچھا۔ "صبح تو پانی لینے باؤڑی پر آؤ گی نا؟"

سوما نے سر جھکا کر یقین دلایا۔

دھن سنگھ پھر کمبل میں لپٹ کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد خیال آنے پر اُس نے دھیرے دھیرے مکئی کی روٹی اور گُڑ کھا لیا۔ اور پھر کہرے اور دھند بھری چاندنی میں بڑے بڑے دھبّوں کی طرح دکھائی دینے والے درختوں اور پہاڑوں کی طرف نظر کیے سوچتا رہا۔ اُسے بیج ناتھ سے مدد کے لیے

موٹر آنے کی فکر نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ موٹر ابھی نہ آئے۔ اِس شام کا واقعہ اُس کے دماغ میں بار بار زندگی کے دیباچے کے طور پر کوند جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ساری زندگی سوما کو پیار اور اُس کی مدد کرتا رہا ہے۔ سوما نے اُسی کے لیے جنم لیا تھا، اور اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔ بھگوان کی خواہش انجانی راہوں میں پوری ہوتی ہے۔

دھن سنگھ نے سوچا سوما نے اُسی کے لیے جنم لیا تھا..... مرد اُسی عورت کو پیار کرنا اور اُسی عورت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینا چاہتا ہے، جو دنیا صرف اُسی کے لیے ہو۔ جو صرف اُسی کو پہچانے۔ یہی بات مرد کی نگاہ میں عورت کی محبت ہے۔ پُرانی یاد سے جتنی نفرت اُس کے دل میں دھن پت کی بہو اور ہوشیار پور میں استاد مظہر خاں کی رنڈی گلابو کے لیے اُٹھ رہی تھی، اُس کے ردِ عمل میں سوما کے سیدھے اور بھولے پن کو وہ اپنی زندگی کا سب کچھ سمجھ رہا تھا۔

چاندنی میں کہرا اور دھند خوب گہری اور ٹھوس ہو گئی تھی۔ کہرے کا دُھندلا پن مِٹ کر اُس میں سفیدی آ گئی۔ دھن سنگھ کی آنکھیں ضرور کھُلی تھیں لیکن وہ اِس تبدیلی سے بے خبر تھا۔ دُور سے موٹر کی غراہٹ سُن کر اُسے پیچھے سڑک پر دور پہاڑی کی بغلوں میں چھپتے، ظاہر ہوتے آگ کے گولے سے دکھائی دیے۔ یہ منڈی سے صبح چار بجے چلنے والی گاڑی تھی۔ دھن سنگھ نے سوچا کمپنی نے بیج ناتھ سے منڈی میں فون کر دیا ہوگا تو یہی گاڑی اُس کی گاڑی کو اپنے پیچھے باندھ کر لے جائے گی مگر سوما ابھی نہیں آئی تھی۔

پیچھے سے آئی موٹر کی روشنی دھن سنگھ کی لاری پر پڑی۔ موٹر نزدیک آ کر رُکی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ بیج ناتھ سے فون تو آیا ہے لیکن ابھی اندھیرا ہے اور یہ سواری گاڑی ہے۔ بوجھ زیادہ ہو جائے گا۔ گھنٹے بھر بعد ٹرک آ کر اِسے کھینچ لے جائے گا۔ دھن سنگھ کو اطمینان ہوا اور فکر بھی ہوئی کہ اُس وقت تک سوما بھی آ جائے گی یا نہیں۔ کہرمیں سے چاندنی کا پیلا پن چھٹ کر سفیدی آ گئی تھی۔ اور اُس میں اوس کی بوندیں لٹک رہی تھیں۔ دھن سنگھ کی نظر برابر ٹیلے کی طرف پگڈنڈی پر لگی ہوئی تھی۔ دل میں شک تھا، شاید سوما دیر سے آئے! اُسے لگ رہا تھا، سویرا بہت جلدی ہو رہا ہے۔

پو پھٹ رہی تھی۔ سوما سر پر اوندھا گھڑا رکھے پگڈنڈی پر سے اُترتی دکھائی دی۔ دھن سنگھ موٹر سے کود گیا۔ سوما کے نزدیک جا کر بولا۔ "آ گئی!" اور اُس نے سوما کی آنکھوں میں دیکھا۔ اب سوما کی آنکھیں پانی ملے کچے دودھ کی طرح نیلگوں نہیں، گلابی اور کچھ اُبھری ہوئی تھیں۔

رات بھر کی بے خوابی اور رونا اِن میں بھرا تھا۔ وہ دھن سنگھ کی طرف دیکھ کر چُپ رہی۔ کانچ کے دو بڑے بڑے موتی جیسے آنسو پلکوں سے لٹک گئے۔ وہ رُکی نہیں، سڑک پار کر کے باؤڑی کی طرف بڑھتی گئی۔ دھن سنگھ نے روک کر پُوچھا۔ "چلے گی میرے ساتھ ؟"

سوما کے آنسو بہہ گئے۔ "جی، مجھے تو یہیں مرنا ہے۔ جی میں راہ دیکھا کروں گی۔ پھر آنا۔ تم بڑے بھلے لوگ ہو جی !"

دھن سنگھ کچھ نہ کہہ سکا۔ سوما آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی باؤڑی کی طرف چلی گئی۔ دھن سنگھ نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ پھر دور سے موٹر کی روشنی دکھائی دی۔ ایک کے پیچھے ایک، تین موٹریں چلی آرہی تھیں۔ دھن سنگھ موٹر کے پاس ہی رُک گیا۔

ایک خالی گاڑی دھن سنگھ کی موٹر کے پاس آکر رُک گئی۔ سردار لبھا سنگھ ڈرائیور نے پوچھا۔ "ہوا کیا ؟ کیسے ہوا ؟" اُس نے دھن سنگھ کی موٹر کو گالیاں دیتے ہوئے اپنی گاڑی سے لوہے کی زنجیر نکالی اور دھن سنگھ کی گاڑی کو اپنی گاڑی کے پیچھے باندھ دیا۔ دھن سنگھ کو ہوشیار رہنے کے لیے کہا اور اسے کھینچ کر لے چلا۔

دھن سنگھ بار بار باوڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرنیں گھاٹی پر چھائی ہوئی اوس کی چادریں چھید کر رہی تھیں۔ اسے سر پر گھڑا لیے پگڈنڈی پر سوما کا سایہ بھی دکھائی دیا، لیکن لبھا سنگھ اُسے کھینچے لیے جا رہا تھا ....

سسرال کا پیار

یوں تو سوما کی زندگی پہلے ہی کی طرح چل رہی تھی لیکن اُس کی طبیعت میں اب تبدیلی آ گئی تھی۔ اب جانور کی طرح سہتے جانے کی عادت نہیں رہ گئی تھی۔ کوئی اُس کی تکلیف کی فکر کرتا ہے۔ یہ خیال اُس کے دُکھ کو اور گہرا بنانے لگا تھا۔ اب اپنے دُکھ کے خلاف دل میں جذبہ پیدا ہونے لگا تھا۔ جیسے آدمی پیٹھ کے پیچھے مددگار ہونے پر آگے سے آنے والے دھکّے کا سامنا کرنے کی ہمت محسوس کرتا ہے۔

دھن سنگھ نے سوما سے چلی چلنے کے لیے کہا تھا۔ یہ بات سوما نے منظور نہیں کی تھی۔ وہ اِس کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ وہ بات ٹھیک نہیں تھی مگر دھن سنگھ کی بات اُس کے لیے بہت بڑا سہارا بن گئی تھی۔

سوما کا گھر سڑک کے نزدیک ہی تھا۔ وہ جب کبھی موٹر کی گڑگڑاہٹ سُنتی، سڑک پر آکر دھن سنگھ ڈرائیور کو پہچاننے کی کوشش کرتی لیکن وہ بھلا آدمی دکھائی نہ پڑتا۔ دکھائی پڑتے تھے. لُچّے ڈرائیور! جو اُس کی بے بسی اور بے چینی کو دیکھ کر آنکھوں اور ہونٹوں سے بے ہودہ اشارے کر دیتے تھے۔ مُنھ سے سیٹی بجاتے یا مسکرا دیتے تھے۔ سوما کبھی پل بھر بیٹھ پاتی تو سوچنے لگتی۔ کیا وہ میرے انکار سے بُرا مان گیا؟ آیا نہیں،

ساس نے ایک ڈلیا مکئی بٹور کر پن چکّی سے آٹا پسوا لانے کے لیے کہا تھا۔ پہاڑوں میں برسات زیادہ ہونے کی وجہ سے چھتیں ڈھلوان ہوتی ہیں۔ ڈھلوان چھت کے نیچے عام طور پر ایک دھنّی ڈال کر چیڑ کے تختے بچھا دیے جاتے ہیں۔ اِس جگہ میں گھر کا اناج اور دوسرا سامان رکھا جاتا ہے۔ سوما اسی جگہ پر بیٹھ کر چھاج سے مکئی پھٹک رہی تھی۔ ساس اپنے بوڑھے جسم کو ذرا آرام دینے کے لیے نیچے چٹائی بچھا کر لیٹ گئی۔ چھاج میں مکئی کے دانوں کی کھڑکھڑاہٹ اور چھاج کی پھٹکار کی پھٹا پھٹ سے ایک تال سی چل رہی تھی۔ اُس سنگیت سے ساس کو نیند آ گئی۔ سسر کسی

کام سے باہر گیا تھا۔ ساس کی آنکھ لگ گئی۔ یہ دیکھ کر بڑی اور منجھلی بہویں پڑوس میں بیٹھنے کے لیے نکل گئی تھیں۔ بڑی بہو جاتے جاتے اپنی گدڑی اور دھاگے کو سوما کے سامنے رکھ گئی تھی کہ مکئی پھٹک کر اس میں چار دوڑے ڈال دے۔

سوما نے سوچا پن چکی پر سے لوٹنے میں دیر ہوگی تو بڑی خفا ہوگی۔ اس خیال سے وہ مکئی چھوڑ کر گدڑی میں ڈورے ڈالنے لگی۔ اسی بہانے کچھ بیٹھ بھی لے۔ پھر تو سر پر پانچ پسیری کی ڈلیا اُٹھا کر گھاٹی میں سوا میل چڑھائی اُترائی جانا آنا تھا۔ ایسے اکیلے میں بیٹھ پاتی تو اسے بڑا اطمینان ہوتا وہ پردیسی ڈرائیور کی باتیں سوچتی رہتی۔

سوما نے سسر کے کھانسنے کی آواز سے سمجھ لیا کہ بوڑھا آگیا۔ بڑھیا کو لیٹی دیکھ کر اور گھر کو سُونا پاکر بوڑھا بڑبڑانے لگا۔ "جانے سب کو موت آگئی ہے۔ اتنا بھی نہیں کہ کواڑ ہی اڑکا دیتیں کُتا بلّی تو نہ گھُسے۔" سوما تختوں کی پھانکوں سے آہٹ پاتی رہی۔ بوڑھے نے چُولھے میں سے اُپلے کی آگ لے کر چلم بھری اور گڑ گڑی لے کر آنگن میں مکان کی دیوار کے ساتھ مٹی کے چبوترے پر بیٹھ کر تمباکو پینے لگا۔

"کیہر میاں رام رام۔" سوما نے آنگن سے آتی آواز سنی۔

سوما کے سسر کی جواب میں آواز آئی "پاؤں چھُوئے ساہ جی۔ آؤ بیٹھو!" "ارے کوئی ہے کہ سب مر گئے۔ منو ساہ کو بیٹھنے کے لیے موڑھا دو نا۔"

منو ساہ عمر میں سوما کے سسر سے دو چار برس چھوٹا ہوگا۔ بہویں اس سے پردہ کرتی تھیں۔ سوما سسر کی پکار سے سر کا آنچل کھینچ کر اُٹھنے کو ہو رہی تھی کہ نیچے سے ساس کی پکار سُنائی دی۔ ساس منو ساہ کا نام سُن کر جاگ اُٹھی تھی اور مہمان کو اندر ہی پکار رہی تھی۔

ساہ نے بڑھیا کی پکار سے اندر آکر کہا "میانی رام رام۔" اور حال چال پوچھنے لگا۔ سسر بھی گڑ گڑی لیے اندر چلا آیا۔ کیہر نے ساہ کی ذات کا خیال کر کے گڑ گڑی میں سے بانس کی نالی نکال لی۔ اور گڑ گڑی ساہ کی طرف بڑھا دی۔ "لو ساہ جی پیو! بڑا اچھا آرہا ہے۔ اپنے کھیت کا تمباکو ہے۔"

منو کھتری جگہ جگہ کا گھی اور اناج بٹور کر روزگار کرتا تھا۔ کیہر سنگھ کے گھر سے بھی گھی لے جاتا تھا۔ کیہر نے اس سے تین سو روپے سود پر لے رکھے تھے۔ منو عام طور پر سود میں گھی لے جاتا تھا۔ بڑی اور منجھلی بہویں پیٹھ پیچھے اسے گالی دیتی رہتی تھیں۔ ساہ کے مارے اُن کے بچے دودھ نام ہی

کے لیے پیتے تھے۔ سب کا سب دودھ گھی بنانے میں چلا جاتا تھا۔ گھر کے لوگوں کو صرف چھاچھ ملتی تھی۔
منو گھی لے جاتے وقت ایسی میٹھی باتیں کرتا جیسے اپنے فائدے کے لیے نہیں بلکہ کیہر کی خدمت کر رہا ہو۔
بُڑھیا کو موڑھا دیتے دیکھ کر منو نے اس تکلف پر بہت اعتراض کیا، اور سادگی سے گھر کی
پسی زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ارے تم کیوں جھمیلا کر رہی ہو مالکن! بہویں کہاں ہیں؟ بچّے تو
ٹھیک ہیں۔ چھوٹی کہاں ہے؟"

"مری وہ چڑیلیں!" بڑھیا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر جواب دیا۔ "مجھے تو پل بھر آرام نہیں ملتا۔
چھوڈی کو تو میں نے کہا تھا کہ مٹھی بھر مکئی پسالانا۔ شام کے لیے آٹے کی چٹکی بھی نہیں۔ دیکھ تو چنگیرے
میں۔ ذرا آنکھ لگی تھی کہ دوسری دونوں پڑوس میں نکل گئیں اور دیا جلنے سے پہلے لوٹیں گی بھی نہیں۔"
"ساہ جی بھائی کیا کریں۔ دیکھتے ہو کیسا وقت آگیا ہے۔؟" کیہر نے ساہ کے آنے کا مقصد سمجھ کر
معافی سی مانگی۔ "اِس بار تو سود کے لیے رُکنا پڑے گا۔"

منو نے گڑگڑی کیہر کو لوٹاتے ہوئے بڑھیا کو جواب دیا۔ "دیکھو نا، جھیانی (مالکن) بھاجی
میاں کی باتیں! سود کا نام کس حرام خور نے لیا ہے؟ میں تو ایسے ہی چلا آیا کہ میاں سے ملا نہیں، دیکھ
آں بچوں کا کیا حال ہے۔ اپنے ہی کلیجے کے ٹکڑے ہیں۔ تم تو جانتی ہو۔ کیوں بھابھی؟"

"ساہ جی تمہارا ہی آسرا ہے،" بڑھیا نے جواب دیا۔ "کاشت کار کی گردن سدا ہی ساہ
کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے لیے تو ساہ جی تمہیں پرمیشور ہو۔"

"کچھ بھی تو اِدھر بچا نہ ہوگا۔" منو نے پوچھا۔ "لگنوں کے دن ہیں نا، آنہ دو پیسے تیز ہی جا رہا
ہے۔ میں تو میاں کے یہاں سے سدا تیزی میں ہی لیتا ہوں کہ تمہیں دو پیسے مل جائیں۔ تم جانتی ہو
مالکن، گھٹنے تو پیٹ کی طرف ہی مُڑتے ہیں۔ کیوں؟"

"کہاں بچ پاتا ہے ساہ جی؟" بڑھیا بے بسی سے ہاتھ پھیلا کر بولی۔ "دیوتا تمہارا بھلا کریں۔ بچوں والا گھر
ہے۔ کبھی دو ڈھائی سیر ہو گیا ہو گیا۔ اِدھر تو بھوری بھینس بھی سوکھ رہی ہے۔ کچھ نکلتا ہی نہیں۔"
منو نے گڑگڑی سے دوسری بار دم لے کر گڑگڑی کیہر کو لوٹا کر کہا۔ "بڑا اصلی تمباکو ہے۔ میاں
بس تم پیو۔" اور رازدارانہ لہجے بولا۔ "مُرلی کی بات سنی؟"

"ہاں، چھوکری بیاہ دی ہے نا! سُنا ہے لڑکا پکّی عمر کا ہے۔ تیاجو (تیسرا بیاہ) ہے۔" کیہر نے دھوئیں سے
کھانس کر اور گڑگڑی پھر ساہ کی طرف لوٹا کر جواب دیا۔

"ہائے لڑکی بھی تو سیانی ہے۔ اس کی کمر بڑھوں (دہم عمروں) کے دو دو ہو چکے۔" بڑھیا ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

منو نے گُڑگڑی گھٹنے پر ٹکالی۔ راز کی بات کہنے کے لیے سرک گیا۔ ہلکا سا کش لگا کر بُڑھیا کو بتایا۔
"ہاں تو کیا ہے مالکن۔ تم جانتی ہو مُرلی نے گن کر چھ سو لیے ہیں۔ ارے لڑکی تو ہے ہی پرائے گھر کی دھروہر۔ تین سو تو میرے ہی دینے تھے۔ لیکن ہے بھلا آدمی۔ خود ہی آکر بولا۔ "لے لو ساہ جی، اسی جنم میں لے لو۔ اگلے جنم میں ایک کے دو دینے ہوتے ہیں۔ تم جانتی ہو مالکن۔ میرا تو چار پیسے کا لین دین ایسے ہی بھلے آدمیوں سے چلتا ہے۔
بڑھیا نے ماتھا ٹیک کر کہا۔" ارے تو بھلا ہو ساہ جی تمہارا ہم نے بھی تو اس کُلچھنی کے چار سو دیے تھے۔ تین سو تو تم سے ہی لیے تھے۔ ابھی تک سود بھر رہے ہیں پیٹ کاٹ کر۔ میرے شیر جیسے لڑکے کو بھی کھا گئی۔" بڑھیا نے دُکھ کی یاد میں اپنی سوکھی آنکھیں پونچھ لیں۔ بڑھیا اپنے جوان بیٹے کے لیے بہت روئی تھی۔ اُس کو یقین تھا کہ یہ بات یاد آتے ہی آنکھوں میں آنسو آ ہی گئے ہوں گے۔" ہوئی بھی کیا، لڑکی! وہ بھی چھ مہینے ہی میں مرگئی مصیبت دے کر۔ ہماری قسمت کھوٹی ہے ساہ جی۔"
سوما اوپر تختوں پر بیٹھی دم رو کے سُن رہی تھی۔ ساہ گُڑگڑی سے ہونٹ لگائے غور و فکر کے انداز میں بولا۔" لڑکی تو پرائے گھر کی امانت ہے۔ لینا دینا دُنیا کا ہے ہی۔ لیکن بھائی بیوہ بہو تو زندگی کا جنجال ہے۔" منو نے دھیمی آواز کر کے کیہر کی طرف جُھک کر کہا۔" آس پاس کے گاؤں میں سو طرح کے لوگ ہیں میاں۔ سب بھلے تھوڑے ہی ہیں۔ کہیں جوان بیوہ بہو کو کچھ ہو جائے تو ناک اور کٹے، جنم بگڑے نہیں تو گلے میں چکی کا پاٹ تو بندھا ہی ہے۔ تم کہو مالکن بُرا کہا منو نے؟"
"کیا بُرا کہا تم نے ساہ، ہوتا نہیں ہے کیا دنیا میں؟" بڑھیا نے اقرار کیا۔" سچ پوچھو تو میرا تو کلیجہ کانپتا رہتا ہے۔ وہ ہے بھی تو سنڈری کی سنڈری، میں تو کہتی ہوں، میکے ہی جا مرے۔ وہاں اپنوں کا ہی پیٹ نہیں بھرتا۔"
"تو ایک بات کہوں؟" منو نے بہت دھیرے سے سمجھایا۔ اوپر بیٹھی سوما کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ سُننے کے لیے سانس روک کر اُس نے کان تختوں کے جوڑ پر رکھ دیا۔ ساہ نے کہا" گلے کا بوجھ بھی کٹے اور کچھ قرض بھی ہلکا ہو۔"
"ہوں"، کیہر نے گُڑگڑی سے ہونٹ ہٹا کر منو کی طرف دیکھا۔ بڑھیا دونوں ہاتھوں سے ٹھڈی تھامے منو کی طرف دیکھنے لگی۔ منو نے بتایا۔" منڈی میں ایک پنجابی ٹھہرا ہوا ہے۔ ڈھائی تین سو تو معمولی بات ہے۔"
خاموشی کو بڑھیا نے توڑا" دہائے تمہارا بھلا ہو ساہ جی، ہم نے تو چار سو بھرا ہے۔" اس نے

ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر لمبی سانس لی۔

"سنو تو بھیانی کی باتیں۔" منو بڑھیا کی سادگی پر ہنس کر بولا" کہاں کنواری لڑکی، کہاں بیوہ! میں تو کہوں گا بچھرا ہوا گھی ہے جتنا بٹر جائے۔"

کیہر ہلکے ہلکے کش لیتا سوچتا رہا۔ منو نے کہا "کہو تو میں بات طے کرا دوں۔ مجھے اس میں کیا ہے؟ تمہارا جتنا بھلا ہو جائے۔ گاؤں میں کہہ دوں گا میکے بھیج دیا ہے۔"

کیہر نے کچھ سوچ کر گھر والی کی طرف دیکھا "لیکن اسے منڈی کیسے لے جائیں گے؟"

"لو سنو میاں کی باتیں!" منو ہنس دیا" کہنا تیرے میکے سے بلاوا آیا ہے۔ واپس آکر گاؤں میں بھی یہی کہہ دینا۔ ارے بیوہ کا کیا ہے؟ جیسی سسرال میں ویسی میکے میں۔"

سوما کے لیے سنتے رہنا ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ سر میں چکر آکر آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا۔ منو جانے کے لیے اپنی چادر سنبھال کر اُٹھ گیا۔ کیہر اُس سے بات کرتا ہوا آنگن سے باہر جا رہا تھا۔ پیچھے سے بڑھیا نے پکارا" کہاں جا رہے ہو؟ میں ذرا پڑوس میں جا کر بہوؤں کو پکارتی ہوں۔ ایسی چڑیلیں ہیں جب دیکھو برہمنوں کے چھپر میں جا بیٹھتی ہیں۔"

"یہی ذرا سڑک تک ساہ کو چھوڑ آؤں۔" کیہر جواب دے کر چلا گیا۔

ساس نے کواڑ اڑکا دیے کہ کتا نہ اندر گھس آئے۔ اور بڑبڑاتی ہوئی بہوؤں کو پکارنے چل دی۔ سوما کی جان بچی۔ اگر ساس جان جاتی کہ سوما نے اُن کی باتیں سن لی ہیں تو سو بہانے سے اُسے گالیاں دیتی، مارتی پیٹتی۔ وہ چھاجن سے اُتری اور مکئی کی ڈلیا سر پر رکھ کر جلدی جلدی آنگن سے نکل کر پگڈنڈی سے گھراٹ (پن چکی) کی طرف اُتر گئی۔ اُس کے کانوں میں منو ساہ، سسر اور ساس کی باتیں گونج رہی تھیں۔

سوما کا کلیجہ دھڑک رہا تھا، اور بار بار آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو چھلک آتے تھے۔ پتلی اور پتھریلی راہ پر ٹھوکر لگ جاتی تھی۔ ہائے دشمن مجھے بیچ دیں گے؟ مسلمان کے ہاتھ، کسی کمین (نیچی ذات) کے ہاتھ جو خرید کر لے جائے گا۔ جانے کیا کیا کرے گا؟ اس سے تو گلے میں پھندا لگا کر مر جاتی تو اچھا تھا۔ پردیسی ڈرائیور کے ساتھ ہی چلی جاتی! وہ پھر آتا بھی تو نہیں۔ وہ بھی کیا بُرا مان گیا؟ مجھ پر تو پرمیشور کی مار ہے۔ ہائے کیا مر جاؤں؟ سوما انھیں خیالوں میں اُلجھی پن چکی پہنچ گئی۔

پورب کی طرف نزدیکی ٹیکری پر سے مرکی گاؤں کا لڑکا بدل بھی اناج لے کر چکی پر آیا تھا۔

سوما کی نظر اُس کی طرف نہیں گئی۔ بدل اُس کی طرف گھور گھور کر مسکرا رہا تھا۔" او ہو میانی رو رہی ہے ؟ کیا ڈلیا بھاری ہے ؟"

دوسرے گاؤں کی بڑھیا برہمنی متھری نزدیک بیٹھی تھی۔ اُس نے ہمدردی سے کہا۔"غریب بیوہ کو تو رونا ہی رونا ہے۔ پریشان کریں، کھانے کو نہ دیں۔"

متھری کے ساتھ کی عورت نے اپنے دُکھ سے آنکھ پر آنچل رکھ کر کہا۔" اب کیا ہے۔ پہلے گاؤں میں ایک آدھ بیوہ ہوتی تھی۔ اب اِس لام (لڑائی) سے تو ضلع ہی بیواؤں سے بھر گیا ہے۔ پہلے لام کے بعد آریہ (آریہ سماج) بیواؤں کا بیاہ کرانے لگے تھے۔ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے ؟ میرے دونوں لڑکے دور انڈ چھوڑ کر چلے گئے۔" وہ اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ لیکن اپنی باری آتے ہی وہ سوما کے پاس سے اُٹھ کر چکّی کی طرف چلی گئی۔

بدل نے سوما کے نزدیک آکر کہا۔" میانی کو روٹی کی کمی ہے ؟ اسے گھی شکر کی چوری میں ڈبو دیں۔ یہ تو بات ہی نہیں کرتی۔"

سوما کوئی جواب دیے بغیر بڑھیا کے نزدیک سرک کر چہرہ آنچل سے چھپا کر بیٹھ گئی۔ بڑھیا کو غصہ آگیا۔ اُس نے ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر بدل پر پھینک دیا، اور گالی دی۔" ابھی ناڑی سوکھ کر گری نہیں، حرام زادہ چلا ہے عیّاشی کرنے۔" اور اونچی آواز میں سب کو سُنا کر بولی۔" بُرا ہو اِس لام کا سرکار نے گاؤں گاؤں کے مرد چن لیے ہیں۔ اب بدمعاشوں کو بھی کسی کا ڈر نہیں رہا جو اُن کے دانت توڑے۔"

سوما پن چکّی سے لوٹتے وقت بھی اپنی قسمت کو کوستی آرہی تھی۔ مصیبت سے بچانے کے لیے بھگوان نے ایک بھلا آدمی بھیجا تھا۔ اُس کی بات میں نے نہ سُنی۔ دن بُرے آتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن لوٹنے پر اُس کی ساس نے اُس کی طرف دیکھا تو پوچھا۔" تجھے کیا ہوا ہے ؟ رو کیوں رہی ہے ؟"

سوما نے ٹال دیا۔" ایسے ہی صبح سے سر درد کر رہا ہے۔"

بڑی بہو بول اُٹھی۔" ہاں ہڈیوں میں مکاری گھس جاتی ہے تو ایسے ہی بہانے سوجھتے ہیں۔ سیر بھر پسان کیا پسا لائی، بہانے کرنے لگی۔"

دوسرے دن دوپہر میں سوما آنگن کے کونے میں بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ کیہر مکان کی دیوار سے پیٹھ لگائے جگت پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اسی لیے سوما نے چہرے پر گھونگھٹ ڈال لیا تھا۔ کیہر نے کمرے کے اندر کسی کام میں بڑھیا کو مخاطب کرتے ہوئے پکار کر کہا۔" او گھر والی، پھر کیا کہنا ہے اس

بات کے لیے ؟"

"کس بات کے لیے ؟" اندر سے ساس نے پوچھا۔

"کس بات کے لیے ؟ ارے کیا سو رہی ہے۔ کل دوپہر کو منو ساہ کمیٹھا سے سندیس دے گیا تھا کہ نہیں۔" کیہر نے گھر والی کو غصّے میں یاد دلاتے ہوئے کہا۔

سوما کے کان کھڑے ہو گئے۔ کمیٹھا میں اُس کا میکہ تھا۔ اُس کے ساتھ منو ساہ کا نام! اندر سے ساس نے جواب دیا۔ "اِس میں کیا سوچنا ہے۔ بھلے آدمیوں نے لڑکی کو بُلایا ہے تو کیسے انکار کریں گے ؟ اِس کا باپ جگ (پوجا) کر رہا ہے۔ جگ کوئی روز روز تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ جگ میں بیٹے بیٹیوں کو بلایا ہی جاتا ہے۔ کیسے انکار کریں گے ؟"

منجھلی بہو نے بڑی بہو کو سنا کر اُن کی بُرائی کی۔ "بڑے آئے جگ کرنے والے۔ بیٹیاں بیچ کر جگ کرتے ہیں۔ بڑے دھرماتما ہیں۔ ہمیں تو میکے کا آنگن دیکھے دو برس ہو گئے۔ وہی بڑی نصیبوں والی ہے نا ؟"

بڑی نے جھلّا کر کہا۔ "دن بھر پانی بھرنا اور کھیتوں میں میلا ڈھونا تو میرے بس کا ہے نہیں۔"

"جب دیکھو بڑ بڑایا کرتی ہے۔ گھر کا کام ہے تو کیا چھوٹی نے ہی ٹھیکہ لیا ہے، اس میں جی جان نہیں ہے ؟" سسر نے بہوؤں کو ڈانٹا۔

بُوڑھے کی تائید میں ساس بول اُٹھی۔ ساس بہوؤں میں روز کی طرح لڑائی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سوما گھونگھٹ میں کانپتی ہوئی برتن مانجھ رہی تھی۔ آج پہلی بار اُس کے دل سے دونوں بہوؤں کے لیے دعا نکلی تھی —— "تمہارا بھلا ہو میری بہنوں! تمہارا سہاگ قائم رہے! تمہارے بچّے جئیں! مجھے نہ جانے دو۔ مجھے بچاؤ! بہنیں مرنے دو میں تمہاری خوب خدمت کروں گی !"

جب ساس بہوؤں کا جھگڑا بہت بڑھ گیا۔ اور گالی گلوج تک نوبت پہنچی، تو ساس نے ایک لکڑی اُٹھا کر منجھلی بہو کی پیٹھ پر دے ماری۔ منجھلی چلّا چلّا کر رونے لگی اور ساس کو کوسنے لگی۔ بڑی مکان کے اندر کھسک گئی۔ ساس نے جھگڑا چکاتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اِن کلموہیوں کا کیا ہے ؟ بکنے دو ان کو! چھوٹی بہو گویا ان کے میکے سے آئی اِن کی باندی ہے ؟ تم دو چار دن میں اسے پہنچا دینا۔"

سوما کا دل چلا رہا تھا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میرے باپ نے مجھے بیچ دیا۔ اب تم بیچنا چاہتے ہو۔ مجھے کھانے کو نہ دو۔ میں ایسے مر جاؤں تو اچھا ہے۔ مگر میں بکوں گی نہیں۔ یہ دھوکا ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔" مگر سسر کے سامنے کیا بولتی ؟ وہ اندر جا کر چوکا لیپنے لگی۔ اُس کا دل

گھبرا رہا تھا اور کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ بڑی مشکل سے رونا روکے ہوئے تھی۔

سوما تیسرے پہر بھینس اور پڑیا کو ہانک کر پانی پلانے باوڑی کی طرف چل دی۔ سوچا" بھگوان شاید آج ہی اُس بھلے پردیسی کو بھیج دے۔ اس نے بہت دیر تک سڑکوں کے کنارے کے کھیتوں میں ٹھہر کر موٹروں کے گزرنے کا انتظار کیا۔ پہلے بیج ناتھ کی طرف کی موٹر آئی۔ پھر منڈی کی طرف سے۔ سوما نے گردن اُٹھا اُٹھا کر، آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈرائیوروں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اِس کے اِس ڈھنگ سے ڈرائیور مسکرا کر، بولیاں بول کر، سیٹیاں بجا کر اور آنکھ کے اشارے کر کے، موٹروں کی تیز چال سے سوما کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گئے۔ سوما کو "بھلا لوگ" ڈرائیور دکھائی نہیں دیا۔

سوما بڑی بے چینی سے موٹروں کے گزرنے کے وقت ہر روز سڑک پر انتظار کرتی اور چھپ کر رولیتی۔ ساس سسر میں ہر روز اُس کے میکے جانے کی بات ہوتی۔ جٹھانیاں طعنے مارتیں۔ 'رانی کے باپ کے یہاں جگ ہے، رانی کے میکے سے ڈولی آئے گی۔ مچھیرا گاؤں کی پانچ گھر کی بستی میں سب لوگ جان گئے تھے کہ سوما کی بستی میں جگ ہونے والا تھا۔

سوما سوچتی۔ کیا جٹھانیوں سے سچ بات کہہ دے۔ مگر وہ کیا مدد کریں گی؟ ساس سے کہہ دیں گی تو وہ اُلٹے اس کی ہڈیاں توڑے گی..... جب کوئی گلے میں رسّی باندھ کر اسے لے جانے لگے گا تو دیکھا جائے گا۔ ایشور مالک ہے۔ کبھی کبھی دُکھی ہو کر یہ بھی سوچتی۔ یہاں ہی کیا سُکھ پا رہی ہوں؟ یہاں کون بھلے لوگ ہیں؟ مجھے خرید کر کیا کوئی بکرے کی طرح کاٹ کر کھا جائے گا؟ سر کاٹ لے تو اور اچھا ہے، جھگڑا مٹ جائے گا۔ لیکن عورتوں کو کاٹ کر کھاتے تھوڑے ہی ہیں۔ آگے سوچنے کی ہمّت نہ تھی..... سسرال میں کم سے کم میری عزّت تو بچی ہے۔ بیوہ کو جو خریدے گا وہ بھلا آدمی تو ہوگا نہیں۔ بیاہ کے لیے کنواری کو خریدنے کی ایک الگ بات ہے۔ مگر میں تو بیوہ ہوں۔ میرا جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو صرف بربادی ہے۔ بیوہ کو تو صرف مسلمان ہی خریدے گا۔ اِس سے تو مرجانا ہی اچھا ہے۔

ساس اس کا چہرہ دیکھ کر بار بار پوچھ لیتی۔ "مری تجھے کیا ہے؟ بخار تو نہیں ہو رہا ہے؟" سوما کا بدن چھونے پر کچھ بخار بھی معلوم ہوا۔ ساس نے کچھ اور پوچھ تاچھ کی اور کہا۔ "گڑ سونف اُبال کر پی لے۔ سونٹھ پھانک لے۔"

"کچھ نہیں ذرا سر میں درد ہے۔" سوما ٹال جاتی۔

ساس نے سوما کو سُنا کر ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے سسر سے کہا۔" جی، چھوٹی کو تم ایک دو دن میں میکے پہنچا آؤ۔ بے چاری کا جی بھی اچھا نہیں ہے۔ ذرا ہوا پانی بدل جائے گا۔ بے چاری بیاہ کر آئی ہے، تب سے میکے گئی بھی تو نہیں۔
سوما دل ہی دل میں اپنی قسمت کو سنے لگی۔

دھن سنگھ سے موٹر کا جو حادثہ ہوا اُس کا معاملہ کچھ اور بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ مالکوں اور ڈرائیوروں کے درمیان جھگڑے کی وجہ بن گیا۔ پنچایت ہوئی اور کئی بکھیڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈرائیوروں کا کہنا تھا کہ ایک تو سفر بہت لمبا ہے۔ سڑک ٹیڑھی میڑھی، اُونچی نیچی اور خراب ہے اور چونکہ لڑائی کی وجہ سے نئی موٹر اور نئے پُرزے آ نہیں رہے تھے۔ گھسا ہوا سامان بار بار ٹوٹتا ہی ہے۔

مالکوں کا خیال تھا، ڈرائیور بڑے بے پروا ہو رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ نوکری کی کمی نہیں ہے۔ کمپنی کی نوکری نہیں تو دوسری بیسیوں جگہیں ہیں۔ کچھ نہیں تو لام پر ہی چلے جائیں گے۔ فوج میں ڈرائیوروں کی بھرتی اچھی تنخواہ پر خوب ہو رہی تھی۔ پچھلے مہینے سے ٹرانسپورٹ کمپنیوں کو مرمّت پر ہزاروں خرچ کرنے پڑ رہے تھے۔ کمپنی مینیجروں نے مل کر یہ سوچا تھا کہ حادثہ اگر ڈرائیور کی بے پروائی سے ہو تو مرمت کا آدھا خرچ ڈرائیور کی تنخواہ سے قسط وار کاٹ لیا جائے۔

ڈرائیوروں میں دو جماعتیں تھیں۔ ایک ٹولی میاں کندن سنگھ اور محسن خاں کی اور دوسری استاد مظہر کی۔ کندن سنگھ اور محسن ڈرائیوروں کی ہر بات پر کمپنی سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ استاد مظہر کو وہ پسند نہیں تھا۔ وہ عام گروہ بندی سے دور رہتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا: مالک اور نوکر کا کیا جھگڑا! جس کا نمک کھایا اُس سے لڑائی کیسی؟ مالک کمائے گا تو نوکر کو بھی دے گا۔ کمائے گا ہی نہیں تو دے گا کہاں سے؟ یہ خدا کا انصاف ہے کہ کوئی مالک ہے کوئی نوکر، خدا نے مالک کو پرورش کے لیے اور نوکر کو خدمت کے لیے بنایا ہے۔ اس کے انصاف میں کیا دخل؟ صبر سے کام لینا چاہیے۔

مظہر کی کوئی خاص جماعت نہیں تھی۔ وہ گروہ بندی میں پڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ مالکوں کا

پُرانا آدمی اور خیر خواہ تھا۔ اُس کی سفارش کا خیال کیا جاتا تھا۔ جو سفارش کرانا چاہتا وہی منظہر کی ٹولی کا ہو جاتا۔ دھن سنگھ منظہر کی گاڑی پر کلینر رہ چکا تھا۔ اُسی سے اُس نے کام سیکھا تھا اور اُسی کی سفارش سے ڈرائیور بنا تھا۔ منظہر کے لیے عزّت کی وجہ سے کندن سنگھ اور محسن خاں کی مسکوٹ (پنچایت) سے دُور ہی رہتا تھا۔ مگر اِس معاملے میں مینیجر صاحب نے اُس کی تنخواہ سے دسؔ روپے ماہوار کاٹنے کا حکم دے دیا تو اُسے کندن کی پناہ میں جانا پڑا۔

میاں کندن سنگھ نے کمپنی کی ماں کو بھاری بھاری گالیاں دے کر کہا۔" ماں کے خصم ایسا ظلم کرسکتے ہیں؟ دو دن کے لیے لائن پر گاڑیاں بند کرادیں تو سالے ساڑھ کیا ساٹھ ہزار کے تلے آجائیں۔"

لیکن یونین کے دوسرے ڈرائیور دھن سنگھ کے لیے جھگڑا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کیوں کہ وہ یونین کا ممبر نہیں تھا اور اس نے بودھ رام ڈرائیور کی چھٹی کے معاملے میں ساتھ نہیں دیا تھا۔

چار پانچ دن یوں ہی بیت گئے۔ جھگڑے کی وجہ سے دھن سنگھ کو ڈیوٹی نہیں دی جارہی تھی۔ اس کا ناغہ ہو رہا تھا۔ دھن سنگھ گھبرا گیا کہ کہیں نوکری سے نہ ہٹا دیا جائے۔ دھن سنگھ منظہر کے پاس جاتا تو وہ سنجیدگی سے وعظ شروع کرتا۔" بیٹا، مالک سے جھگڑنا خدا کے انصاف سے منکر ہونا ہے۔ اللہ سب دیکھتا ہے۔ صبر کرو۔ مالک سے معافی مانگ کر اس کی سزا برداشت کرو۔ خدا انصاف کرے گا۔ مالک کے دل میں رحم دے گا۔ دھن سنگھ کا دل بے عزتی کو اِس طرح برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

میاں کندن سنگھ نے دھن سنگھ کو گھبراتے دیکھا تو اُلٹے گالی دے کر پھٹکارا۔" سالے بہن ... اگر تو نے جاکر کمپنی سے معافی مانگی تو تجھے کاٹ کر کھڈ میں پھنکوا دوں گا، کہیں پتہ بھی نہ چلے گا۔ روز تیری موٹر کا ایکسیڈنٹ کرواؤں گا۔ بہن کے خصم ڈرائیوروں کے گلے پر چھری چلوائے گا۔ آج تو دبا کل دوسرے دبیں گے۔ ہم لوگ کہیں کے نہیں رہیں گے۔"

کندن سنگھ نے اپنی مونچھیں اینٹھ کر کہا۔" اگر تجھے اِس معاملے میں سزا ہو جائے تو یہ پیشاب سے منڈوا دوں گا۔ یونین کو تو کیا سمجھتا ہے؟ سو آدمی اکٹھے ہو جائیں۔" کندن سنگھ نے مٹھی باندھ کر دکھائی " تو پہاڑ کو ڈھکیل دیں۔ کمپنی سالی تو ہماری کمائی کھاتی ہے۔ ماں کے خصم مالک تو لگائیوں کو لے کر بستر میں پڑے رہتے ہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھے برسات میں گرتے پہاڑوں پر سے آدمیوں کو ہم ہی ڈھوتے ہیں۔ میں نے اس کمپنی میں نوکری کی تھی تو چھ موٹریں تھیں، صرف چھ۔ سمجھے بیٹا! اب ایک سو ساٹھ ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں؟ مالکوں کی ...... میں سے؟ سالے، یہ کندن سنگھ کا خون پسینہ ہے۔" اُس نے اپنا سینہ ٹھونکا" تیری ماں کا ...... سالے یہ تیری کمائی ہے۔ اور اکیلا اکیلا ڈرائیور کیا ہے جیسے

گنڈیری چوس کر پھینک دو۔ تیری بہن کا...... خبردار جو ساتھیوں کے ساتھ دغا کی! بیٹا حوصلہ رکھ!"
وصن سنگھ بڑے سکون اور اطمینان سے کندن سنگھ کی گالیاں سنتا رہا، جیسے ہمدردی اور پناہ پا رہا ہو۔ اور پھر یہ گالی تھوڑے تھی۔ یہ تو میاں جی کے دل میں چھپی باتیں تھیں۔

ڈرائیور بابو لال وصن سنگھ کی عمر کا ہی تھا۔ اُس نے تسلّی دی۔"کیوں گھبراتا ہے یار! کمپنی کی ماں کی ایسی کی تیسی۔ بھرتی کھلی ہوئی ہے۔ میرا بھائی بھرتی میں ہے۔ جب چاہے تجھے بھرتی کرا دوں۔ کھانا وردی مفت، اور پینتالیس روپے جیب میں ڈال لینا۔"

ڈرائیوروں کی پنچائت میں کامریڈ بھوشن بھی پہنچا۔ اُس نے وصن سنگھ کو سمجھایا۔"ساتھی تم یونین کا بھروسہ رکھو۔ بابو لال کے چکّر میں مت آنا۔ یہ دونوں بھائی جوانوں کو فوج میں بھرتی کرا کے کمیشن کھاتے ہیں۔ اُن سے پوچھو فوج میں بہت آرام ہے تو خود کیوں نہیں بھرتی ہو جاتے؟ جو لوگ گئے ہیں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ ہم بدیسی سرکار کی مدد کیوں کریں؟ سرکار اور مالک ایک ہیں۔ انگریز ہم پر گولیاں چلائیں۔ ہمیں لوٹیں۔ ہم ان کے لیے اپنی جانیں دیں! تمھیں بتاؤ سرکار نے تمہارے ساتھ کیا بھلائی کی ہے؟ سرکار ہے کیا؟ آج مالک سے جھگڑا ہو جائے، سرکار اپنی پولیس کر مالک کی طرف ہی جائے گی۔"

وصن سنگھ کو مشورے دینے والے اتنے ہو گئے کہ وہ پریشان ہو گیا۔ اِن سب سے بھلا تو کندن سنگھ تھا، جو صلاح ولاح کچھ نہیں سیدھا حکم دیتا تھا۔ اس کے کہنے سے ڈرائیوروں کی پنچائت اکٹھی ہوئی۔ بودھ رام اور اُس کے دوسرے ساتھیوں نے کہا۔"جن لوگوں نے پہلے ہمارا ساتھ نہیں دیا، ہم اُن کے لیے کیوں مریں؟"

وصن سنگھ کو بھی غصّہ آ گیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔"میاں جی رہنے دیجیے! میرے لیے کوئی نہ مرے، میں اپنی راہ دیکھ لوں گا۔"

بھوشن اور کندن سنگھ نے بیچ بچاؤ کیا۔ بھوشن نے مزدوروں اور محنت کرنے والوں کی ایکتا پر زور دیا۔ دو ڈرائیور مان ہی نہیں رہے تھے۔ کندن سنگھ نے بھوشن کی بانہہ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ اور گالی دے کر بولا۔"ان ماں...... کو میں سمجھاؤں گا۔ کون ماں کا خصم، یونین کا مالک بنتا ہے۔ بولے میرے سامنے! یونین سب ڈرائیور بھائیوں کی ہے۔ یونین کو تم کیا سمجھتے ہو۔ یون مالک سے لڑائی کا مورچہ ہے سمجھے! جب مالک ظلم کرتا ہے یونین بنتی ہے۔ سب مالک ظلم کرتے ہیں۔ جیسے سب گھوڑے کھاتے ہیں۔ سمجھے! جو اپنی بہن کے خصم مالکوں کی...... گھستے ہیں وہ مزدور ں

کے دشمن ہوتے ہیں۔ جو سالے سمجھتے ہیں کہ مالک ہمارا باپ ہے، مالک کو اپنی ماں کا خصم بنا نے والوں پر بھی جب مالک ظلم کرتا ہے تو وہ بھی یونین میں آجاتے ہیں۔ اور اپنے بھائیوں سے غدّاری چھوڑ کر ایمان دار بن جاتے ہیں۔ کون ماں ..... ہے جو مزدوروں کا بھائی بننے سے روکنا چاہتا ہے، آئے میرے سامنے! کوئی ماں ...... جو چاہتا ہے کہ ہمارے مزدور بھائی مالک کی ..... میں گھسے رہیں؟ کھڑا ہو جائے ایسا بے ایمان!"

کوئی کھڑا نہیں ہوا۔

کندن سنگھ نے للکارا۔" بس ٹھیک ہے۔ سب بھائی ایک منتا (ہم خیال) ہیں۔ دھن سنگھ کی تنخواہ کوئی نہیں کاٹ سکتا۔ جو مالکوں کا مخبر یہاں بیٹھا ہو، جاکر اپنے باپوں سے کہہ دے کہ دھن سنگھ کی تنخواہ کٹے گی تو ہڑتال ہو جائے گی۔ لائن پر ایک گاڑی نہیں چلے گی۔"

بنسی لال ڈرائیور نے اُٹھ کر کہا۔" بھائیوں، میاں جی کی باتیں اور کامریڈ کی بات ہم سب نے مانی۔ لیکن مالک چالاکی کر رہے ہیں۔ مینجر کا کہنا ہے کہ دھن سنگھ کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ اِس لیے ہوا کہ وہ بے پروائی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ بکری چرانے والی عورت سے مذاق کر رہا تھا۔ یہ بیان مینجر کے سامنے کرمو کلینر نے دیا ہے۔ پنچائت اس کا بھی فیصلہ کرے۔

دھن سنگھ نے کھڑے ہو کر کہا۔" کرمو میرے سامنے آکر گنگا جل اُٹھا کر کہہ دے۔ میں گنگا جل اُٹھا کر قسم کھاتا ہوں۔ یہ جھوٹ ہے۔"

محسن نے اُٹھ کر کہا۔ دھن سنگھ سڑک پر ایسا کمینہ پن کرے گا تو تو یونین اُسے سو جوتے مارے گی۔ لیکن مالکوں کے سامنے ہم ایک ہیں۔"

مینجر صاحب سمجھ دار آدمی تھے۔ ہوا دیکھ کر حیرت ظاہر کی۔ کہ یہ سب کیا جھگڑا ہے۔ ہم نے تو صرف دھن سنگھ کی بدلی کانگڑہ کلو لائن سے ہٹا کر پٹھان کوٹ دھرم سالہ لائن پر کی ہے، کیوں کہ وہاں کی سڑک خراب ہے۔ اور اُس لائن کا پُرانا ڈرائیور گلزاری آگیا ہے۔

دھن سنگھ جرمانے سے تو بچ گیا۔ لیکن اس کی سڑک بدل گئی۔ وہ اسے اچھا نہ لگا۔ منڈی کی طرف جانے کا موقع نہ رہنے سے سوما کو دیکھ پانے کا موقع نہ رہا۔ لیکن بدلنے کی شکایت کیا کرتا؟ مالک کی مرضی۔ چاہے جہاں کام دے۔ چاکری کیا اور نخرہ کیا! یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس پر ظلم ہوا ہے۔ سب ڈرائیور خستہ اور اُجاڑ سڑکوں کے مقابلے میں پٹھان کوٹ کانگڑہ اور پٹھان کوٹ دھرم سالہ لائن کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ دونوں سروں پر اچھے بڑے شہر ہونے کی وجہ سے

کھانے، پینے، ٹھہرنے اور دل بہلانے کی آسانی رہتی تھی۔ ضرورت کی سب چیزیں مل جاتی تھیں۔ جاہل اور پسینے سے مہکتی ہوئی سواریوں کے مقابلے میں فیشن ایبل اور مہذب لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ کچھ دل چسپی بھی رہتی تھی۔ لیکن دھن سنگھ بدلی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں کُڑھتا رہتا تھا۔

پٹھان کوٹ اور دھرم سالہ میں کئی کمپنیوں کے ڈرائیور اکٹھا ہوتے تھے۔ موٹریں چھوٹنے وقت سے پہلے جاڑے کی دھوپ میں اکٹھے ہو کر مونگ پھلی کھاتے یا سگریٹ پیتے ہوئے گپ بازی کرتے تھے۔ بات چیت کا موضوع سڑک پر ہونے والے حادثے، کچھ پڑھے لکھے ڈرائیوروں سے اخباروں میں پڑھی لڑائی کی خبریں، یونین کے جھگڑے۔ یا سواریوں میں آتی جاتی عورتیں ہوتی تھیں۔ ڈرائیور امیر عورتوں کو دیکھ کر دبی آواز میں اُن کے حُسن، جسم، کپڑوں اور چال ڈھال پر تبصرہ کرتے تھے۔ اور غریب عورتوں کا ذکر بے خوف ہوتا۔ ایسی بات چیت کرنے کے لیے ان کے اپنے اشارے اور الفاظ تھے۔ کسی بہت امیر نظر آنے والی رعب دار عورت کو دیکھتے تو کہہ دیتے۔" رولس آرہا ہے۔" کسی موٹی اور بھاری عورت کو دیکھ کر کہہ دیتے۔" ہٹ جاہٹ جا ٹرک آرہا ہے۔" کسی کا نام ہوائی جہاز رکھ دیتے۔ کسی کو دو آبے کی گھوڑی، اور کسی کو بار کی بھینس، کہہ دیتے۔ کسی لڑکی کو پتنگ یا کنکوا بتاتے اور ڈور کاٹنے، کھینچنے اور تھامنے کے لیے آوازے کستے۔ دھن سنگھ بھی ایسے تبصروں میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن اب اسے یہ اچھا نہیں لگتا۔ سوچتا۔ ایسے میں کوئی سوما کا مذاق اُڑائے تو۔ ؟

دھن سنگھ کی منڈی بیج ناتھ سڑک پر کسان لڑکی سے آشنائی کا قصہ ڈرائیوروں میں پھیل گیا تھا۔ اُدھر گاڑی لے جانے والے عام طور پر سبھی ڈرائیور اُس لڑکی کو سڑک کے کنارے انتظار میں کھڑی دیکھ چکے تھے۔ وہ دھن سنگھ سے مذاق کرنے لگے۔" کہو بیٹا، بڑے بھگت بنتے ہو" کوئی کہتا۔" ہم تو آنکھیں سینک کر ہی رہ جاتے ہیں۔" کوئی کہتا۔" اصلی شکاری ہے۔ اُڑتی چڑیا گرالے۔" دوسرے پوچھتے۔" قسم سے سچ کہنا دوست، رات کیسی بیتی تھی ؟ اور شرارت سے اشارے کرنے لگتے۔ یسین نے کہا۔" دوست کہو تو سالی کو ایک روز مال ٹرک میں بوریوں میں چھپا کر لے آؤں ؟"

پہلے تو دھن سنگھ جھینپ کر چپ رہ جاتا تھا، لیکن پھر وہ چڑنے لگا۔ ڈرائیور گرچرن نے بہت ننگا مذاق کر دیا تو وہ اسے مار بیٹھا۔ اِس پر دوسرے ڈرائیور بگڑ گئے۔" یہ سالا مارنے والا کون ہوتا ہے ؟ وہ مادر...... کیا اِس کی گھر والی ہے ؟ ہم بہن...... مذاق بھی نہیں کر سکتے ؟ یہ

سالا وہاں رات کاٹ آیا، اور ہم بات بھی نہیں کر سکتے ؟ یہ کون اُسے بھالو رے ڈال کر ڈولی میں بٹھا کر لایا ہے ؟ کون مادر...... ڈرائیور مذاق نہیں کرتا ؟ ہم نے اِس بہن...... کے لیے مالکوں سے لڑائی سر لی۔ یہ بڑے راجا سنسار چند ہو گئے کہ بجری چراتی پہاڑن سے آنکھ کیا لگ گئی، اُسے رانی بنا بیٹھے! ارے بھائی تمہاری ماں بہن کو، گھر کی عورت کو کچھ کہیں تو گنہ گار ہیں۔ ڈرائیور لوگ ایسے منہ آنکھ پر پٹی باندھنے لگیں، ہر بات سے ڈرنے اور اس کی پروا کرنے لگیں تو دو روز میں مر جائیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے بہن......! گاؤں گھر سے دور، صبح یہاں تو شام کو دو سو میل دور! ہر وقت دھول، گرد۔ نہ وقت پر کھانا نہ سونا۔ اپنی عورت کی شکل دیکھے مہینوں بیت جاتے ہیں اور مادر...... دُنیا بھر کی حوروں، پریوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ دلوں پر چھریاں چل جاتی ہیں۔ بہن...... دو باتیں کر کے دل ہلکا کر لیتے ہیں، اور کیا ؟"

ڈرائیور بلاقی رام ہمیر پور تحصیل کا رہنے والا۔ عمر میں وہ دھن سنگھ سے لگ بھگ بیس برس بڑا تھا۔ دوسرے ڈرائیوروں کو اُسے پریشان کرتے دیکھتا تو بیچ بچاؤ کر دیتا۔ اکیلے میں اُس نے دھن سنگھ کو کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔ "چھوٹے بھائی، یہ سب پاگل پن ہے۔ عشق کا مرض پالنا غریب ڈرائیور کے بوتے کی بات نہیں۔ ڈرائیور کا کیا ہے ؟ وہ تو موسمی پرندہ ہے۔ ہر وقت جان جوکھم میں۔ نشے اور عورت کے بس میں ہونا غلطی ہے، وقت ہے، فرصت ہے، پیسہ ہے، تفریح کر لو لیکن پھنسو مت۔ زر، زمین، زن کو وہی سنبھال سکتا ہے جو جم کر اُس پر بیٹھ جائے۔ ڈرائیور اُنھیں کیسے سنبھالے گا ؟ وہ تو اُڑتا پرندہ ہے جو چونچ بھر دانہ پانی مل جائے وہی اُس کا مقدّر ہے۔ پرندہ تو اُسی وقت اُڑ سکتا ہے جب اُس کے پر کھلے اور ثابت رہیں۔ جال میں نہیں پھنسے۔ ایک بار چاہے جتنا کھلا دو، لٹا دو لیکن عمر بھر کا روگ نہیں پالنا۔ ہم نے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ سمجھو بھیا! یہاں گھر کی، بازار کی، گاؤں کی، شہر کی سب دیکھے بیٹھے ہیں۔ سب شراب کی طرح مزا دیتی ہے۔ سمجھو۔ جب تک اپنے بس میں رہو اس کا مزا ہے۔ جب اس کے بس میں ہو گئے برباد ہو گئے۔"

دھن سنگھ سوچتا، نوکری چھوڑ کر لام پر چلا جائے۔ لیکن پھر سوما کہاں ملے گی ؟

دھن سنگھ تیسرے پہر کی سروس لے کر دھرم شالہ جا رہا تھا۔ نور پور میں سواریوں کے اُترنے چڑھنے کے لیے گاڑی روک کر سڑک کے کنارے کی دوکان سے ایک گلاس لسّی پینے لگا۔ اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کر کے اُس نے گھوم کر دیکھا۔ منڈی لائن کا ڈرائیور بابو لال تھا۔

"سنو تو" بابو لال دھن سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا، اور بولا "تیری موٹر کا ایکسیڈنٹ پالٹا سے پرے ہلکی چڑھائی پر ہوا تھا؟ جہاں پگڈنڈی پر آملے کا پیڑ اور بانس کی جھاڑیاں ہیں۔؟"

دھن سنگھ نے اقرار کیا۔

بابو لال نے بتایا "معلوم ہوتا ہے وہ لڑکی یا تو کسی مصیبت میں ہے یا پاگل ہو گئی ہے۔ ہمیشہ سڑک کے کنارے دکھائی دیتی ہے۔ موٹروں میں جھانکتی رہتی ہے۔ کچھ روئی روئی سی۔ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی ہے۔ بھیا نام تو نہیں بتلاؤں گا لیکن ایسے بھی گنڈے بدمعاش ہیں جو اسے اُڑا لینے کی سوچ رہے ہیں۔ صلاح کر رہے ہیں کہ اسے منڈی لے جائیں یا دھرم شالہ لے آئیں۔ بھیا، بُری بات ہے۔ سالے حرامی چار دن اُس سے کھیلیں گے اور پھر بیچ دیں گے۔ تم سے کیا پردہ۔ سالا بہاری اور افضل یہ تگڑم کر رہے ہیں۔ اسی لیے افضل اپنی ڈیوٹی مال کی لاری پر لگوانے کی فکر میں ہے۔ میرا نام تو بتانا نہیں۔ بس تجھے کہہ دیا کہ انتظام کرلے۔"

دھن سنگھ کے لیے آگے موٹر سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ جیسے تیسے دھرم شالہ پہنچا۔ گاڑی اڈے پر چھوڑ کر کمپنی کے دفتر میں گیا اور چار دن کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ دھن سنگھ ایک گھنٹہ تک کبھی اس پاؤں پر اور کبھی اُس پاؤں پر بوجھ دیے انتظار کرتا رہا۔ لیکن مینیجر نے اُس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ آخر دھن سنگھ بولا "حضور چھٹی چاہیے۔"

"کیوں؟" مینجر نے کاغذوں پر نظر لگائے ہوئے پوچھا۔

"کل صبح گاؤں جانا ہے، ضروری کام ہے۔"

"نوکری ہے کہ تماشہ ہے؟" مینجر نے دھن سنگھ کی طرف دیکھا۔ شام کو آکر سرکار حکم دے رہے ہیں کہ کل صبح چھٹی چاہیے۔ تمہارا کام ضروری ہے۔ میاں جی یہاں ...... بس سو روپے کی ٹھک جائے گی۔ نوٹس ہوتا ہے چھٹی کا، معلوم نہیں؟"

"جناب کیا معلوم تھا۔ گھر سے خبر آجائے گی۔" دھن سنگھ نے خوشامد کی۔

"ایسی چھٹی چاہیے تو عوضی دو۔" مینجر پھر کام میں لگ گیا۔

"صاحب میں عوضی کہاں سے لا سکتا ہوں۔ ابھی پٹھان کوٹ سے آیا ہوں تو گھر پر بیماری کی خبر ملی ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ بیماری آن پڑے گی۔"

سر مت کھاؤ۔ ایک دفعہ جواب دے دیا۔ دیکھتے نہیں ہو کلو تک کی پچاس گاڑیوں کا حساب پڑا ہے۔ تمہارا ہی کام ضروری ہو گیا۔ تمہارے ہی تو ٹکڑے کھاتے ہیں۔ آ گئے بڑے صاحب

بن کر ضرورت والے۔" مینجر نے دھن سنگھ کی طرف نہیں دیکھا۔ دھن سنگھ آدھ منٹ تک کھڑا رہا پھر دانت پیس کر نکل آیا۔ نزدیک ہی دوکان پر محسن خاں اپنی پگڑی کے شملے میں کانچ کا گلاس تھامے، چائے سُڑکتا ہوا شمسُل سے بات کر رہا تھا۔ دھن سنگھ نے روہانسے ہو کر شکایت کی۔ "کیوں خان صاحب کسی کے گھر بیماری ہو جائے تو چھٹّی نہیں ملے گی؟

"کیا بات ہے؟" محسن نے پوچھا۔

دھن سنگھ نے مینجر سے ہونے والی اور اُس کے عوضی پر اصرار کی بات سنائی۔ محسن نے مذاق کیا۔" ابے تیری گھر والی ہی کہاں ہے جو گھر میں بیماری ہو گئی!"

محسن خاں نے خود ہی دوسروں کو سنا کر جواب دیا۔" مادر ..... گھر والی نہیں ہے تو اس کا گھر تو ہے۔ بہن .... آخر کیا یہ آسمان سے گرا تھا۔ جہاں آدمی پیدا ہوتا ہے وہاں گھر ہوتا ہے۔ اُس نے دھن سنگھ کی طرف دیکھا" کیوں رے بہانے بازی ہے کہ مادر ..... سچ بات ہے؟ میاں، تجھ پر رنگ چڑھ رہا ہے۔ اسی دن موٹر کا یونی ورسل جائنٹ توڑ آیا سُسر۔ کمپنی کی .... .. میں سوا سو کا ڈنڈا کر دیا۔ آج چھٹی چاہیے بغیر عوضی کے۔ سالا ایک ہی حرامی ہے۔" محسن نے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور ہنس پڑا۔

دھن سنگھ نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔" خاں صاحب یہ تو مجبوری ہے۔ اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

"لیکن بھائی عوضی تو چاہیے۔ مادر ..... کمپنی سالی آدمی کے بغیر موٹر اپنے ...... سے چلائے گی؟ ان کی ماں یہ سالے کمپنی والے (SPARE) اسپیئر بھی تو نہیں رکھتے۔" محسن نے سمجھایا۔

"ہے تو اسپیئر" شمسل نے ٹوکا۔

" تو کس کی جگہ کام کر رہا ہے؟ کون ہے چھٹی پر؟

" شمسُل نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔" ہماری جگہ۔"

" تو چھٹی جا رہا ہے! تجھے کیا کام ہے؟

استاد ہے ایک کام۔ بہت ضروری ہے۔ شمسُل نے آنکھیں مٹکائیں۔

محسن نے چائے کا خالی گلاس الگ رکھ کر پگڑی کے شملے سے مونچھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "آخر معلوم تو ہو کیا ضروری کام ہے؟"

"استاد طبیعت کچھ پریشان ہے۔" شمسُل مُسکرایا۔ شمسُل کے پیچھے بڑا ہرنام مُسکرا کر بولا۔
اُستاد بتا دوں اسے کیا کام ہے؟"

شمسُل نے دھمکایا۔ "سالے چپ! تجھے کیا معلوم؟ میرا پرائیوٹ کام ہے۔ استاد یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اسے نہیں معلوم۔"

محسن نے ہرنام کی طرف دیکھا۔

"استاد یہ بٹالے والی میرن رنڈی کے یہاں جا رہا ہے۔ آج منڈی سے دیسی شراب کی بوتل لے آیا ہے۔" ہرنام نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

شمسُل نے زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنے کے انداز میں دہائی دی۔ ایمان کی قسم استاد یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے نہیں معلوم۔"

محسن چار پانچ گالیاں ایک ہی سانس میں بک گیا۔ "تیری ماں کا...... مائیلج (دھتّا) بہت جڑ گیا ہے۔ حرامی رنڈی بازی کرے گا! ارے ہرنام نکال لا سالے کی بوتل! سالا رنڈی کو پلائے گا۔ اس کی ماں......! وہ تو سالی تجھے پی جائے گی۔ ایک بھائی کی مدد نہیں کرے گا۔ اپنی کمائی رنڈی کو دے گا۔ سالے آتشک لگ جائے گا۔ پھر اس بہین...... چپّو کی طرح ہاتھ میں تھامے پھرے گا۔"

شمسُل ہائے توبہ کرتا رہ گیا۔ محسن خاں کے اشارے پر ہرنام اور جواہر نے اُس کی بوتل نکال لی۔

محسن نے دھن سنگھ کو یقین دلایا۔ "دو بیٹا گھبراؤ نہیں۔ کہہ دو سالے مینیجر سے محسن خاں عوضی کر لیں گے۔ یہ سالا شمسُل کرے گا۔ ایک چکّر ہم لگا دیں گے۔ پرسوں بلاقی کا رِسٹ ہے۔ پرسوں وہ کر دے گا۔ بھلا آدمی ہے بے چارا۔ لیکن بیٹا تم کہیں ہفتہ نہ لگا دینا۔ نہیں تو میاں کندن سنگھ سے کان کھنچواؤں گا۔ سمجھے!"

دھن سنگھ نے رات بھر سوچ سوچ کر اپنا منصوبہ تیار کیا۔ ڈاک خانے میں اُس کے ستّر روپے تھے، لیکن رات میں انھیں نکلوا نہیں سکا تھا۔ اُس نے دو دو پانچ پانچ کر کے بیس روپے ڈرائیوروں سے اُدھار لیے اور کل ملا کر چالیس روپے کر لیے۔ دوسرے دن وہ صبح ہی کمپنی کی بیج ناتھ تک جانے والی گاڑی میں روانہ ہو گیا۔ اس گاڑی کے دو گھنٹے کے بعد اس کی اپنی کمپنی کی سیدھی پٹھان کوٹ سے کلو سروس کی گاڑی جاتی تھی۔ وہ سوچتا جا رہا تھا، موٹر گزرنے کے وقت سوما منڈک پر آتی ہے۔ وہ کچھ پہلے ہی پہنچ جائے گی۔ اگر اُس نے چلنے سے انکار کیا تو وہ اپنے سر کی قسم دے کر کہے گا۔ لوجان

اب تو مرنا جینا تیرے ساتھ ہی ہے۔

دھن سنگھ جس گاڑی میں بیج ناتھ تک گیا اُس کا انجن ٹھیک نہ تھا اس لیے گاڑی بیج ناتھ آدھا گھنٹہ دیر کرکے پہنچی۔ وہ فوراً پالمپور کی طرف پیدل چل دیا۔ وہ تیز چال سے جا رہا تھا۔ اس حصّے میں سڑک تنگ ہونے کی وجہ سے موٹریں ایک وقت یک طرفہ چلتی ہیں۔ پہلے منڈی سے بیج ناتھ کی طرف اور بیج ناتھ سے منڈی کی طرف کی موٹر آ رہی تھی۔ سڑک پہاڑیوں کی بغلوں میں گھوم گھوم کر جاتی ہے۔ اس لیے کسی جگہ پر آنکھ سڑک پر کچھ ہی قدم دیکھ پاتی ہے اور کسی جگہ پر سڑک کئی میل تک بے پروائی سے پڑی رسّی کی طرح دکھائی دیتی ہے۔

سامنے سے موٹر آ رہی تھی۔ دھن سنگھ دھول اور پہچانی آنکھوں سے بچنے کے لیے کھیت میں اُتر گیا۔ موٹر گزر جانے کے بعد پھر سڑک پر چڑھ گیا۔ چڑھائی کی وجہ سے اُسے پسینہ آ رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے سے وہ چل رہا تھا۔ اب بیج ناتھ سے چلنے والی موٹروں کے اُوپر کی طرف جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اگر اس کی موٹر دیر کرکے نہ آئی ہوتی تو اب تک بھیرا پہنچ گیا ہوتا۔ وہ اور تیز چلنے لگا۔ ٹیلا دکھائی دینے لگا تھا۔ لیکن ابھی جگہ دو میل سے کم دور نہ تھی۔ سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اور اُس پر چُونے سے پُتے ہوئے فرلانگ کے پتھر دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پیچھے سے آتی ہوئی موٹروں کے انجنوں کی گُونج سنائی دینے لگی۔ وہ اور بھی تیز چلنے لگا۔ اُس کی سانس پھُول رہی تھی، ماتھے کا پسینہ بہہ کر اُس کے پاؤں اور جوتوں میں چپچپانے لگا تھا۔

پیچھے سے تیز آتی ہوئی موٹر نزدیک پہنچ رہی تھی۔ سامنے سڑک پر ٹیلے کے نیچے اُسے ایک عورت بھی دکھائی دی۔ عورت آنکھوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے ہاتھ کی اوٹ کیے اسی کی طرف موٹروں کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اُسے وہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اگر وہ اس کا آنا جانتی تو پہچان بھی لیتی۔ دھن سنگھ کا دل چاہ رہا تھا، آواز دے کر پکارے۔ آواز اتنی دور نہ پہنچ سکتی تھی، اور اچھا بھی نہ تھا۔ دھن سنگھ ہانپ رہا تھا۔ وہ اور تیز چلنے لگا۔ ایک موٹر دھول اُڑاتی ہوئی نزدیک سے گزر رہی گئی۔ موٹر موٹر ہے اور آدمی آدمی۔ موٹر لوہے کے پھیپھڑے سے گیس کا سانس لیتی ہے۔ خون اور رگوشت کے پھیپھڑے سے سانس لینے والا آدمی اس کی برابری کیسے کرے؟ کچھ دیر سے اور موٹریں آئیں اور دھن سنگھ کی کمزوری پر دھول پھینکتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئیں۔ وہ سدا موٹر پر آتا جاتا تھا۔ پیدل چلنے والوں پر ایسے ہی دھول پھینکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھُول گیا تھا۔ سڑک اندر کی طرف مُڑ گئی۔ اب دھن سنگھ کو ٹیلا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

اُس کا دل شک سے دھک دھک کر رہا تھا۔ موٹریں گزر جائیں گی تو سوما لوٹ نہ جائے۔ گھر چلی
جائے گی تو وہاں کیسے جاسکے گا؟

دھن سنگھ آڑ میں سے گزرنے والی سڑک کے حصّے پر سے کھُلے حصّے میں آیا تو موٹریں ٹیلے سے
بہت دور آگے جاچکی تھیں۔ سڑک پر دھول کا غبار بھی ہوا کے جھونکوں سے صاف ہوگیا تھا۔ سوما اب
وہاں نہیں تھی۔ آڑ میں ہونے کی وجہ سے دھن سنگھ یہ بھی نہ جان سکا کہ سوما کس طرف گئی تھی؟۔
گھر کی طرف یا باوڑی کی طرف۔ اب اور تیز چلنا بے کار تھا۔ دھن سنگھ کی رفتار سُست ہوگئی۔ تیز
چلنے کی وجہ سے اُس کو پیاس بھی لگ گئی تھی۔ قدم قدم چلتا وہ سوچنے لگا تھا۔ سوما کے پھر سڑک
کی طرف آنے یا پانی کے لیے باوڑی پر آنے تک، وہ کہاں تک انتظار کرے گا؟ باوڑی پر جا کر
پانی پیے گا۔ اور سڑک پر درختوں کے نیچے انتظار کرے گا؟

دھن سنگھ باوڑی کے نزدیک پہنچا۔ تو تھپ تھپ تھپ تھپ کی آہٹ باوڑی سے سنائی دی۔
سمجھا کوئی عورت لکڑی کی مونگری سے پیٹ کر کپڑے دھو رہی ہے۔ عورت کو اپنے آنے سے ہوشیار کرنے
کے لیے اُس نے کھانس دیا۔ اور پھر گردن اونچی کر کے دیکھا، ایک جوان عورت جسم کو میلی سی اوڑھنی میں لپیٹے
ایک کندھے پر سر ڈالے بے دلی کے ساتھ دھیرے دھیرے بھیگے کپڑوں کو پیٹتی جا رہی تھی اور دوسرے
ہاتھ کی انجلی سے اُن پر باوڑی کا پانی ڈال رہی تھی۔ عورت کے سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے، جھُکا ہوا
چہرہ دکھائی نہیں پڑتا تھا۔

عورت نے دھن سنگھ کی کھانسی اور جوتوں کی چاپ نہیں سنی۔ عورت کو اس حال میں دیکھ کر
دھن سنگھ ہچکچایا۔ پھر زور سے کھانسا کہ عورت اپنے کپڑے سنبھال لے۔ مونگری سے کپڑے پیٹنے کی آواز
کی وجہ سے عورت نے یہ آہٹ بھی نہ سنی۔ وہ پھر کھانسنے کو تھا کہ خیال آیا، سوما ہی تو نہیں؟ کپڑے اور
بدن کی بناوٹ سے سوما ہی معلوم ہوتی تھی۔ دھن سنگھ کی آنکھیں اور کان، ناک سبھی خوشی سے سنسنا اُٹھے۔
اور اُس کے قدم زور سے زمین پر پڑے۔ آواز پیدا ہوئی۔

سوما یکایک چونکی۔ اُس کی آنکھیں آنے والے کی طرف اُٹھیں۔ وہ پل بھر کے لیے سہم گئی۔
پھر پہچان کر اُس کا چہرہ گلابی ہوگیا، اور آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ اپنی اوڑھنی میں بالکل سمٹ گئی۔
شرم سے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

دھن سنگھ ایک چھلانگ میں باوڑی کی جگت سے پانی کے کنارے آپہنچا۔ اور سوما کے
اُلجھے ہوئے بالوں پر ہاتھ رکھ کر بھرے ہوئے گلے سے اُس نے پکارا۔ "سوما۔!"

سوما نے کانپ کر کہا۔ "جی، کپڑے نہیں پہنے ہیں۔ ہائے کوئی اور آ جائے گا۔"

دھن سنگھ نے کپڑوں کی طرف دیکھا اور سمجھا۔ ڈھیر سے بھیگے ہوئے میلے کپڑے ایک پرات میں پڑے تھے۔ اور دو تین سوما کی مونگری کی مار کھا رہے تھے۔ پہلے وہ اپنے پہننے کے کپڑے دھو ہی تھی کہ اُنھیں دُھوپ میں ڈال دے۔ جب تک باقی کپڑے دھوئے گی، اُس کے اپنے کپڑے سوکھ جائیں گے۔

"تو پہن لے نا جلدی سے"۔ دھن سنگھ بولا۔

"یہ تو دھودئے ہیں، دھوپ میں ڈالوں گی۔ سوکھیں گے ذرا تو پہنوں گی۔" وہ اپنے میں ہی سمٹی ہوئی تھی۔ کچھوے کی طرح اُس نے ذرا گردن اُٹھا کر سمجھایا۔ اور اسی سانس میں کہہ گئی۔ "جی، میں تمہاری بڑی راہ دیکھتی رہی۔"

"میں آگیا۔"

"جی تم بڑے بھلے لوگ ہو۔ تم ذرا آڑ میں ہو جاؤ۔ میں یہ کپڑے سوکھنے کے لیے پھیلا دوں۔"

دھن سنگھ گہری سانس لے کر مجنوں کے پیڑ کی طرف چلا گیا۔ سوما نے اپنے گیلے کپڑے باؤڑی کی جگت کے تپے ہوئے پتھروں پر پھیلا دیے اور باقی کپڑوں کو دھونا چھوڑ کر باؤڑی کے کونے میں سمٹ گئی۔

دھن سنگھ باوڑی میں لوٹ آیا اور سوما سے ذرا دوری پر پانی کے پاس بیٹھ کر انجلیوں سے پانی پی کر دبی آواز میں بولا۔ "تجھے لینے آیا ہوں۔"

سوما نے سر جھکائے پانی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "جی سسر تو مجھے منڈی میں بیچنے کے لیے لے جانا چاہتا ہے۔ منو ساہ سے صلاح کر لی ہے۔" اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ "اسی لیے میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

دھن سنگھ حیرت سے سوما کی طرف دیکھتا رہا۔ پل بھر سوچ کر وہ بولا۔ "چھوڑ ان مرے کپڑوں کو۔ کپڑے ذرا سوکھ جائیں تو جھٹ سے پہن لے اور چلی چل۔ کھیتوں کھیت کھڈ کی راہ اُدھر اُتر چلیں۔ سڑک پر لوگ تجھے جانتے ہوں گے۔ پالٹا سے آگے موٹر پر بیٹھ جائیں گے۔"

سوما اوڑھنی کے کنارے سے آنسو پونچھنے لگی۔ اُلجھے ہوئے بالوں سے بھرا ہوا اُس کا سر سسکیوں سے ہلنے لگا۔

دھن سنگھ نے اطمینان کے لہجے میں کہا۔ "سوما، میں تجھے لے کر ہی جاؤں گا۔ جان دے دوں گا

مگر ان قصائیوں کے ہاتھ میں تجھے نہ رہنے دوں گا۔

سوما کچھ نہ بول سکی۔ ویسے ہی روتی رہی۔ دھن سنگھ نے پھر کہا۔ "اب اُٹھ، وقت نہ کھو۔ اب چل دے۔ تیسرے پہر منڈی سے لوٹتی کوئی گاڑی پالٹا سے نیچے پکڑلیں گے۔"

"جی میں کہاں جاؤں گی؟" سوما نے بے سہارا ہو کر کہا۔

"دوسرے کے ہاتھ بکے گی۔ میرے ساتھ چل۔" کلیجے کی دھڑکن سے دھن سنگھ کی آواز کانپ رہی تھی۔

سوما اُٹھ کھڑی ہوئی۔ باوڑی کی جگت پر پھیلے اپنے کپڑے سمیٹ کر جھاڑیوں کی آڑ میں چلی گئی۔ اور دو منٹ میں بھیگے بوجھل کپڑے پہنے آ گئی۔ وہ دونوں باوڑی سے بہتے نالے کے کنارے کنارے کھڈ میں اُتر گئے۔

دھن سنگھ اس جگہ کو جانتا نہ تھا۔ سوما آنچل سے آنسو پونچھ پونچھ کر راہ بتاتی چل رہی تھی۔ دھوپ اور ہوا سے اُس کے کپڑے سوکھ گئے۔ پالٹا سے آدھا فرلانگ جا کر وہ سڑک پر آ گئے۔ بغیر راہ کی اوبڑ کھابڑ چڑھائی پر تیزی سے چڑھنے کی وجہ سے دونوں ہانپ گئے تھے۔ اُسی وقت منڈی کی طرف سے جاتی ہوئی موٹروں کی گونج سنائی دی۔ اس جگہ پر سڑک ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر گھوم گئی تھی۔ اس لیے پیچھے سے آتی موٹریں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ سڑک پر ٹیلے کا سایہ پڑ رہا تھا۔ وہیں وہ دونوں سانس لینے کے لیے ٹھہر گئے۔ دھن سنگھ نے سوما کے چہرے پر چھلکتا ہوا پسینہ اور اُس کی تیز چلتی سانس دیکھ کر کہا۔ "موٹر پر چڑھ لیں۔" اُس نے سوچا بھی، ورنہ پیدل چل کر وہ لوگ کسی طرح رات سے پہلے بیج ناتھ نہیں پہنچ سکتے۔

پہلی موٹر نزدیک آئی تو دھن سنگھ نے راہ چلتے مسافر کی طرح ہاتھ اُٹھا کر موٹر کو روکنے کا اشارہ کیا۔ وہ موٹر اُس کی کمپنی ہی کی تھی۔ دھن سنگھ سہم گیا مگر ہاتھ اُٹھا چکا تھا۔ اور موٹر رک رہی تھی۔ اُس نے سامنے کے شیشے میں سے ڈرائیور کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ سڑک کے بائیں طرف ہونے کی وجہ سے سواریوں کی آڑ میں ڈرائیور کو دیکھ نہ سکا۔ موٹر کچھ قدم پر جا کر رُک گئی۔ تو موٹر کی طرف بڑھا تو میاں کندن سنگھ کو موٹر سے اُتر کر اپنی طرف آتے دیکھا۔

دھن سنگھ سہم کر بولا۔ "میاں جی، سواری کی جگہ چاہیے۔"

میاں نے دھن سنگھ کی طرف چبھتی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "یہ عورت کون ہے؟"

دھن سنگھ نے جواب دیا۔ "میاں جی بھابھی ہے میری۔ اسے ساتھ لے کر گھر جاؤں گا۔"

کندن سنگھ نے ذرا آواز دبا کر کہا۔ "ماں کے .... ہمیں بتاتا ہے۔ بہن ..... کے اسی لیے بہانے سے گھر پر بیاری کی چھٹی لی تھی۔ دوسرے تیری عوضی دے کر مریں اور تو ماں کا چھنا لا کر تا پھرے۔ اسی کرتوت میں موٹر توڑی تھی۔ بہن ..... حرامی کے پلّے۔"

"استاد" دھن سنگھ صفائی دینا چاہتا تھا۔ لیکن کندن سنگھ نے ڈانٹ دیا۔ "چپ ماں کے .... اپنے باپ کو سکھاتا ہے۔ خبردار کسی موٹر پر پاؤں رکھا! سالے ٹانگ کاٹ دوں گا۔ دوسرے ڈرائیور کو پھنسائے گا؟ چلا جا پیدل اپنی اِس اماں کو لے کر اور چھوڑ کر آ اس کے گھر!"

دو موٹریں ایک کے پیچھے ایک چلی آ رہی تھیں۔ موٹروں کی چال دھیمی دیکھ کر کندن سنگھ نے انھیں نکل جانے کا اشارہ کیا اور دھن سنگھ کی کوئی صفائی نہ سُن کر اپنی موٹر کی طرف چل دیا۔ دوسری کئی موٹریں آئیں اور چلی گئیں۔ دھن سنگھ کو سواری کے لیے اشارہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اُس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ سوما کو اُس نے سمجھایا۔ "یہاں گاڑیوں میں جگہ نہیں ملے گی۔ بیج ناتھ سے موٹر میں بیٹھ جائیں گے۔"

سوما چپ چاپ دھن سنگھ سے ایک قدم پیچھے اُس کے ساتھ چلنے لگی۔

دھن سنگھ اور سوما سڑک پر پانچ میل چل چکے تھے۔ سورج پچھم کی طرف پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا۔ جلد ہی اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا تیزی سے چلنے لگی۔ چلنے کی وجہ سے دونوں کو پسینہ آ رہا تھا۔ پسینوں سے تر کپڑوں میں ہوا گھسنے سے کپکپی سی پیدا ہو جاتی تھی۔ اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے دھن سنگھ کو شک سے دیکھنے والی نظروں کا ڈر نہ رہا۔ کنکریلی سڑک پر اتنی دور سے ننگے پاؤں چپ چاپ چلی آتی سوما کے لیے اُس کا دل پگھل پگھل جاتا۔ وہ اسے بار بار نہ گھبرانے اور تھکاوٹ کی فکر نہ کرنے کے لیے تسلّی دے رہا تھا۔ سوما نے ہانپتے ہانپتے اپنے سسر اور منو ساہ کی سازش کی بات تفصیل سے سنا دی۔ اور آنکھیں پونچھ کر کہا۔ "تم بڑے بھلے لوگ ہو جی۔ تمہارا ہی سہارا ہے۔ چاہے مارو چاہے جلاؤ۔"

دھن سنگھ نے دھرم شالہ، کلو اور پٹھان کوٹ میں انگریزوں اور دوسرے بڑے لوگوں کو اپنی عورتوں کی باہنہ پکڑے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، سہارا دے کر چلتے دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس کے دل میں گدگدی ہوتی تھی۔ وہ دوسرے ڈرائیوروں کے ساتھ مل کر اس نظارے پر عریاں مذاق کر کے قہقہے لگاتا تھا۔ لیکن اِس وقت ہمدردی، فرض، اختیار کے احساس سے اُس نے سوما کو اسی طرح سہارا دینے کی کوشش کی۔ سوما اِس سے اُلجھن میں پڑ گئی۔ سمٹ کر اُس نے کہا۔ "جی ایسا نہیں کرتے۔ تم بڑے

بھلے لوگ ہو جی۔"

دھن سنگھ نے اسے پچکار کر سمجھایا۔" بھلیے، اِس میں کیا ڈر ہے؟ کون دیکھتا ہے۔ تو تھک گئی ہے ذرا سہارا لے لے۔" لیکن سوما سے بن نہ پڑا۔ اُسے اس طرح چلنے میں عجیب معلوم ہوتا تھا۔ اپنی سرمائی ہوئی آنکھیں اندھیرے میں دھن سنگھ کی طرف جھپکا کر اور سمٹ کر اُس نے کہا۔" نا جی"۔ اور پرے ہٹ کر بہت تیز قدموں سے دھن سنگھ کے برابر چلنے لگی۔

بیج ناتھ" پُن اور بینا"، کھڈوں کے بیچ اُونچی بھیلی اُبجاؤ ٹیکری پر لمبا بسا ہوا ہے۔ پُن کھڈ کے پُل سے اُوپر چڑھائی میں موٹر سڑک ۔ چکر کھا کھا کر جاتی ہے۔ لیکن پیدل مسافر پتھروں کی بنی ہوئی سیڑھیاں چڑھ جاتے ہیں۔ دھن سنگھ اور سوما ہانپتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ اندھیرا، سنسان خاموشی اور ٹھنڈی ہوا کو چیرتی ہوئی بیج ناتھ کے تھانے سے گھڑیال کے بجنے کی آواز سُنائی دی۔ سات بج رہے تھے۔ دور سے تیز چال سے چل کر آنے کی وجہ سے، اور لمبی سیڑھیاں چڑھنے سے سوما اور دھن سنگھ دونوں ہی بہت ہانپ گئے تھے اور تیکھی ٹھنڈی ہوا میں بھی ان کے ماتھے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ دھن سنگھ نے اپنی تھکاوٹ سے زیادہ سوما کا خیال کرتے ہوئے کہا۔ پل بھر بیٹھ لو۔"

دور نیچے کھڈ کے سفید پتھروں سے بھرے، برسات میں بہنے کے لیے چوڑے پاٹ میں سکڑی سمٹی "پن" کی موجیں کل کل کر رہی تھیں۔ اونچائی پر پاس پڑوس کی چیلیوں (چیڑ کے جنگل) سے سرسراتی ہوا بہہ رہی تھی۔ سیڑھیوں کی اس اونچائی پر دھن سنگھ اور سوما سمٹے سکڑے، ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے بیٹھے تھے۔ دھن سنگھ کی قربت اور لمس سے سوما الجھن میں تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اب وہی تو اکیلا سہارا تھا۔ کندن سنگھ کی کڑوی پھٹکار کی یاد دھن سنگھ کے دماغ کو چھید رہی تھی۔ لیکن سوما کو بغل میں پا کر وہ ایک طرح کی کامیابی اور مالکانہ حیثیت کو محسوس کر رہا تھا۔ اپنی اس کامیابی اور اُس کی تکمیل کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔

"سنو ہ"، دھن سنگھ نے سوما کو مخاطب کیا۔ سوما نے جھکا ہوا سر ہلا کر حامی بھری کہ سُن رہی ہے۔ "آگے ہی بازار ہے۔ کھانے کے لیے مل جائے گا۔ تو بہت تھک گئی ہے۔ رات یہیں سرائے میں رہ جائیں گے۔ یا کسی دوکان پر چار پیسے کرایہ دے کر کھاٹ لے لیں گے۔ اور سُن بازار میں لوگ اچھے نہیں ہوتے۔ کوئی پوچھے گا تو یہی کہوں گا کہ ہم مُرد جناس، (پتی پتنی) ہیں۔ سمجھ گئی۔ تو بھی یہی کہنا۔ سمجھی نا ؟"

سوما کو اِس بات سے جھرجھری پیدا ہو گئی مگر اُس نے سر جھکا کر حامی بھر لی۔ اب یہ بات

بُری نہیں لگی۔ وہ اور کہہ بھی کیا سکتی تھی؟

"گھر ہمیر پور کی تحصیل بڑسر کے تھانے میں بتا نا۔ ہم لوگ منڈی میں یہاں رشتہ داری میں گئے تھے۔ یہاں سے موٹر میں پالم پور ہو کر گھر لوٹ رہے ہیں۔" دھن سنگھ نے سمجھا دیا اور دونوں بازار کی طرف چل دیے۔

بازار میں کچھ مکانوں سے دھندلی روشنی پھیل رہی تھی۔ دوکانیں عام طور پر بند ہو چکی تھیں۔ کچھ دوکانوں میں لالٹین یا مٹی کے تیل کی ڈھبریاں جل رہی تھیں۔ دھن سنگھ اور سوما زیادہ دور نہیں بڑھ پائے تھے کہ سڑک پر ٹہلتے لمبا کوٹ پہنے ایک آدمی نے دھن سنگھ کو ٹوک کر پوچھا۔ "کون ہو، کہاں جا رہے ہو؟"

دھن سنگھ سمجھ گیا کہ پولس کا سپاہی ہے۔ ایک نظر بھر اس نے پولس کے سپاہی کے چہرے کو دیکھا۔ کبھی سڑک کی ڈیوٹی پر اسے دیکھا تھا یا نہیں! پہچان نہ سکنے پر اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مسافر ہیں مالک۔"

"مسافر!" سپاہی نے گہری نظر سے، نزدیک کی دوکان سے آتی لالٹین کی روشنی میں دھن سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "کیسے مسافر؟ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟"

"منڈی سے۔"

"منڈی سے؟ بڑی منزل ماری ہے بھائی! عورت کو لے کر چل رہا ہے۔ کوئی گٹھری مٹری، دُجکا اُجکا (پیٹھ پر لدا ہوا بوجھ)؟"

جمع دار صاحب ایسے ہی چلے آئے۔ سامان ساتھ کے آدمی کے ہاتھ موٹر میں دے دیا ہے۔ دھن سنگھ نے سوچ کر کہا۔ "پیچھے گاؤں میں رشتے میں ملنا تھا۔ موٹر سے اُتر گئے تھے۔"

"ہوں!" سپاہی نے بے اعتباری کے ساتھ پوچھا۔ "یہ عورت کون ہے؟"

سوما دھن سنگھ کی اوٹ میں کھڑی تھی جمعدار نے دھن سنگھ کو بانہہ سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ سوما پر لالٹین کی روشنی پڑنے پر اسے غور سے دیکھا۔ آنکھوں پر روشنی پڑنے سے سوما نے اس طرف پیٹھ کر لی اور ماتھے کا آنچل نیچے کر لیا۔ سپاہی نے دھن سنگھ کو پھر ایک بار سر سے پاؤں تک دیکھا اور اُس کے کوٹ پاجامے کی طرف غور سے دیکھ کر سوال دہرایا۔ "تو بڑا جنٹل مین ہے۔ کیا کرتا ہے۔؟"

"دھرم شالہ میں نوکر ہوں۔"

"نوکر؟" "کیسے نوکر ہو بھائی؟"

"ایسے ہی حضور۔ ایک پنجابی بابو کے یہاں چاکری کرتا ہوں۔"

"یہ کون ہے؟"

"اپنی دھرم والی ہے حضور۔"

"یہاں رات کہاں کاٹو گے؟ کوئی رشتہ دار بھی ہے؟"

"جی نہیں۔ کہیں دوکان میں، سرائے میں کہیں پڑ رہیں گے حضور۔"

"ایسی بات ہے تو آؤ۔ ہمارے ساتھ ہی آؤ۔ تھانے میں آرام کی جگہ مل جائے گی۔"

"نہیں حضور۔" دھن سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "حضور کی مہربانی ہے۔ یہیں کہیں پڑ رہیں گے۔ غریب آدمی ہیں۔"

"غریب آدمی ہو۔ تھانے میں غریب ہی آدمی جاتے ہیں۔ چلو دونوں۔" سپاہی نے ہاتھ کی چھڑی ہلا کر حکم دیا۔

دھن سنگھ پولس کے اختیارات اور طور سے واقف تھا۔ اس علاقے میں وہ زیادہ نہیں آیا تھا۔ صرف پوس کے مہینے میں آلوؤں کی ڈھلائی میں اس سڑک پر لاری چلائی تھی۔ لیکن پٹھان کوٹ، کانگڑا، کلو، دھرم شالہ اور ہوشیارپور کی لائنوں پر ڈھائی برس ڈرائیور کا کام کر کے وہ پولس کو جان چکا تھا۔ پولس ڈرائیوروں سے ایسے ہی کھیلتی ہے جیسے بلّی اپنے بس میں آئے ہوئے چوہے کو جب چاہے دبوچ لیتی ہے۔ جب چاہے چھوڑ دیتی ہے۔ قانون کیا؟ پولس کی مرضی اور حکم قانون ہے۔ کہنے کو بھلے ہی راج انگریز کا تھا مگر اصل راج پولس کا ہی ہوتا ہے۔

ہوشیارپور کے اڈے پر سپاہیوں کا ہر ڈرائیور سے ایک روپیہ ماہوار بندھا ہوا تھا۔ ایسے ہی پٹھان کوٹ، کانگڑا اور دھرم شالہ میں بھی۔ نہیں تو ہر بات میں چالان۔ اور کمپنی والے اپنی موٹر کا چالان پسند نہیں کرتے۔ کمپنی والے خود بھی سدا پولس کی پوجا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بخشش اور انعام سمجھا جاتا ہے۔ ڈرائیور کو سلامی دینی ہوتی ہے۔ جمعدار کو روپیہ ماہوار دینے سے انکار کا مطلب ہے لاری مہینے میں چار دن چالان میں کھڑی رہے۔ کبھی تیز چلانے کا قصور، کبھی اپنے ہونے کا، کبھی بوجھ زیادہ لادلینے کا۔ بوجھ زیادہ نہ ہو تو بھی اگر سپاہی جانچ کرنے کے لیے کھڑا کر لے تو پورا دن ختم ہو جائے۔ پولس سے بچ کر آدمی جا کہاں سکتا ہے؟ یہاں طاقت یا ہمت کا سوال نہیں۔ ہاتھ چھڑا، دھکا دے کر، مار پیٹ کر کے بھاگ جائے گا تو کتنی دور؟ دس میل،

بیس میل، سو میل ؟ پولس تو اِس سے آگے بھی ہے۔ پولس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ عاجزی اور اپنی کمائی سے ان کی پوجا۔ یونین نے کئی بار کہا کہ پولس کو کوئی ڈرائیور پیسہ نہ دے۔ لیکن دیے بغیر کام کیسے چلے۔ وہ منڈی سے آتے وقت یا منڈی جاتے وقت ہر بار شراب کی تلاشی کے لیے موٹر روک لیں گے۔

دھن سنگھ بے بس ہو کر سپاہی کے ساتھ چلا رہا تھا۔ اور سوما سر جھکائے اُس کے پیچھے تھی۔ سوما کو پولس سے کبھی سروکار نہیں پڑا تھا۔ پھر بھی وہ جانتی تھی کہ سپاہی اور تھانے دار جو چاہے کر سکتے ہیں۔ اُن سے بڑی طاقت کوئی نہیں، بھگوان ہیں، لیکن انھیں کبھی دیکھا نہیں۔ جیسے گائے کو ہانک کر یا رسّی گلے میں باندھ کر بچھڑا خود ہی پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ ویسے ہی سوما دھن سنگھ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

دھن سنگھ کا دل دھڑک رہا تھا۔ لیکن ظاہرًا وہ ہمت [illegible] ہوئے تھا۔ وہ سپاہی کی خوشامد کرتا جا رہا تھا۔ "جمعدار صاحب میری ساس سخت بیمار ہے، اِس لیے میں اپنی عورت کو لینے منڈی گیا تھا۔ میرا پہنچنا بہت ضروری ہے۔ آپ منڈی میں، ہمیر پور میں تحقیقات کر لیجیے گا۔ ہمیں جانے دیجیے۔"

سپاہی نے بھی تسلّی دی۔ "کوئی بات نہیں۔ گھبرانے کی کیا بات ہے! تھانے دار صاحب کے سامنے کہہ دینا۔ ہم تو بھائی نوکر ہیں۔ ہمارے بس میں کیا ہے؟" دوسری راہ نہ دیکھ کر دھن سنگھ نے کہا۔ "جمعدار صاحب آپ مالک ہیں۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ سرکار غریب آدمی کی عزّت مٹی میں مل جائے گی۔" جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر سپاہی کے ہاتھ میں دے دیا۔

جمعدار ہنس دیا۔ "واہ رے بڑا بھولا ہے۔ دس روپے میں عورت بھگا لے جائے گا۔" اس نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔ دھن سنگھ کی جیب میں جو کچھ تھا، اس نے جمعدار کی بھینٹ کر دیا۔ جمعدار نے اُسے دو گالیاں دے کر ڈانٹ دیا۔ "ابے کسے اُلّو بناتا ہے؟"

دھن سنگھ کے دل میں آیا۔ سپاہی کا گلا دبا دے، یا نزدیک کے بڑے پتھروں سے اُس کا سر توڑ دے۔ لیکن اتنا کر لینے پر بھی بچ نہیں سکتا تھا۔ سپاہی ساڑھے تین ہاتھ کا ایک آدمی ہی تو نہ تھا۔ وہ تو سرکار ہے۔ دھن سنگھ نے اپنی ٹوپی اُتار کر سپاہی کے پاؤں پر رکھ دی۔ اُس نے خود کو طاقت اور اختیار کے حوالے کر دیا۔ مگر سپاہی پگھلا نہیں۔

دھن سنگھ اکیلا ہوتا تو اس اندھیرے میں بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن سوما کو کیسے چھوڑ جاتا۔ سپاہی کے ساتھ ساتھ وہ دونوں تھانے کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ دھن سنگھ کو ایسا لگا کہ وہ اور سوما آدمی کے لیے بنی "چوہے دانی" میں جا پھنسے تھے۔ جہاں سے نکل سکنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ اس کے دل نے ایک بار کہا کہ اس پنجرے میں پاؤں نہ رکھے۔ لیکن سوما کے ساتھ جانا ضروری تھا۔ بے عزتی، مارپیٹ اور جیل کے ڈر سے اُس کا دل کانپ رہا تھا۔

تھانے کے چوڑے آنگن کے سامنے برآمدہ تھا۔ برآمدے میں پلنگ پر موٹے تازے داروغہ صاحب بدن پر کمبل ڈالے لیٹے ہوئے ایک بڑا سا نیچا گڑگڑا رہے تھے۔ پلنگ کے نزدیک ایک انگیٹھی میں کوئلے لہک رہے تھے۔ پلنگ کے دونوں طرف دو اسٹولوں پر دو لالٹینیں روشنی پھیلا رہی تھیں۔ ڈیوٹی کا سپاہی داروغہ کی پنڈلیاں سہلا رہا تھا۔

داروغہ نے آرام کے وقت سپاہی کو ایک عورت اور ایک مرد کو لیے تھانے میں آتے دیکھا تو ماتھے پر بل پڑ گئے۔ گلے میں بھری ہوئی گھرگھراتی آواز سے پوچھا۔ "مادر... ہری رام اس وقت کیا بلا پکڑ لایا؟"

ہری رام نے دھن سنگھ اور سوما کو آنگن ہی میں کھڑا کر دیا اور برآمدے سے نیچے ہی کھڑے ہو کر داروغہ صاحب کو سیلوٹ کیا اور پھر پلنگ کے نزدیک جا کر دھیمی آواز میں بولا۔ "حضور، یہ راندھڑ (راج پوت) پٹی (جوان لڑکی) کو بھگائے لیے جا رہا ہے۔"

داروغہ صاحب لیٹے رہے۔ نیچے سے دھیمے دھیمے کئی کش لے کر سست سی آواز میں پوچھا۔ "پٹی ہے کہ کھانکڑ (بے کار گئی گزری عورت)؟"

"حضور، بالکل نئی پٹوری (نئی بیاہی) ہے۔ کہتا ہے میری جناس (بیوی) ہے۔ حضور اس کی ناک میں نہ بلاق ہے نہ کیل۔ ابھی تازہ رانڈ ہوئی لگتی ہے۔ مرد لڑائی پر مرا ہوگا۔ مرد کے مرنے کی خبر سنی اور سالی بھاگ چلی۔" سپاہی کی بات سُن کر دھن سنگھ کے دل کی رفتار تیز ہو گئی۔

داروغہ صاحب کے پاؤں دابنے والے سپاہی نے آنے والوں کی طرف گھوم کر اونچی آواز میں پکارا۔ "یہاں آ جاؤ برآمدے میں۔"

سوما دھن سنگھ کی آڑ میں کھڑی تھی۔ دھن سنگھ برآمدے کی طرف بڑھا تو سوما بھی اُس کے پیچھے پیچھے گئی۔ اور پھر اس کی آڑ میں سر جھکائے کھڑی رہی۔ داروغہ صاحب نے دھن سنگھ کو

مخاطب کیا۔ "یہ عورت کون ہے؟"

"میری گھر والی ہے حضور۔"

"ہوں۔ کون لوگ ہو؟"

"حضور، راج پوت ہوں۔"

"اس کی ناک کا بلاق کہاں گر گیا؟"

"حضور،" دھن سنگھ اٹک کر بولا۔ "حضور ساہ کے یہاں گہنے (گروی) رکھ دیا ہے۔ غریب آدمی ہیں حضور۔"

"اِسے اسے ہی گروی رکھ دیتا۔ دیکھیں۔" داروغہ صاحب نے دھن سنگھ کی طرف کروٹ بدلی۔ سپاہی نفیس نے اسٹول پر سے لالٹین اُٹھالی۔ اُس نے دھن سنگھ کو بانہہ سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ اور لالٹین سوما کے چہرے کے پاس کر دی۔ سوما نے شرم اور حیا سے منہ پھیر کر ماتھے کا آنچل چہرے پر کھینچ لیا۔

"ارے ایسے شرمائے گی تو کیسے چلے گا؟" داروغہ صاحب بولے۔ "دیکھیں تو سہی ہے کون؟" نفیس نے سوما کی پیٹھ پیچھے سے اوڑھنی کھینچ لی۔ سوما نے سر کُھل جانے کی وجہ سے شرم کے مارے منہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور بیٹھ گئی۔ سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ دھن سنگھ اپنے آپ میں نہ رہ سکا۔ اُس نے ایک زبردست گھونسہ نفیس کی گردن پر مار دیا۔ لالٹین نفیس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی اور ٹوٹ گئی۔

ہری رام، نفیس اور جواہر تینوں سپاہی دھن سنگھ پر ٹوٹ پڑے۔ اُسے ڈنڈوں اور جوتوں کی مار سے آنگن میں گرا دیا۔ سوما چیخ مار کر دھن سنگھ کی حفاظت کے لیے آگے بڑھی۔ نفیس نے اُسے گالی دے کر کلائی سے پکڑ کر پیچھے ڈھکیل دیا۔

داروغہ صاحب کے حکم سے دھن سنگھ کی مرمت کر کے اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ برآمدے میں بیٹھی سوما آنچل سے منہ ڈھانکے سسکتی رہی۔ اِس واقعہ سے داروغہ صاحب کی طبیعت جھلا گئی۔ پنجاب سے ان کی بدلی ابھی حال ہی میں اِس علاقے میں ہوئی تھی۔ اِن کے گھر والے ابھی پنجاب ہی میں تھے۔ جب غصّے میں ہوتے تو اِس علاقے کو کوسنے لگتے اور بہت سی پی لیتے۔ اس واقعہ سے اِن کی طبیعت بگڑ گئی۔ غصے میں بولے۔ "ماں ..... نے طبیعت خراب کر دی۔ یہ علاقہ ہی سالا بھین ..... ایسا ہے۔ نرا بیابان۔ نہ کوئی تفریح اور نہ کوئی سوسائٹی!"

سپاہی جواہر نے خوشامد سے ہاں میں ہاں ملائی۔ "حضور، پنجاب کے کیا کہنے! یہ تو بڑا غریب ملک ہے۔"

چھ بجے شام سے تو بھیں ..... یہاں رات ہو جاتی ہے۔ کرے کیا آدمی؟ دن سو کر کاٹو تو رات نہیں کٹتی۔ سالے جواہر، تو یہاں بوتل بھی کیا لایا ہے۔ بھین ...... نرا پانی۔ سالے ٹھیکے دار کو کل پکڑ کر لاؤ۔ پانی ملا کر بیچتا ہے۔"

جواہر نے صفائی دی۔ "حضور کے سامنے ہی مہر توڑ کر ڈاٹ کھولی تھی، حضور ولایتی میں وہ بات کہاں؟ ولایتی والے سالے پانی کے پیسے لیتے ہیں۔ حضور دیسی کھنچی ہوئی کی کیا بات ہے کہ مادر..... کے گھونٹ گلے کے نیچے اُترے اور آدمی غبارہ ہو جائے۔"

کریم نے داروغہ صاحب کے غصّے سے ہمدردی کے انداز میں کہا۔ "جواہر، حضور کے لیے تھوڑی اور ڈال دے نا۔" داروغہ صاحب نے انکار نہ کیا۔ جواہر منشی خانے سے بوتل اُٹھا لایا۔

داروغہ صاحب سوما کی طرف دیکھ کر بولے۔ "ارے اب بس کر! روتی ہی جائے گی؟ ہو گیا رونا، اچھا، تیرے آدمی کو بلا دیں گے۔ مادر..... رونا بند کر۔" اُنھوں نے انگڑائی لے کر ہری رام کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ "ہری رام، تو سمجھا اسے۔ پانی وانی دے۔ منھ دُھلا۔ کچھ کھاتی پیتی ہو تو کھلا پلا دے۔ ذرا اُدھر لے جا کر سمجھا بجھا۔ کب تک روتی رہے گی؟"

ہری رام سوما کو بانہہ سے تھام کر پچکارتا ہوا برآمدے سے پرے لے گیا۔

جواہر نے لالٹین کی روشنی میں داروغہ صاحب کو دکھا کر گلاس میں اُنڈیلی اور اُن کی خواہش کے مطابق پانی ملا کر گلاس اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ داروغہ صاحب نے گھونٹ بھر کر کہا۔ "یہ نیچا بھی تو کم بخت سو گیا ہے۔ اس بھین..... کو بھی ذرا جگا دے۔" وہ پھر اُجاڑ علاقے کو کوسنے لگے۔

کریم داروغہ صاحب کے ضلعے کا ہونے کی وجہ سے منھ لگا تھا۔ خوشامد میں بولا۔ "حضور، سارا علاقہ رانڈوں سے بھر گیا ہے۔ اِس مہینے میں یہ تیسرا کیس ہے۔ حضور پنجاب میں بھی عورت کا کیا اکال ہے؟ جاٹ ایسی ایسی عورتوں کو بھگا کرے جاتے ہیں حضور کہ کوئی بھلا آدمی دیکھے تو منھ پھیر لے۔ لیکن بس یہی ایک عورت ہے کہ کچھ سمجھ میں آتی ہے! یہاں کا آدمی حضور کچھ عجیب ہے۔ جنگ سے نہیں ڈرتا۔ بھیڑ بکری کی طرح بھرتی ہو کر لام پر چلا جاتا ہے۔ لیکن سرکار، ایک گھڑکی سے اُن کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔"

داروغہ صاحب نے ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے اُتار کر کہا۔ "تو نہیں سمجھتا۔ یہاں کا آدمی ڈرپوک نہیں ہے۔ بے وقوف ہے بھین ...... توپ سے نہیں ڈرتا، قانون سے ڈرتا ہے، کیوں کہ قانون کو سمجھتا نہیں۔"

"حضور پٹھان کو دیکھیے سالا کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"یہ دوسری بات ہے۔ اُدھر کا آدمی جرائم پیشہ ہے۔ اُس کی زندگی جرم پر ہے۔ سوکھا علاقہ ہے۔ لوٹ مار، چوری نہ کرے تو کرے کیا؟ یہاں کا آدمی امن چاہتا ہے۔ اِسی لیے بھن .... ڈرتا ہے۔ گُنڈا کبھی نہیں ڈرتا ہے۔"

نفیس نیچا تازہ کر کے لے آیا تھا۔ کش لے کر داروغہ صاحب نے کہا۔ "اب کچھ ٹھیک ہے۔ نفیس جا تو اب آرام کر! آج رونڈ (راؤنڈ) میں کس کی ڈیوٹی ہے؟"

ہری رام نے اپنی طرف دھیان کھینچنے کے لیے سیلوٹ کر کے کہا۔ "حضور۔"

داروغہ نے اُسے جواب دیا۔ "ہوں۔ ٹھہر جا۔"

سپاہی جواہر سنگھ منشی ڈیوٹی پر تھا۔ وہ بھی دیوار کے ساتھ بیٹھ لگائے بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ اُس کی طرف دیکھ کر داروغہ صاحب بولے۔ "کیا آدمی ہیں اِس علاقے کے؟ سورج ڈوبا نہیں کہ جنگلی جانوروں کی طرح ماند میں گھس جانا چاہتے ہیں۔ جاؤ منشی تم بھی جاؤ۔"

"حضور آرام نہیں کریں گے؟" جواہر نے پوچھا۔

"آرام کہاں ہے؟ یہاں بھی پڑے ہیں۔ گھر جا کر بھی پڑے رہنا ہے۔"

ہری رام نے سوما کو منھ دُھلا کر برآمدے کے ایک کونے میں بٹھا دیا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر جھکا کر اینٹوں کے فرش پر نظر جمائے چپ بیٹھی تھی۔ سسکیوں سے اُس کا بدن ہل جاتا تھا۔ اُس کی طرف اشارہ کر کے جواہر نے کہا۔ "حضور، یہ یہیں رہے گی کہ حوالات میں بند کرا آؤں؟ اِن لوگوں کا اندراج کل کی تاریخ میں ہی ہو جائے گا حضور؟"

"ہو جائے گا۔" داروغہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "کریم بیٹھا ہے وہ کر دے گا۔ بالکل ہو جائے گا۔" جواہر سنگھ نے حوالات کی چابیاں اسٹول پر لالٹین کے پاس رکھ دیں۔ اور جُھک کر سلام کر کے چلا گیا۔

اگلے دن داروغہ صاحب دوپہر کے بعد تھانے میں تشریف لے آئے۔ رپٹ لکھوانے کے لیے پانچ سات آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ منشی نے نزدیک آ کر کہا۔ "حضور اس لڑکی کا سسر کبھر

راج پوت مجھیرا گاؤں سے چوکیدار کو ساتھ لے کر رپٹ لکھوانے آیا ہے۔ کل دوپہر سے اُس کی بیوہ بہو لا پتہ ہے۔"

"کیا کہتا ہے ؟" داروغہ نے سوال کیا۔

"حضور - میں نے کہا۔ کچھ خرچ کرو تو سپاہیوں کو تحقیقات کے لیے دوڑائیں۔ میں نے پوچھا۔ کس پر شک ہے تو کہتا ہے ، زیور لے کر بھاگی ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے لڑکے سرکار میں نوکر ہیں۔ بس دو روپے دکھا رہا ہے۔" داروغہ صاحب نے ہنسنے کے بعد ہنکارا بھرا اور دوسرے کام میں لگ گئے۔

دن بھر انتظار کر کے سورج ڈوبتے وقت کیہر نے پانچ روپے رپٹ لکھوائی دی۔ اُس کا بیان لکھ لیا گیا۔ اسے ہدایت ملی کہ تحقیقات کی جائے گی۔ اور کچھ پتہ لگنے پر اس کے لیے سمن بھیج دیا جائے گا۔ تیسرے دن سویرے دھن سنگھ اور سوما کے پکڑے جانے کی رپٹ روزنامچے میں لکھی گئی۔

کیہر سنگھ پانچ دن کے بعد تھانے سے سمن پا کر بیج ناتھ کی تحصیل میں حاضر ہوا۔ دھن سنگھ اور سوما کو تحصیل دار صاحب کے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ دھن سنگھ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ دھن سنگھ کو دیکھ کر سوما رو پڑی۔ اور سوما کو دیکھ کر دھن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دھن سنگھ نے سات دن سے حجامت نہیں بنائی تھی۔ داڑھی بڑھ گئی تھی۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ جیسے بیمار جنگلی چوہا ہو۔ سوما ایسی دُبلی اور پیلی ہو گئی تھی جیسے لمبے فاقے اور بخار کے بعد اُٹھی ہو۔ مدعی کیہر سنگھ نے اُسے پہچان لیا۔ کیہر سنگھ کی پیروی کے لیے ایک مختار صاحب بڑی سی پگڑی باندھے، آنکھوں میں کاجل لگائے، اور بند گلے کا کوٹ پہنے حاضر تھے۔

کیہر سنگھ نے بیان دیا کہ اُس کی بہو گھر کا زیور لے کر بھاگی تھی۔ بہو کو اُس نے چھ سو روپے میں خریدا تھا۔ گواہی کے لیے ساہ موجود تھا۔ اُسے ایک روپیہ سفر کا اور خوراک کا خرچ دے کر طلب کیا گیا تھا۔

کیہر کا دعویٰ تھا کہ مجرم نے اُس کی بہو کو بھگا کر اُس کی عزّت بگاڑ دی۔ اِسے برادری میں شامل ہونے کے لیے پانچ سو روپے خرچ کر کے جگ کرنا ہو گا۔ عدالت اسے مجرم سے ہرجانہ دلوائے۔ سوما کو وہ گھر واپس لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کا ایمان بگڑ چکا تھا۔

پولس کو سوما پر رحم آگیا تھا۔ انھوں نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ دھن سنگھ کو بچانا چاہتی ہے تو بیان دے دے کہ سسر کے گھر میں اُس پر مار پڑتی تھی اور کھانا نہیں ملتا تھا۔ پچھلی رات ساس سسر نے اسے منڈی لے جاکر بیچ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اِس ڈر سے جب وہ صبح کے وقت باوڑی سے پانی لینے کے لیے گئی تو بھاگ نکلی۔ دھن سنگھ اسے سڑک پر مل گیا تھا۔ اُس نے دھن سنگھ سے منڈی کا راستہ پوچھا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ منڈی چلی گئی۔ اُس نے دھن سنگھ کو اپنے سسر کے گھر کی مصیبت بتائی تو دھن سنگھ نے ہمدردی سے کہا "میرے گھر چلی چل، وہاں بڑی بوڑھی عورتیں بھی ہیں، تو انھیں کے پاس رہنا۔ ایک رات دونوں منڈی کی سرائے میں رہے تھے۔ پھر بیچ نا تھ آگئے تھے۔ پولس کے سپاہی نے دونوں کو دیکھا اور تھانے میں لے گیا۔ وہ سسر کے ساتھ نہیں جائے گی چاہے کاٹ کر اُس کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔

دھن سنگھ اور سوما کو گرفتار کرنے والے سپاہی ہری رام نے بیان دیا۔ "تھانے میں اطلاع تھی کہ مچھیرا گاؤں سے ایک راج پوت کی بیوہ بہو بھاگی ہے۔ اِس لیے میں اپنی ڈیوٹی پر بہت چوکس تھا۔ رات ہو جانے پر میں نے مجرم کو ایک عورت کے ساتھ آتے دیکھا۔ عورت کی ناک میں گنیا نہ ہونے کی وجہ سے مجھے خیال ہوا کہ وہ بیوہ ہے۔ مجرم سے میں نے عورت کے بارے میں سوال کیا۔ جب اُس نے بیوہ کو گھر والی بتایا تو مجھے شک ہو گیا اور میں دونوں کو تھانے لے آیا۔ بعد میں راج پوت کیہر سنگھ کو اطلاع دی گئی، اور اُس نے اپنی بہو کو پہچان لیا۔ گرفتاری کے وقت مجرم یا عورت کے پاس کوئی رقم یا گہنا نہیں پایا گیا۔ مجرم کی جیب میں متفرق خوردہ سکّے ملا کر دو روپے نو آنے تھے، جو جمع کر دیے گئے۔"

عدالت کے سامنے سوما کے بیان میں منڈی جانے کی بات سُن کر دھن سنگھ سمجھ گیا کہ یہ پولس کی سکھائی ہوئی بات تھی۔ سپاہی ہری رام نے حوالات میں اسے بھی ایسا بیان دینے کے لیے کہا تھا۔ اور سمجھایا تھا کہ وہ ایسا بیان دینے سے ہی چھوٹ سکتا ہے، نہیں تو سات برس کی سزا ہو جائے گی۔

سوما کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ دھن سنگھ بیوہ کو اُس کے گھر سے بہکا کر لایا تھا۔ پھر بھی عدالت کے سامنے اِس بات کا کافی ثبوت تھا کہ مجرم نے راہ چلتی عورت کو بہکایا تھا۔ بھاگنے والی عورت کی اطلاع اُس نے منڈی کے تھانے میں نہیں دی بلکہ چوری سے اُسے بھگائے لیے جا رہا تھا۔ خاص کر تھانے میں اپنا غلط حلیہ دینے سے اُس کی بدنیتی کا ثبوت ملتا تھا۔ عدالت نے رحم کر کے اُسے صرف چھ مہینے کی سزا دے دی۔

عدالت کے سامنے مسئلہ تھا کہ کم عمر بیوہ کو کس کے حوالے کرے؟ چاہے ہنسیے سے اُس کا گلا کاٹ دیا جائے وہ میکے نہیں جائے گی۔ جس باپ نے اُسے بیچ دیا تھا اُس کے یہاں نہیں جائے گی۔ نہ وہ سسر کے گھر جانے کو تیار تھی۔ سسر بھی اُس کو گھر لے جانے کو تیار نہ تھا۔ سوما دھن سنگھ کے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی۔ اُس نے رو کر کہا کہ اسے دھن سنگھ کے ساتھ ہی جیل بھیج دیا جائے۔ ناداں عورت قانون نہیں جانتی تھی۔ سزا پائے بغیر کوئی جیل بھیجا نہیں جا سکتا۔ جیل میں مرد اور عورت ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ وہ عدالت کی دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر روتی رہی۔

آریہ سماج کے سکریٹری چودھری نربھے رام کا ضلع بھر میں نام تھا۔ انھوں نے بیسیوں بھٹکائی ہوئی عورت کی حفاظت کی تھی۔ کئی ایک کو اُن کے گھر واپس پہنچایا تھا۔ کئی ایک کو بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑا کر ودھوا آشرم پہنچایا تھا۔ کئی بیواؤں کی شادی ویدک ریتی سے کرائی تھی۔ عدالت نے چودھری نربھے رام کو بلوا کر سوما کا انتظام کر دینے کے لیے کہا۔

سوما سمجھ نہ سکی کہ عدالت کا انصاف کیا ہے۔ جس آدمی کے ساتھ وہ جانا اور رہنا چاہتی تھی، عدالت اور لوگ اُس کے ساتھ جانے سے روکتے تھے۔ جسے وہ جانتی بوجھتی نہیں تھی، اُس کے ساتھ جانے کے لیے اُسے مجبور کیا جا رہا تھا۔ سوما نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اور گہرا سانس لے کر سمجھ لیا، جو کچھ وہ چاہتی ہے، نہیں ہو سکتا۔ اِس سے پہلے اُس کے لیے چاہنے کا کوئی موقع ہی نہیں آیا تھا اور نہ اُس نے چاہنے کی جرأت ہی کی تھی۔ لیکن حالات نے اسے چاہنے چُننے کے لیے مجبور کر دیا، تو اُس نے جو چاہا یا چنا ہے، وہی کرے گی۔ چاہے جو ہو اُسے عدالت، پولس، چودھری نربھے رام سب پر شک تھا کہ لوگوں نے مل کر اسے بیچ ڈالا ہے۔ وہ دھن سنگھ کو چھوڑ کر چودھری جی کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہ تھی۔ مگر جب پولس کے سپاہی دھن سنگھ کو باندھ کر موٹر میں بٹھا کر دھرم شالہ لے گئے اور وہ روتی پیٹتی سڑک پر کھڑی رہ گئی تو چودھری کے ساتھ چلے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

چودھری نربھے رام نے سوما کے سر پر ہاتھ رکھ کر پچکارا اور بیٹی بنا کر ساتھ لے گئے۔ وہ سوما کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھتے تو دلاسا دیتے، بیٹی ایسے کیوں روتی ہے؟ چھ مہینے کی ہی تو بات ہے۔ چھ مہینے چھ دن میں کٹ جاتے ہیں۔ دھن سنگھ کہیں دور تھوڑے ہی جا رہا ہے۔ یہاں دھرم سالہ میں رہے گا۔ چھ مہینے کے بعد آ جائے گا۔ جب سوما کو چپ دیکھتے تو سمجھانے لگتے۔ ایسے زندگی خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ مردوں کے پیچھے بھاگنا بھلے گھر کی لڑکیوں کا کام نہیں ہوتا۔ ہم کسی اچھے سے بے

آدمی سے تیرا بیاہ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے پنجاب کے ایک اسکول ماسٹر کا ذکر کیا۔ جس کی پہلی بیوی دو بچے چھوڑ کر مر چکی تھی۔ سوما اِس تجویز پر رونے لگی۔ تو انھوں نے دو ڈھائی سو پانے والے کسی اسٹیشن ماسٹر کی بات کی، جس کے پاس کافی جائداد بھی تھی۔ انھوں نے سوما کو سمجھایا۔ پنجاب کے لوگ پہاڑ کے لوگوں کی طرح تنگ نظر نہیں ہیں۔ یہاں شریف اور امیر بیواؤں کا بھی بیاہ ہوتا ہے۔ سوما رونے لگی اور بولی۔ "بیوہ کا بیاہ کبھی سُنا ہی نہیں۔" جو بات اُس کی برادری میں نہیں ہوئی، کیسے کرے؟

چودھری نر بھے رام نے سوما کے ٹھہرنے کا انتظام کانگڑے کے ایک دوسرے آریہ سماجی شریف آدمی لالہ گوپی چند صراف کے یہاں کر دیا تھا۔ لالہ جی نے بھی سوما کو پہلی غلطی بھلا کر بیاہ کرکے دھرم کے ساتھ رہنے کی نصیحت کی۔ انھیں اُمید تھی کہ لڑکی کچھ دن میں راہ پر آجائے گی۔ لیکن ان کے گھر کی عورتوں نے سوما کا گھر میں رہنا مشکل کر دیا۔ وہ ایسی ذلیل عورت کو پانی کا گھڑا یا دوسری چیز چھونے نہیں دیتی تھیں۔

لالہ جی نے گھر کی عورتوں کو سمجھایا۔ جو ہو یہ لڑکی ہندو ہے۔ اسے گھر میں نہیں رکھیں گے تو وہ مسلمان کے ہاتھ پڑ جائے گی۔ دھرم سے جائے گی اور ذات سے بھی۔ لیکن ان کے گھر کی بوڑھی عورتوں کو دوسری ہندو عورتوں کی ذات یا دھرم کے مقابلے میں اپنے 'سورگ' یا ثواب کی زیادہ فکر تھی۔ انھوں نے سوما کو اپنے گھر میں رہنے بھی نہ دیا۔

چودھری نر بھے رام نے سوچا دھرم شالہ ضلع کی خاص جگہ ہونے اور وہاں پڑھے لکھے پنجابیوں کی آبادی ہونے کی وجہ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ہمدرد لوگوں کی جگہ تھی۔ سوما کے لیے دھرم شالہ میں کسی بھلے آدمی کے یہاں کچھ وقت کے لیے انتظام ہو جائے۔ پھر یا تو اِس کا بیاہ کرا دیں گے یا پنجاب کے کسی ودھوا آشرم میں بھیج دیا جائے گا۔ چودھری صاحب، لالہ گوپی چند اور دوسرے ہندو سماج سیوک سوما کے مسلمانوں یا عیسائیوں کے ہاتھ پڑ جانے کی فکر سے پریشان تھے۔ لیکن کوئی ہندو بھاگی ہوئی عورت کو اپنے گھر میں جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر ایک نیک دل وکیل صاحب کے یہاں جہاں چھوت چھات کی پریشانی نہ تھی، اسے رکھا گیا۔

پاس پڑوس کی عورتیں سوما کو دیکھنے کے لیے بے چین سی اکٹھی ہونے لگیں۔ وہ ایک دوسری کو سُنا کر، ڈر اور دہشت سے ہاتھ پھیلا کر کہتیں: "ہائے میں مر گئی۔ کیسی دلیر عورت ہے۔ اپنی مرضی سے مرد کے ساتھ جانے کو کہتی ہے؟" کوئی شرم سے ناک پر ہاتھ رکھ کر کہتی: "مر جائے ایسی

بے حیا! یہ بھی کیا عورت ہے"۔ کچھ جیل جانے والے مرد کی عورت کو دیکھنے کے لیے آجاتیں۔ وکیل صاحب ایک ہی مہینے میں تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ سے گھبرا گئے۔ انھوں نے کہہ دیا۔ وہ بھی گھربار اور بال بچے والے آدمی ہیں۔ اُن کے لیے بھاگی ہوئی عورت کا ساتھ اچھا نہیں۔

دھن سنگھ کے جیل سے چھُوٹنے میں چار مہینے اور تھے۔ سوما دو مہینے تک اُپدیش پا کر بھی دھن سنگھ کو چھوڑنے اور بیاہ کر کے بھلی عورت بننے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ سماج کی بھلائی چاہنے والے اور نیک چلنی کے لیے فکرمند رہنے والوں نے سوچا، بدمعاش ڈرائیور دھن سنگھ کے چھُوٹتے ہی یہ عورت پھر اُس کے ساتھ چلی جائے گی۔ مفت میں واویلا ہوگا۔ مناسب یہی ہوگا کہ اس سے پہلے ہی پنجاب کے کسی ودھوا آشرم میں بھیج دیا جائے۔ سوال یہ تھا کہ پنجاب جانے والا کوئی ایسا بھروسے کا آدمی ہو جو سوما کو کسی محفوظ آشرم میں پہنچا دے۔

چودھری جی دھرم شالہ میں کوتوالی بازار کے موٹر کے اڈّے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ان کی نظر کامریڈ بھوشن پر پڑی۔ اُسے مخاطب کر کے چودھری نے پوچھا۔ "کیا نیچے (پنجاب) جا رہے ہو؟۔"

اپنے باپ کے دوست اور معزز چودھری جی کو دیکھ کر کامریڈ نے نہ تو اپنے ہاتھ کا سگریٹ پھینکا اور نہ کانگڑہ کے رواج کے مطابق اُن کے پاؤں چھُونے کے لیے جھُکنے کی تکلیف اُٹھائی۔ بس ایسے ہی پوچھ لیا۔ "کہیے چاچا جی۔ کیا کچھ کام ہے؟۔"

بھوشن کے رُوکھے سلوک کے باوجود چودھری جی اُس کو بھروسے کے لائق آدمی سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بھوشن کا میل جول پنجاب آنے جانے والوں سے رہتا تھا۔ انھوں نے بھوشن کو سوما کی ساری کہانی سنائی۔ اور اُسے کسی طرح لاہور یا فیروزآباد پہنچا دینے کا انتظام کرنے کو کہا۔

"وہ کہاں جانا چاہتی ہے؟" بھوشن نے پوچھا۔

"وہ کہاں جانا چاہتی ہے!" چودھری جی پریشانی سے بولے۔ "وہ اسی بدمعاش کے پاس جانا چاہتی ہے۔ وہ چار مہینے بعد جیل سے چھُوٹے گا۔ اُس سے پہلے ہی یہاں سے چلی جائے تو کلیان ہے۔ یہاں اُسے رکھیں بھی تو کہاں؟"

"تو جانے دیجیے نا اُسی کے پاس!" کامریڈ کو ایسی بے شرمی کی بات کہتے ہوئے بھی جھجک نہ ہوئی۔ چودھری جی نے دُکھی ہو کر کہا۔ "تم لوگوں کا وقت آیا ہے تو یہی ہوا کرے گا۔ لیکن ہم لوگ

تو ایسی بد چلنی نہیں دیکھ سکتے۔ یہاں اسے چار مہینے رکھے گا کون ؟ کوئی بھلا آدمی ایسی سرکش عورت کو اپنے گھر کی عورتوں میں کیسے رکھ سکتا ہے !"

چودھری جی کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر بھوشن نے زور دے کر کہا۔ "چاچا جی ، جو مرد عورت ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں ، انھیں زبردستی دور رکھیے گا تو وہ ملنے کی کوشش میں بدمعاش بن ہی جائیں گے۔ اُنھیں ایک ساتھ رہنے دیجیے گا تو بدمعاشی ختم ہو جائے گی۔ آخر اسے کسی مرد کے حوالے کیجیے گا ہی ! جسے وہ چاہتی ہے وہی کیا بُرا ہے ؟"

"ارے بھائی بیاہ بھی تو کوئی چیز ہے۔" چودھری جی نے اپنی چھڑی کا سہارا لے کر سمجھایا۔ آخر کار ہمارے رشیوں اور شاستروں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی تو یہ سب سلسلہ بنایا تھا !"

اسی سے بیاہ کرے گی۔" کامریڈ نے بات کاٹ دی اور پوچھا۔ "اُس وقت تک اُس کے ٹھہرنے کا انتظام کر دوں ؟"

چودھری جی کے چہرے پر شک اور حیرت کا رنگ دیکھ کر کامریڈ نے کہا۔ "لالہ جوالا سہائے کی کوٹھی پر انتظام کر دوں گا۔ وہ تو معزز بزرگ ہیں۔ اُن پر تو بھروسہ کیجیے گا ؟"

شریف طبقہ

لالہ جوالا سہائے سرولا دھرم شالہ میں رہنے والے پنجابیوں میں چوٹی کے آدمی تھے۔ اُن کا ٹھیکہ داری کا کام ضلع بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ جنگل کی لکڑی کے ٹھیکے، پُل اور سڑک بنانے کے ٹھیکے، لڑائی کے دنوں میں دوسرے ملک سے آئے ہوئے جنگی قیدیوں کے کمپ بنانے کے ٹھیکے، وہ سب کام کرتے تھے۔ وہ خود تو متوسط حال کے پنجابی تاجروں کی طرح رہنا پسند کرتے تھے لیکن ان کے بچّوں نے مغربیت اور نیے خیالوں اور زندگی کو اپنا لیا تھا۔ چار بیٹوں کے بعد ایک بیٹی اُن کے گھر پیدا ہوئی تھی، اور وہ بہت لاڈلی تھی۔ منورما لاہور کالج میں پڑھ رہی تھی اور ولایت جانے کا ارمان رکھتی تھی۔

منورما پتلون پہنے، ننگے سر، بڑے کتّے کو چمڑے کے تسمے سے تھامے، ڈنڈا لیے سونی سڑکوں پر سیر کرتی پھرتی تھی۔ دھرم شالے کے پہاڑی لوگ اِس کی کوئی بُرائی نہیں کرتے تھے۔ اپنے ضلعے اور برادری کی کسی لڑکی کو اِس رُوپ میں دیکھ کر شاید پہاڑی لوگ اُس کا سر کاٹنے کے لیے تیار ہو جاتے لیکن منورما کی وہ تعریف کرتے تھے۔ لڑکی کتنی ہمت والی ہے کسی سے نہیں ڈرتی۔ یہ بہت کچھ ویسے ہی تھا، جیسے انگریزی راج میں دوسرے کے بیٹے کو دیش بھگتی کے لیے جیل جاتے یا پھانسی چڑھتے دیکھ کر ہندوستانی اُس کے نام کی جے کار کریں اور خود اپنی اولاد کو ایسا کرتے دیکھ کر بے بسی سے ماتھا پیٹ لیں۔ منورما، منورما کی ماں اور اُس کی بھاوج بازار میں ایک ساتھ نکلتیں تو سماجی تبدیلیوں کی تین پیڑھیاں ایک ساتھ دکھائی دیتی تھیں۔ ماں جی کالے ریشم کا بھاری لہنگا پہنے، سر پر ململ کے دو دو پٹے جوڑ کر اوڑھے اور آدھے بالشت کا گھونگھٹ کھینچے، پاؤں میں سلیپر پہنے چلتی تھیں۔ جوالا سہائے کے بیرسٹر بیٹے کی پتنی ریشمی ساڑی کا آنچل سر پر رکھتی لیکن بغیر گھونگھٹ کے، اور اونچی ایڑی کا جوتا پہنتی۔ لڑکی منورما ننگے سر، گردن پر بھاری جوڑا سنبھالے، ڈھیلی پتلون پہنے اور کندھے پر بٹوا لٹکائے دکھائی دیتی تھی

بھوشن اور منورما کی ملاقات لاہور میں ہو چکی تھی۔ بھوشن کانگڑہ ضلعے کا رہنے والا تھا۔

اور کالج کی تعلیم کے لیے لاہور میں رہتا تھا۔ چار برس پہلے جب منورما کے بیرسٹر بھائی جگدیش سہائے اور بھوشن بی۔ اے میں پڑھتے تھے۔ منورما بھی کالج میں داخل ہو چکی تھی۔ بھوشن اور جگدیش ہم خیال دوست تھے۔ دونوں کمیونسٹ خیالات کا پرچار کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر سے کتابیں لاکر طالب علموں کو پڑھواتے تھے۔ اور کبھی مارکسزم کی تشریح اور تفسیر کے لیے کلاس بھی لگاتے تھے۔ بھائی کی دلچسپی کی وجہ سے منورما بھی ان کلاسوں میں شریک ہوتی تھی۔

جگدیش بی۔ اے کرنے کے بعد ولایت چلا گیا تھا۔ بھوشن لاہور میں ہی ایم۔ اے میں پڑھتا رہا اور اس کا منورما سے ملنا جلنا جاری رہا۔ منورما اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں حصّہ لیتی تھی۔ لالہ جوالا سہائے لڑکی کی اِس سرگرمی کے لیے اُسے تنبیہ بھی کرتے رہتے تھے اور دل ہی دل میں اُس کی ہمّت اور قابلیت پر خوش بھی ہوتے تھے۔

بھوشن نے امتیاز کے ساتھ فلسفہ میں ایم۔ اے پاس کیا اور فوراً ہی بینک میں کلرک کی نوکری بھی کر لی تھی۔ وہ بینک کی نوکری اور کمیونسٹ پارٹی کا کام ساتھ ساتھ کرنے لگا۔ مگر دونوں کام ایک ساتھ چل نہیں پاتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں لڑائی چھڑ گئی۔ انگریز حاکموں نے ہندوستان کو بھی جنگ میں گھسیٹ لیا۔ سیاسی حالات کو جاننے والے ہندوستانی انگریز حکومت کے اِس فیصلے کی مخالفت کر رہے تھے۔ بھوشن کو بینک کے کام کے مقابلے میں، ہندوستان کا لڑائی میں گھسیٹے جانے کی مخالفت زیادہ ضروری معلوم ہوئی۔ وہ نوکری چھوڑ کر سیاسی کام میں لگ گیا۔

کانگڑے کے دیہات میں رہنے والے بھوشن کے ماں باپ لڑکے کو لاہور میں پڑھا کر امید کرتے تھے کہ پڑھائی ختم کر کے لڑکا بہت بڑا افسر بن جائے گا۔ لڑکے نے سولہ برس تک پڑھنے کے بعد بینک میں پچھتّر روپے کی نوکری پائی تو اُن کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لڑکے نے یہ نوکری بھی چھوڑ دی تو ماں باپ نے اُسے بالکل نکمّا اور آوارہ سمجھ لیا۔ سرکار کی نوکری اور خدمت گر کے ہی لوگ بڑے بنتے تھے۔ اُس کی مخالفت کرنے کا انجام اور کیا ہوتا؟

متوسط طبقے کے بال بچّوں والے شہریوں پر ذریعۂ معاش اور خاندان کے نباہ کی سینکڑوں ذمّہ داریاں رہتی ہیں۔ بھوشن اور اُس کے ساتھیوں کو دیس کی آزادی اور جنگ کی مخالفت میں تحریک چلانے کے لیے صرف طالب علموں کی جماعت مل سکتی تھی۔ اِس سلسلے میں وہ منورما سے ملنے کے لیے سر ولا صاحب کے بنگلے پر جایا کرتا۔ منورما جنگ کی مخالف جدوجہد میں زیادہ حصّہ نہ

لے سکنے پر بھی بھوشن کی بہت عزت اور اُس پر اعتماد کرتی تھی۔

جگدیش سہائے سرولا انگلینڈ سے بیرسٹر بن کر لوٹ آئے تھے۔ بھوشن کو اُن کی واپسی سے ایک سرگرم ساتھی کا تعاون ملنے کی اُمید تھی۔ لیکن اب بیرسٹر کو لاہور کی بیمار کر ڈالنے والی سڑکوں کی دُھول پھانکنا اور غیر مہذب بھیڑ سے کندھے رگڑنا پسند نہ تھا۔ انگلینڈ میں رہتے وقت جگدیش سرولا نے زندگی کے جو نئے پہلو اور ذہنی سکون حاصل کیے تھے، اُن کا اثر گہرا پڑا تھا۔ اُن کے خیالات اشتراکی اصولوں اور فلسفوں کی بھول بھلیّوں میں کم ہو گئے تھے۔ وہ عام لوگوں کے لیے کام کرنے کے بدلے ٹراٹسکی اور لینن کے خیالات کا موازنہ کرنے میں زیادہ دل چسپی پاتا تھا۔ وہ دونوں کے پروگرام اور دلیلوں کا موازنہ کرتا تھا۔ یہ بحث ہی اُس کے لیے کافی تھی۔

جگدیش سمجھنے لگا تھا کہ کمیونسٹوں کے پروگرام میں خیالات کی آزادی کی جگہ ادّعائیت DOGMATISM نے لے لی ہے۔ اِن کے طریقِ کار میں تجزیے کی کمی اسے بہت اکھرتی تھی۔ اسے اس کا رنج تھا کہ اِس ملک کے کمیونسٹ اِس کے گہرے مطالعے کی قدر نہیں کرتے تھے۔ وہ منورما کو تحریک سے ہمدردی ظاہر کرنے یا اس میں حصّہ لینے سے بظاہر روکتا نہیں تھا۔ لیکن اپنی رائے دیتا رہتا تھا... "کیا ہے، ناسمجھی ہے۔ صلاحیتوں کو ضائع کرنا ہے......"

جگدیش کے رنگ ڈھنگ میں تبدیلی دیکھ بھوشن نے اُس کے یہاں جانا بہت کم کر دیا تھا۔ جو کچھ میل ملاپ باقی تھا، وہ خیالات کی یگانگت کی وجہ سے نہیں، بلکہ پُرانی دوستی کی وجہ سے۔ وہ دوستی بھی بیرسٹر سرولا کی تہذیب اور بھوشن کے لیے نیک خواہشوں کے باوجود پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ بھوشن کے لیے اِن باتوں کی زیادہ قیمت نہ تھی۔ اُس کے پاس اِن باتوں کا لطف لینے کے لیے وقت نہ تھا۔ بھوشن سے ملاقات ہونے پر منورما اسے نہ آنے کے طعنے دیتی۔ بھوشن جاتا بھی تو جگدیش سے بحث کرنے میں جوش نہیں دکھاتا۔ سر ہلا کر ہوں ہوں کرتا رہتا۔ اور سگریٹ پیے بغیر ہی ایش ٹرے میں ڈالتا رہتا۔ بحث میں منورما کی ہمدردی بھائی کے مقابلے میں بھوشن کے ساتھ رہتی تھی۔ بیرسٹر کو یقین تھا کہ منورما کی اس ہمدردی کی وجہ اصل بحث سے زیادہ بھوشن کے لیے عزت تھی۔

یہ تو ممکن نہ تھا کہ اکیس برس کی کنواری لڑکی کے گھر میں رہتے اس کے بیاہ کی فکر نہ کی جاتی۔ لیکن منورما کو ایم اے تک پڑھا کر اور اتنی عمر تک آزاد رہنے دینے کے بعد اب اس کا بیاہ صرف اپنے فیصلے سے کر دینے کا اختیار ماں باپ کھو چکے تھے۔ اب صرف فکر کرتے رہنا اُن کے ہاتھ کی بات

رہ گئی تھی۔

جگدیش ولایت چلا گیا تھا۔ بھوشن ایم۔ اے میں پڑھ رہا تھا اور منورما ایف۔ اے میں تھی۔ بھوشن نے بڑی قابلیت سے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ اتنی ہی قابلیت سے ایم۔ اے کر کے کسی کالج میں لیکچرر کی جگہ حاصل کرے گا۔ پروفیسر کی زندگی میں دولت نہ سہی، عزت اور آرام تو ہے۔ آدمی صحیح زینے پر قدم رکھنے سے یقینی طور پر افلاس کی باڑھ سے محفوظ جگہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اِس اُمید کی اُمنگ میں بھوشن نے جھجکتے جھجکتے اپنی محبت، الفاظ، نظر اور طور طریقے سے منورما پر ظاہر کی تھی۔ بچپن سے انگریزی اسکول میں تعلیم پائی ہوئی منورما دوستی کے اظہار سے نہ گھبراتی تھی اور نہ فوراً ہی اس میں بہہ گئی تھی۔

بھوشن کو ایم۔ اے کرنے کے بعد بینک میں پچھتر روپے کی نوکری کرنی پڑی تو اُس کے خیالوں اور طور طریقے میں فرق آ گیا۔ وہ خود ہی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس کے لیے لوٹ کھسوٹ کے خلاف جد وجہد اور اشتراکیت، وسیع القلبی اور ذہنی تعیش کا ذریعہ نہیں تھا۔ اُس کی زندگی کو ناکام بنا دینے والے حالات کے خلاف اجتماعی جد وجہد کے علاوہ اس کے لیے سب کچھ بے کار تھا۔ بھوشن خوددار تھا اور حسد سے نفرت کرتا تھا، لیکن وہ جگدیش سے اپنا موازنہ کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ ساری بے انصافیوں کی بنیاد کیا ہے؟ سماج میں موقع کا فرق۔ اُس نے زندگی کی خوش آیند تمنّاؤں کو ترک کر دیا تھا اور منورما سے دوستی کی امید بھی۔

بھوشن بہت دنوں تک نہ آیا تو منورما کو احساس ہوا۔ اسے شک ہوا کہ کیا بھوشن جیسا آدمی بھی دغا دے سکتا ہے؟ نرملا اور سیتا اِن دنوں فیڈریشن میں بہت حصّہ لے رہی تھیں۔ منورما نے سوچا، کیا بھوشن پر بھی ایسا شک کیا جائے؟ اِس میں اسے اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ دن منورما نے ضبط کیا۔ اور پھر طے کیا کہ بات صاف ہو جانا ہی بہتر ہے۔ کچھ دن انتظار کے بعد بھوشن سڑک پر ملا۔ منورما نے گاڑی رکوا لی اور پوچھ لیا۔ "آپ کہاں رہتے ہیں؟" الفاظ تو اتنے ہی تھے مگر اس کی نظروں نے بہت کچھ کہہ دیا۔

منورما بھوشن کو گاڑی میں اپنی کوٹھی پر لے آئی۔ بھوشن نے منورما سے کوئی دو ٹک وعدہ نہیں کیا تھا لیکن اپنی خودداری کے باوجود اپنی پچھلی محبت سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ منورما نے جو خاموش الزام اس پر لگایا تھا اُس کی صفائی دینا ضروری تھا۔ بھوشن نے جیسے

اشارے سے محبت کا اظہار کیا تھا، اسی کے مطابق صفائی بھی دی۔

"...... اصول کے مقابلے میں شخصی ہمدردی زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ میرے سپنے ٹوٹ چکے ہیں۔ اپنے وہم اور غلطی کو سچ ثابت کرنے کے لیے اور بڑی بھول کے مقابلے میں بھول کو بھول سمجھ کر اسے ختم کر دینا ٹھیک ہے۔ میری حیثیت کے لوگ جیسے بھی ہو گزارہ کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ سماج کی موجودہ حالت میں، اپنے اور اپنے جیسے لوگوں کے لیے میں کوئی جگہ نہیں پاتا۔ کچلے جانے پر بھی زندہ رہنے میں کوئی سکون نہیں سمجھتا۔ مجھے زندہ رہنے کا موقع نہ دینے والے نظام سے میں ساری زندگی لڑوں گا۔ تم سمجھتی ہو میری قسمت چھہتّر روپے ماہوار ہے۔" وہ انگریزی میں بول رہا تھا۔ اور اُس کی آنکھیں چمک بھی رہی تھیں اور کچھ بھیگی سی اور گلابی بھی ہو رہی تھیں۔ "چھہتّر روپے ماہوار میں زندگی کیا ہو سکتی ہے؟ میں اپنے آپ کو دھوکا دینا نہیں چاہتا اور نہ کسی دوسرے کو۔"

منورما بھوشن کی بات کو حالات سے مجبور محبت کی ایمان داری نہیں تو اور کیا سمجھتی؟

منورما اور بھوشن بات کر رہے تھے تو سورج ڈوب چکا تھا۔ وہ کوٹھی کے سامنے لان میں بیٹھے تھے۔ بیرسٹر سرولا بھوشن کو دیکھ کر اِدھر آ گئے۔ پیٹھ کی طرف ہونے کی وجہ سے منورما اور بھوشن اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

"معاف کرنا، میں آ سکتا ہوں؟" آواز سُن کر اِن دونوں نے ہونٹوں میں سگار دبائے بیرسٹر کو دیکھا۔

"ہاں ہاں ضرور۔" بھوشن نے کہا۔ بیرسٹر کے آ جانے سے ہچکچے بغیر وہ کہتا چلا گیا۔ "اصل میں یہ جھگڑا طبقوں کا ہے۔ میں غریب طبقے سے ہوں، جس کا کوئی وسیلہ نہیں۔ اِس لحاظ سے میں آپ لوگوں کے طبقے کا دشمن ہوں۔"

بیرسٹر مسکرا کر اِن دونوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے سگار کا ایک لمبا کش لے کر چھوڑ دیا۔ بڑھیا تمباکو کی مہک سے بھرے دھوئیں کے مرغولے میں شراب کی میٹھی تیکھی بو بھی تھی۔ سرولا نے انگریزی میں کہا۔ "تمہاری بات کو میں سماجی رُوپ میں مانتا ہوں۔ لیکن ہم تم بھلے آدمی ہیں۔ دھرم یدھ (ایسی لڑائی جس میں مکر و فریب نہ ہو) کے اخلاقی اصول ہم لوگوں میں بنھ سکتے ہیں۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ ہم لوگ مخالف مورچوں میں ہیں۔ اِس کی ذمہ داری ہم پر تم پر نہیں بلکہ سماج پر ہے۔ ہم اپنے اپنے ڈھنگ سے سماج کے نظام سے لڑ سکتے ہیں۔ آپس میں کیوں لڑیں؟ کیوں منّو؟"

منور مانے بھائی کے آجانے سے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ گردن پر جھولتے جوڑے کو ہلا کر مسکراہٹ سے اُس نے جواب دیا۔ "میں جنگ کے لیے ان کی للکار قبول نہیں کرتی ۔۔۔۔"

بیرسٹر نے ایک اور لمبا کش لے کر اپنی بات پر زور دیا۔ "بالکل ٹھیک، یہی نیک دلی ہے۔"

نیک دلی کے اس جملے سے بھوشن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "اِس کوٹھی کے ماحول میں۔" اس نے کوٹھی کی عمارت کی طرف اشارہ کرکے جواب دیا۔ "نیک دلی بنپ سکتی ہے۔" اُس نے کوٹھی کے ایک طرف نوکروں کے لیے بنی کوٹھریوں کی طرف انگلی اُٹھائی۔ "شاید وہاں نہیں بنپ سکے گی۔ وہاں صرف خوف ہے۔ اِس نیک دلی کی جڑ میں کیا ہے؟ سماج میں جو اچھا ہے وہ سب چھین کر تم لوگوں کے شریف طبقے کی تخلیق کر لی گئی ہے۔ جیسے کشمیر یا کلو کے سیبوں کے کسی باغ کے سب درختوں سے پھلوں میں رُوپ، رس اور خوشبو کسی ترکیب سے کھینچ کر دس پانچ گملوں میں پودے سجا لیے گئے ہوں۔ باقی حصّے بے رس ہو کر، سڑ گل کر بد شکل، بے رنگ اور کمزور ہو جائیں۔ شریف طبقے کی خوش حالی گملوں میں سجا ہوا، نیک دلی سے مہکتا ہوا آپ کا طبقہ اپنے آپ میں چاہے کتنا ہی مطمئن ہو لیکن سماج کے لیے وہ ناقابلِ برداشت ظلم ہے"

بیرسٹر نے انگلیوں میں دبے ہوئے سگار سے ایک اور لمبا کش لے کر کہا۔ "دوست تمہاری نیکھی مثال ٹھیک نہیں ہے۔ تم ایک بات بھول رہے ہو۔ یہ شریف طبقہ سماج کی مسلسل ترقی کی لازمی کڑی ہے۔ یہ شریف طبقہ سماج کی تہذیب کا محافظ ہے۔ باغ کے جل جانے پر جو دس یا پانچ نمونے باقی رہیں گے وہی نئے سماج کے لیے قلم اور بیج دیں گے۔"

"نہیں نہیں، ہمیں پورے سماج کو موقع دینا ہے۔" بھوشن نے زور دے کر کہا۔ "دس پانچ گملوں کی تعریف سے پورے باغ کی خراب حالت برداشت نہیں ہو سکتی۔ ہماری تہذیب تمہارے سماج کی تہذیب سے زیادہ ترقی یافتہ ہو گی۔"

بیرسٹر نے زور دے کر کہا۔ "لینن نے یہ بھی کہا ہے کہ آج کے سرمایہ دار طبقے کی تہذیب میں بہت کچھ خوب صورتی ہے، فائدہ ہے۔ وہ سب کچھ مزدوروں کی تہذیب میں شامل رہے گی۔ فی الحال ہم عالمی تہذیب کی امانت کو سنبھالے ہیں۔"

بھوشن نے ٹوک دیا۔ "یہ امانت کی حفاظت نہیں ہے، لُوٹ ہے۔"

بیرسٹر اور بھوشن کی بحث بہت زیادہ سیاسی ہو گئی۔ بیرسٹر بار بار کہہ رہا تھا۔ "تم ہندوستان سے باہر جا کر دیکھو تو سمجھو گے۔ بھارت میں تو ابھی صنعتی دور شروع نہیں ہوا ہے۔ یہاں کا ماحول

ابھی مزدور سماج کی ترقی اور انقلاب پیدا کرنے کے لائق نہیں ہوا ہے۔ یہاں انقلاب صرف بین الاقوامی حالات کے مطابق ہی ہوسکتا ہے۔ انگلینڈ میں اشتراکی انقلاب کے نتیجے کے طور پر بھارت میں انقلاب آسکے گا۔ تم لوگ اس وقت نازی ازم سے لڑنے والی، انگلینڈ کی جمہوری طاقتوں کی مخالفت کر رہے ہو۔ یہ بڑی غلطی ہے۔"

بھوشن نے پھر مخالفت کی۔ "انگریز جمہوریت کے لیے نہیں بلکہ نازی ازم کی سامراجی ہوس کے خلاف اپنے سامراج کی حفاظت کے لیے لڑ رہا ہے۔ اس کا سامراج کیا ہے، ہمارا استحصال۔ ہم اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔"

منورما کے لیے اپنی بات کہنے کا موقع نہ تھا۔ چپ رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد بھوشن چلا گیا۔ منورما نے اپنی کھڑکی سے دیکھا۔ وہ بے بس تھی۔ کھانے کے لیے اُٹھنے کی خواہش نہ رہی۔ انکار کرتی تو سب کے سامنے لمبی چوڑی صفائی دینی پڑتی۔

منورما آدھی رات تک دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے چھت سے نظر لگائے اس مسئلے پر سوچتی رہی۔ یہ جان کر اسے اطمینان ضرور ہوا کہ بھوشن نے اسے کسی 'دوسری' کے مقابلے میں نہیں ٹھکرایا تھا۔ اُس کی توہین نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بھوشن کو اس سے دور کر دینے والی کھائی اُس کے اندازے سے بڑی تھی۔ منورما نے بہت سوچا اور فیصلہ کیا، کہ اُس کی زندگی کا دھارا جس راہ پر بہنا چاہیے تھا، اُس راہ میں بھوشن نے رُکاوٹ ڈالی ہے۔ وہ اس رکاوٹ سے ہار کر، بزدلی سے زندگی کی راہ بدلے گی! وہ اپنی زندگی برباد نہیں کرے گی۔ وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنائے گی۔ وقت آنے پر جو مناسب ہوگا وہی کرے گی۔

منورما نے مایوسی پر قابو پالیا۔ قاعدے کے مطابق پڑھنے اور گھومنے جاتی۔ عام کاموں میں اُس نے حصّہ لینا کم کر دیا تھا۔ بیرسٹر کو وہ آندولن بے وقوفی معلوم ہوتا تھا۔ بیرسٹر سے اختلاف کی وجہ سے بھوشن اس کے یہاں نہیں جاتا تھا۔ منورما سوچتی، جب مجھے بلایا نہیں جاتا۔ میری طبقاتی حیثیت کی وجہ سے مجھ پر اعتبار نہیں کیا جاتا تو کیوں کسی کے پیچھے لگوں!

بھوشن اپنے ضلع میں اپنی پارٹی کی تنظیم کے لیے دھرم شالہ میں رہتا تھا۔ منورما سے ملاقات ہونے پر ایک دوبار اُس کے یہاں گیا تھا۔ کبھی سڑک پر مل جاتے تھے تو ایک دوسرے سے کتراتے نہیں تھے۔ بھوشن کا طرزِ عمل تھا، جو ہوگیا سو ہوگیا۔ اور منورما کا۔ تم جانو!

ایک دن دوپہر بعد بھوشن نے منورما کے سماج کے ظلم کے ثبوت کے طور پر سسکتی ہوئی سوما کو لاکر اُس کے سامنے کھڑا کردیا۔ منورما سماج کے ظلم کا علاج اپنی رواداری سے کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ بھوشن نے دوستی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھانے کے لیے بات صاف کردی۔ "تم ماں جی سے پہلے ہی بات کرلو۔ بعد میں کچھ جھنجھٹ ہو تو کیا فائدہ؟"

منورما نے اپنے بھاری جوڑے کو ہلا کر کہا۔ "پوچھوں گی تو دس باتیں سمجھا کر اعتراض کریں گی۔ ایسے رکھ لوں گی تو منمنا کر رہ جائیں گی۔" ہوا بھی وہی۔

منورما نے سوما کو کوٹھی کے ایک کمرے میں جگہ دے دی تو ماں جی جھنجھلا اُٹھیں۔ "منّو تیری عقل کو کیا ہوگیا ہے؟ نہ کسی سے پوچھتی ہے نہ تاچھتی ہے۔ کسی بدنام اور بے شرم عورت کو گھر میں کیسے رکھ سکتے ہیں! کیا ہمیں دنیا میں نہیں رہنا! تیرے بتا جی سے کہتی ہوں۔"

منّو نے اِس زیادتی کے خلاف منہ پُھلا کر کہا۔ "کیا کرے گی دُنیا؟ کیا بے شرمی کی ہے اُس نے؟ آج کل لڑکیوں سے پوچھے بغیر کون بھلا آدمی اُن کی شادی کرتا ہے؟ دنیا تو ستی پاربتی کو پوجتی ہے۔ کیا کہا تھا پاربتی نے؟ اُس نے بھی ضد کی تھی۔ شیوجی سے ہی بیاہ کروں گی۔ اسی ضد میں جل کر مرگئی۔ یہ لڑکی کیا ناجائز کر رہی ہے؟ یہی نا کہ وہ غریب ہے۔"

ماں جی چپ رہ گئیں۔ لالہ جی اور ماں جی دونوں کو ہی یقین تھا، اُن کی اولاد دُنیا داری میں چاہے جتنی کچی ہو، پڑھی لکھی، عقل مند اور ایمان دار تھی۔ سوما کے دکھ سے مرجھائے بیمار سے چہرے کو دیکھ کر ماں جی کا کلیجہ بھی پسیج گیا۔

سوما کو یہ گھر اور گھر کے لوگ، دوسرا ہی سنسار معلوم ہوا۔ منّو بی بی خود اُس کی عمر کی، اُسی کے جیسے بدن کی عورت تھی۔ لیکن سوما نے ایسی عورت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ منّو اُس کی فکر ویسی ہی کرتی تھی جیسے ماں بیمار بچّوں کی کرتی ہے۔

سوما مچھیرا سے بھاگ آنے کے بعد پولس کے ہاتھ میں پڑ گئی تھی۔ بعد میں کانگڑا اور دھرم شالہ کے سماج میں وہ اپنی حالت کتّوں سے بدتر اور خود ڈری ہوئی بکری کی طرح محسوس کرتی تھی۔ اِس گھر میں وہ دیکھا اور محسوس کیا جس کی اُمید خواب میں بھی نہیں کرسکتی تھی۔ سوما اپنے آپ کو نفرت اور دُکھ کی مستحق سمجھنے لگی تھی۔ وہاں اُسے ہمدردی اور رحم دلی نظر آتی تھی۔ اس کی بدنصیبی وہاں جرم اور نفرت کی چیز نہ تھی۔ اِس گھر میں کسی کو کسی چیز یا پیسے کی بھی فکر نہ تھی۔ سوما کو اِس گھر میں حسد کی بھنک ملی تھی تو نوکروں میں ـــــ جگّو، موہنا اور نوکرانی جیوا میں۔ سوما اس کا اندازہ

آسانی سے کر سکتی تھی۔

سوما کو بچپن ہی سے سخت محنت اور سدا کام کرنے کی عادت تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ نوکروں کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ اِس وجہ سے اِس کے لیے ماں جی کی ہمدردی اور دلچسپی زیادہ بڑھنے لگی۔ اُنھوں نے اسے کچھ پُرانے کپڑے دے دیے تھے۔ منوا سے صاف اور ڈھنگ سے پہننے کے لیے محبّت سے ٹوکا کرتی۔ سوما سوچتی ـــــ امیر لوگ سچ مچ دیوتا ہوتے ہیں۔ غریب کتنے کمینے ہوتے ہیں اسی لیے تو ایشور انھیں دُکھ دیتے ہیں۔

بھوشن نے سوما کو منورما کے یہاں ٹھہرا دیا تھا۔ اپنی پناہ میں آئی ہوئی سوما کی حالت جاننے کے لیے کوٹھی پر جا کر پوچھ تاچھ کر لیتا تھا۔ منورما نے سوما کے مسئلے پر بھوشن سے بات کی۔ وہ مسئلہ ان کی اپنی بات کے لیے پردہ بن گیا۔ باتوں ہی منورما کا جی بھر آیا۔ گھر کے لوگوں کو اپنا اُداس چہرہ اور بھیگی آنکھیں دکھانا اسے پسند نہ تھا۔ اس نے بھوشن سے کہا۔ "چلو ذرا باہر گھومنے چلو۔ وہاں باتیں کریں گے۔"

منورما اور بھوشن مکلوٹ گنج کی چڑھائی پر چڑھتے جا رہے تھے۔ بھوشن بے تعلقی سے بول رہا تھا۔ ایک ایسے الزام کا جواب دے رہا تھا، جس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مانتا تھا کہ اس نے منورما سے محبت کے راستے پر چلنے کی تجویز کی تھی۔ زندگی کے جس نقشے کو لے کر اُس نے اِس راستے کی خواہش کی تھی، وہ سراسر وہم ثابت ہو گیا تھا۔ اور اب منورما اِس سچائی کو ماننا نہیں چاہتی تھی تو وہ کیا کرے؟

"بھوشن نے کہا۔" نیک دلی زندگی کا حسن ہے۔ یہ لڑکی ہماری سماجی زندگی کے حالات اور اُس کے طور طریقے سے الگ چیز نہیں۔ تمہارے خاندان میں اسے اس وجہ سے جگہ مل سکی کہ نہ تو تم کسی کمی سے پریشان ہو، اور نہ کسی کے دو باتیں کہہ دینے سے تمہاری حیثیت کم ہو سکتی ہے۔"

منورما ایک لمبی سانس لے کر چپ رہی۔ اس نے محسوس کیا، بھوشن روز بہ روز خشک اور بے رحم ہوتا جا رہا تھا۔ کمیونزم کی طبقاتی جدوجہد کی گرمی نے اس کے دل کو جھلس دیا تھا۔

بھوشن کہتا گیا۔ تم شرافت اور انصاف کی حمایت کرنے میں فخر محسوس کر سکتی ہو۔ بے اصولوں کے لیے کیا یہ ممکن ہے؟ جو زندگی ظلم اور خوف سے سوکھ رہی ہو اُس میں فیاضی کے پودے کیسے پھولیں؟ ہم لوگ پہلے جینے تو پائیں!۔ بھوشن "ہم لوگ" کہہ کر اپنے آپ کو منورما اور منورما کے شریف طبقے سے الگ کر لیتا تھا۔

منورما گہرا سانس لے کر چپ ہوگئی۔ وہ اپنی اور زیادہ توہین نہیں چاہتی تھی۔

بھوشن بولا۔ "تمہارے جیسی خوب صورتی اور عقل اُس لڑکی میں یا عام لوگوں میں ہو بھی کیسے؟ تمہارا اخلاق اور مروّت تمہارے خاندان میں کئی پیڑھیوں کا نکھار ہے۔ جیسے اچھے گلاب کے پیڑ کو خاص طور سے اچھی حالت میں رکھ کر اُس میں قلم پر قلم پر لگائے جائیں۔ لیکن کیا باقی سماج سوما ہی بنا رہے؟"

"بس ہوگیا، اب رہنے دو"۔ منورما نے بات کاٹ دی۔

بھوشن کی کڑوی باتیں اور اُس کے رُوکھے پن کے باوجود اس کے منھ سے منورما کے بارے میں کچھ ایسے الفاظ نکل جاتے تھے کہ منورما اسے تنہائی میں چھپی دولت کی طرح گنتی اور یاد کرتی تھی۔ "تمہاری عقل مندی، تمہاری شرافت، تمہاری ہمت، تمہارا اخلاق ......" تلخی اور مایوسی کے باوجود منورما کو یقین تھا کہ ایک دن بھوشن کی خود آزادی کی گرمی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔

اگر منورما کے ماں باپ کے سامنے بھوشن کا نام اُن کی بیٹی کے شوہر کی شکل میں آتا تو اسے کبھی منظور نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی نظر میں منورما کے لیے دوسرے بہت سے لڑکے تھے۔ مگر منورما کی نظر میں دوسرے کی شخصیت جچتی ہی نہ تھی۔ مرد تو وہی ہے جس کے سامنے عورت جھک سکے۔ منورما سوچتی، ہائے اگر میں اُس کی ضد پوری کر سکوں! اور تصور میں ایک تصویر گھوم جاتی کہ وہ گرمی کے موسم میں دھرم شالہ کے پہاڑ پر، پھواروں میں بھیگے ماحول میں گرم کپڑے پہن کر اچھی اچھی کتابیں پڑھنے اور ولوٹ کورڈ کی سلیک (پتلون) پہن کر، ایلسشن کتے کی زنجیر تھامے پہاڑی سڑکوں پر گھومنے کے بدلے، وہ بہت معمولی سی ساڑی اور چپل پہنے، بغل میں کاغذوں کا بنڈل دبائے دھوپ میں لاہور کی سڑکوں پر گھوم رہی ہے۔ اُس کے چہرے پر سڑک سے اُڑی ہوئی باریک دُھول جمی ہوئی ہے۔ چہرے پر پسینہ بہنے سے جگہ جگہ پر سے دُھول بہہ کر اُس کا گورا پن ظاہر ہو رہا ہے۔ اسی حال میں وہ پارٹی کے آفس میں جاتی ہے۔ جہاں بہت سے کامریڈ شور مچا کر بحث کر رہے ہیں۔ کہیں کپڑے بدلنے کے لیے بھی تنہائی کی جگہ نہیں ہے۔ لیکن وہ ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی۔ دن بھر کپڑے سے زیادہ ضروری دوسرے کام ہوں گے۔ جیسے نرملا پارٹی کے لیے چندہ مانگنے اُس کے پاس آتی ہے ویسے وہ بھی پارٹی کے کام سے دن بھر گھومے گی۔ جب وہ لوٹے گی تو بھوشن بھی تھیلا لیے لوٹے گا۔ "یو آر ٹائرڈ منو" (تم تھک گئی ہو منو) اور وہ مسکرا کے جواب دے گی۔ "ناٹ ایٹ آل" (نہیں تو)۔ اپنی اس تصویر سے اسے اپنی سرگرمی اور طاقت کا غرور محسوس ہوتا مگر بھوشن تو کبھی اس شرط پر بھی یقین نہیں دلاتا تھا۔

لالہ جی کی کوٹھی میں چار مہینے گزار کر سوما نے نیے تجربے حاصل کیے تھے۔ آسانیوں اور آرام کی زندگی سے سوما کے روپ اور طور طریقے سے دھوپ، پالے اور آندھی میں پلے جنگلی پودے کی سختی اور اکھڑپن دور ہونے لگا تھا۔ اس کی صورت اور نگاہوں سے خوف کا اثر زائل ہونے لگا۔ وہ باغ میں لگائے گئے پودوں کی طرح نازک لگنے لگی تھی۔ اُس کا طور طریقہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ منورما کی دیکھ بھال میں ہر روز نہا کر بدلے ہوئے کپڑے میں وہ دوسری ہی عورت معلوم ہوتی۔ منورما بڑے پیار سے کام کاج کے لیے پریشان نہ ہونے کو کہتی اور تسلّی دیتی رہتی۔ وہ کام میں لگی رہتی تھی۔ منورما سوما کے دکھوں کی گہرائی کو محسوس کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

سوما دلیرانہ محبت کی ہیروئن تھی۔ منورما سوچتی، کیا اُس کی زندگی میں بھی یہی ہونے والا ہے۔ منورما کو سوما کی پریشانیوں میں دُکھ اور قربانی کی مٹھاس محسوس ہوتی تھی۔ سوما کی زندگی کے دردناک ناٹک کو وہ تصور میں اور بھی دردناک شکل دے دیتی تھی۔ اگر اس کا ساتھی کبھی بھی جیل سے نہ چھوٹے، اگر وہ جیل جانے کے بدلے حادثے میں مر گیا ہوتا؟ سوما کیا محبت کی خاطر زندگی بھر ہوگی اور دُکھ لیے بیٹھی رہتی! لیکن یہ کتنی بڑی قربانی ہوتی۔ اگر اسے دو روٹی کی ہی تلاش ہوتی تو اسے یوں بسورنے کی کیا ضرورت تھی؟ اَن پڑھ اور نیم وحشی ہو کر بھی اس میں کردار کی عظمت ہے۔ انسان کا یہ احساس، انصاف اور معقولیت کا ہی تو ہے۔

سوما کے ہچکچانے پر بھی منورما اسے پلنگ یا صوفے پر بٹھا لیتی اور اُس کی آپ بیتی پوچھتی رہتی۔ سوما کو ان باتوں سے ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ وہی باتیں جان کر لوگوں نے اس سے نفرت کی تھی لیکن منورما کا سلوک دوسرا تھا۔ منورما اسے اپنے نزدیک کھینچ کر اور پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی۔ "تمہیں یہ سب باتیں یاد کر کے فخر اور خوشی نہیں ہوتی؟" سوما گھبرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر چپ رہ جاتی۔

منورما نے پوچھا۔ "اگر دھن سنگھ نہ آئے تو کیا تم کسی اور دوسرے آدمی سے بیاہ نہیں کر لوگی؟"

سوما کا سر جھک گیا اور آنسو ٹپک پڑے۔ آنچل سے آنسو پونچھ کر سر ہلا کر اُس نے انکار کر دیا۔

منورما نے اسے سمجھانے کے لیے پوچھا۔ "اگر دھن سنگھ نہ آئے، وہ تمہیں بھول جائے تو بھی تم اُس سے پریم کرتی رہوگی، یہی کتنا بڑا سکھ اور اطمینان ہے۔"

سوما پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ "ہائے میں کہاں رہوں گی۔ کیا کروں گی؟"

منورما سوما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے پلنگ پر آڑی لیٹ گئی، اور چھت پر نظر جمائے سوچتی

رہی۔ پریم سکھ ہے یا دُکھ، سکون ہے یا ہیجان؟ محبوب کو پائے بغیر تو پریم ہیجان ہی ہے۔ ہیجان میں سُکھ کہاں؟ وہ اسی طرح سوچتی رہی۔ سوما کب کی اُٹھ کر چلی گئی، وہ جان نہ سکی۔ منورما سوما سے ایسے پیار کرتی تھی، ایسے اُس کی قیمت لگاتی تھی جیسے اپنی قیمت نہ جاننے والے بھگت، نکرنہ کرنے والے دیوتا کی بھگتی کرتے ہیں۔

کئی دن کے بعد بھوشن پھر سوما کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے آیا۔ منورما نے ان پڑھ لڑکی کی سنجیدگی، اُس کی عقل اور سگھڑپن بیان کر کے ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔ "اگر جیل سے چھوٹنے کے بعد اِس ڈرائیور کا پتہ نہ چلا تو اس لڑکی کا کیا ہوگا؟"

بھوشن نے سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر کہا۔ "اگر وہ آدمی ڈر جائے یا کسی اور وجہ سے واپس نہ جائے تو لڑکی کے لیے مسئلہ واقعی کٹھن بن جائے گا۔ شاید وقت بیتنے پر دل کا رنج کم ہوجائے اور کہیں کوئی دوسرا مناسب آدمی ملنے پر اُس کا بیاہ ہوجانا ہی ٹھیک رہے گا۔ وہ کسی مرد کا گھر چلانے کے علاوہ بناہ کے لیے اور کیا کر سکتی ہے؟"

منورما کو بھوشن کی یہ رُوکھی کاروباری ڈھنگ کی بات اچھی نہ لگی۔ اُس نے کہا۔ "کیوں! تم ایسی بات کیوں سوچتے ہو؟ کیا پریم سچ مچ کچھ بھی نہیں ہے؟ اگر کوئی شخص ایک آدرش کو بناہنا چاہے تو اُسے کیوں گرایا جائے؟"

بھوشن نے پوچھ لیا۔ "وہ کیا آدرش کو پورا کرنے کے لیے گھر سے نکلی تھی؟ گھر میں زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ وہ جینا چاہتی تھی اِس لیے گھر سے نکلی تھی۔ محبت تو زندگی میں مددگار چیز ہے۔ محبت زندگی میں رکاوٹ بن کر چل نہیں سکتی۔"

منورما نے مخالفت کی۔ "ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ آدمی محبت کے لیے زندگی قربان کر دیتے ہیں۔ تمہارے خیال میں وہ سب پاگل پن ہے، بے وقوفی ہے، غیر معمولی اور غیر فطری ہے۔" منورما کے لہجے میں تیکھا پن آگیا جیسے وہ بھوشن سے کسی توہین کا بدلہ لے رہی تھی۔

بھوشن نے اِس تلخی کو برداشت کیا، اُس کی مخالفت نہیں کی، اور نہ اس کی تردید کی۔ بلکہ ضبط کے لہجے میں جواب دیا۔ "سب چیزوں کی طرح زندگی میں محبت کی حالت بھی جسمانی بھوک کی ہے۔ محبت زندگی کی کامیابی اور امداد کے لیے ہوتی ہے۔ اگر محبت بالکل چھچھلی اور تھتھلی رہے تو بے لگام جسمانی بھوک بن جاتی ہے۔ اور اگر زندگی میں محبت یا کشش کا عقل سے میل نہ ہو تو یہ زندگی کے لیے قاتل بھی ہو سکتی ہے۔ پانی کو دیکھتی ہو۔ اِس سے گرمی بالکل نکل جائے تو برف بن جاتا ہے، اِس میں حرکت

ہیں رہتی اور اگر گرمی ایک حد سے زیادہ بڑھ جائے تو وہ بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔"

"اُڑ جاتا ہے تو اُڑ جائے فضول زندگی کا فائدہ بھی کیا ہے؟" اُداس ہو کر منورما نے جواب دیا۔

بھوشن نے سگریٹ جلا لیا۔ "اُڑ ہی جائے تو بھی اک بات ہے۔ جیسے اِس لڑکی کی زندگی! اُس کی دھن سنگھ سے محبت کچھ واقعات کا نتیجہ ہے اور کچھ واقعات کا سبب بھی ہے۔ اگر اُس کا پتی زندہ ہوتا تو شاید محبت ہو ہی نہیں سکتی اور ہوتی تو نہیں اِس سے ہمدردی نہ ہوتی۔ محبت زندگی میں جسم کے تجربے اور ضرورت سے الگ کیا چیز ہے؟"

بھوشن نے کچھ سوچ کر پھر کہا۔ "جدائی کی برداشت سے باہر تکلیف میں جان دے دینا ایک بات ہے لیکن جب محبت روزانہ زندگی میں ناقابلِ برداشت حالت پیدا کرنے لگتی ہے تو وہ زندگی کی راہ میں رُکاوٹ بن کر خود ختم ہو جاتی ہے اور اُس کی جگہ نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک سچا واقعہ سُناؤں؟"

منورما نے ہاں کہا۔

بھوشن سنانے لگا۔ "میرا ایک ملاقاتی ہے۔ ایک لڑکی سے وہ محبت کرتا تھا۔ لڑکی کے ماں باپ اُس سے بیاہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لڑکی نے اس ظلم کے خلاف زہر کھا لیا مگر بچا لی گئی اور بیاہ بھی من پسند لڑکے کے ساتھ ہو گیا۔ چھ برس بیت چکے ہیں۔ لڑکا کچھ بھلا آدمی نہیں ہے۔ اور لڑکی کا اب یہ حال ہے کہ پتی کے ساتھ رہنے کے بدلے کنوئیں میں گر کر مرنے کو تیار ہے۔ لڑکے کا سلوک اتنا بُرا ہے کہ اُس کا نام سن کر لڑکی کو دورہ پڑنے لگتا ہے۔ میں کسی سے چاہے کتنی ہی محبت کروں لیکن اُس شخص سے ہر روز مجھے تکلیف پہنچے تو میرے دل میں اُس کے خلاف نفرت پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر سوما بہت زیادہ تکلیف میں نہ ہوتی اور دھن سنگھ کی ہمدردی اِس ناقابلِ برداشت حالت میں سہارا نہ بنتی تو کیا یہ اُس سے محبت کرتی؟ دھن سنگھ دراصل اِس کی زندگی کا مادّی سہارا ہے۔"

منورما چپ رہ گئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ بھوشن اشارہ کر رہا ہے ہم آپس میں ایک دوسرے کے مددگار نہیں بن سکتے۔ اُس رات بھی اُس نے بہت دیر تک جاگ کر سوچا اور فیصلہ کیا۔ اپنی توہین کیوں کراؤں!

دھرم شالہ کے ضلع جیل سے چھوٹتے وقت دھن سنگھ اتنا ہی شرمندہ، بے سہارا اور بد دل تھا جتنا کہ جیل میں بند ہوتے وقت۔ اُس کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں اور اُس کو بند رکھنے والی دیواروں کے بندھن تو دور ہو گئے تھے لیکن دنیا میں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسے بدمعاش اور سزایافتہ بنا کر، اس سے اعتماد اور عزت کا حق چھین کر اُسے جیل سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ کہاں، کس کے پاس جا سکتا تھا۔ اُس کے لیے جیل سے رہائی ایسی ہی تھی، جیسے ایک چڑیا کے پر توڑ کر بلیوں کے سامنے پنجرے سے باہر پھڑپھڑانے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ دغاباز اور بدمعاش کا داغ پا کر اب نوکری کے لیے پھر کمپنی میں جانا ممکن نہیں تھا۔ یہ قسمت ہی تو تھی۔ جو بے عزتی کے لیے پیدا ہوا ہے عزت کیسے پا جائے! وہ بھی دوسرے گرہستھ لڑکوں کی طرح گھر میں رہتا، کسی گرہستھ لڑکی سے بیاہ اُس کا ہو جاتا۔ اُس نے راج پوت بن کر راج پوتنی سے بیاہ کرنے کی بات سوچی تھی...... بلاقی چاچا تو کہتے ہی تھے عورت کا پھندا بُرا ہوتا ہے۔

دھن سنگھ دغا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر اُس نے دغا کرنے کی بات سوچی ہوتی تو اتنا شرمندہ نہیں ہوتا اور زیادہ چالاکی سے دغا کرنے کی بات سوچتا۔ لیکن لوگ تو اُسے دغاباز ہی سمجھیں گے! جاننے والوں کو کیا منھ دکھائے گا؟ سوما ہی اُس کا اعتبار کر سکتی تھی۔ لوگ سوما کو نہ جانے کہاں لے گئے ہوں گے۔ اور اُس کے دل کا بھی کیا پتہ؟..... عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔!

دھن سنگھ ایک دو کو نہیں، ایسے کئی ڈرائیوروں اور آدمیوں کو جانتا تھا جنھوں نے پرائی عورتوں کے ساتھ، رنڈیوں کے ساتھ بدکاریاں کی تھیں۔ ایسے لوگوں کو سماج سے کوئی ڈر نہ تھا، کیوں کہ انھوں نے اِس جرم کے لیے سزا نہیں کاٹی تھی مگر وہ خود جیل سے سزا کاٹ کر باہر نکل رہا تھا۔ جیل میں بیتے چھ مہینے اُس نے سخت ذہنی عذاب میں گزارے تھے۔ اُسے پولس پر غصہ تھا۔ پولس نے اُسے زندگی بھر پریشان کیا تھا۔ اُس کے بچپن میں پولس نے اُس کا گھر چھیننے میں میاں بجر سنگھ کا ساتھ دیا تھا۔ موٹر چلاتے وقت پولس چالان کرنے کی دھمکی دے کر رشوت لیتی تھی۔ پولس نے تھانے میں اُسے پیٹا تھا اور سوما سے اسے منڈی لے جانے کا جھوٹا بیان دلایا تھا۔ اگر سوما منڈی جانے کی جھوٹی بات نہ کہتی تو اُسے سزا نہ ہوتی۔ تھانے میں پانچ دن تک نہ جانے سوما کے ساتھ کیا کیا ہوگا؟ سوما اب جانے کہاں ہے؟

کئی بار جیل کاٹے ہوئے اور کئی مقدمے جھیلے ہوئے تجربہ کار ساتھیوں نے کئی بار شرط لگا کر

کہا تھا۔" یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حوالات میں پولس عورت کو خراب نہ کرے۔ مادر..... پولس والے اپنی سگی ماں کو نہیں چھوڑ سکتے۔،، ساتھی قیدیوں نے دھن سنگھ سے جرح کرکے سمجھایا۔" جس وقت عورت کا سسر رپٹ لکھانے آیا تم لوگ تھانے میں تھے۔ پولس نے اُسے کیوں ٹال دیا؟ پولس نے تمہارے منڈی جانے کا قصہ کیوں گڑھا؟ تھانے میں تمہارے اور عورت کے رہنے کی دوراتیں پولس نے کیوں غائب کردیں؟ پولس نے تمہاری گرفتاری سسر کے رپٹ کے بعد کیوں دکھائی؟ اتنا نہیں سمجھتے؟" اور انھوں نے دھن سنگھ کو یہ بھی سمجھادیا۔" بیٹا اب جیل سے چھوٹ کر دنیا میں جاؤ گے تو تمہارا نمبر ساتھ چلے گا۔ پولس ہمیشہ تمہاری نگرانی کرے گی سمجھے! جہاں تک بنے شروع میں ہی کنّی کاٹ جانا۔ نہیں تو بیٹا مہینے بھر میں پھر یہیں آؤ گے۔،،

سوما کے ساتھ پولس کی بدسلوکی کے تصور ہی سے دھن سنگھ کا خون کھول جاتا تھا۔ سوما نے منڈی جانے کی جھوٹی بات کہہ کر اُسے جیل کی سزا دلائی تھی۔ اُسے سوما پر بہت غصہ آتا۔ لیکن عدالت میں سوما کے رونے کی یاد سے وہ غصہ باقی نہ رہتا۔ عدالت نے سوما کو چودھری نربھے رام کے سپرد کردیا تھا۔ دھن سنگھ نے سوچا چودھری کے گھر جاکر اُس کا پتہ لگائے۔ اگر پولس نے اُس کو خراب کیا ہوگا تو وہ تھانے میں جاکر تھانے دار کو قتل کردے گا۔ اِس بار اُسے کوئی پکڑ نہیں سکے گا اُس وقت تو وہ سوما کی وجہ سے خود ہی تھانے چلا گیا تھا۔ جیل کے تجربہ کار ساتھیوں سے اُس نے بھاگنے اور پولس سے بچنے کے بیسیوں طریقے سیکھ لیے تھے۔ سب سے بڑی بات اُس نے سیکھی تھی! وہ جرم کرنے والے اور مجرم سے نفرت کرنے والے سماج کی پروا نہ کرنا۔

دھن سنگھ جیل سے چھوٹ کر اپنے فیصلے کے مطابق چودھری نربھے رام کے گھر کا پتہ لگانے کے لیے جارہا تھا۔ وہ چوکس تھا کہ کہیں کوئی پرانا ساتھی اسے دیکھ نہ پائے۔ بازار میں اُسے اپنا نام سُنائی دیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ کامریڈ بھوشن تھے۔ ملاقاتی کو دیکھتے ہی دھن سنگھ کا دل لعنت ملامت سُننے کے ڈر سے گھبرا گیا۔ مگر بھوشن کے چہرے سے ایسا ظاہر نہ ہوتا تھا۔

بھوشن نے دھن سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔" میں تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ کب آئے؟ کیا ملنے جُلنے کمپنی کے دفتر جارہے ہو؟،،

دھن سنگھ جیل سے طے کرکے آیا تھا کہ اپنے دل کی بات کسی سے نہ کہے گا۔ جواب دیا۔

" نہیں، ایسے ہی، ابھی تو آیا ہوں۔"

" تو کیا کانگڑے جارہے ہو؟" بھوشن نے پوچھا۔

دھن سنگھ نے سوال کا مطلب سمجھا اور ٹالنے کے لیے کہا۔" دیکھیے ابھی کیا کہوں۔"؟
کانگڑے میں چودھری جی کے یہاں جانا چاہتے ہو؟" بھوشن نے پوچھا اور اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی بتایا۔" لڑکی وہاں نہیں ہے۔"

دھن سنگھ کے چہرے پر مایوسی دکھائی دی۔ بھوشن نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"آؤ، کچھ کھاؤ گے؟ چائے پی لو پھر چلتے ہیں۔"

دھن سنگھ کو جیل کے چھ مہینے میں مٹھائی اور پھل کھانے کا کئی بار جی چاہا تھا۔ اِس لیے نہیں کہ اِن چیزوں کا اُسے بہت شوق تھا، بلکہ اِس لیے کہ یہ چیزیں وہاں دیکھنے کے لیے بھی نہ ملتی تھیں۔ اُس نے سوچا تھا رہائی کے بعد ایسی چیزیں جی بھر کر کھائے گا۔ لیکن کامریڈ نے کچھ کھانے کی دعوت دی تو دھن سنگھ کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سُننا چاہتا تھا کہ سوما کہاں ہے؟ اُس کا کیا ہوا؟

دوکان سے باہر آکر بھوشن رازدارانہ طور پر دھیمے لہجے میں بولا۔" سنو، لڑکی یہیں دھرم شالہ میں لالہ جوالا سہائے سرولا کی کوٹھی میں ہے۔ بہت آرام سے ہے۔ چلو ملا دوں۔ اب تمہیں خوب سمجھ بوجھ کر چلنا ہے، سمجھے؟ جو ہو گیا سو ہو گیا۔"

دھن سنگھ سرولا صاحب کی کوٹھی پر جا کر سوما سے تین چار بار ملا۔ یہ ملنا کوٹھی کے برآمدے میں ہوتا تھا۔ جہاں نوکر چاکر اور دوسرے لوگ انھیں دکھائی دیتے رہتے تھے۔ دھن سنگھ کو سوما اور سوما کو دھن سنگھ کچھ بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔ دھن سنگھ پتھرایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر غصہ سا ہوتا تھا۔ جسے دیکھ کر سوما سہم جاتی تھی۔

دھن سنگھ کو بھی سوما بالکل بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اُس میں شہری پن سا آگیا تھا۔ چہرے پر اُداسی لیے اُس کا رنگ پہلے سے بہت صاف، آنکھیں اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔

دھن سنگھ کے دل میں جو سوال سب سے اُوپر اُٹھ رہا تھا اُسے دبا کر اُس نے پوچھا۔" کیسے رہی، بڑی تکلیف ہوئی ہوگی؟"

"جی تم آگئے تو سب ٹھیک ہے۔ جیل میں سپاہیوں نے اور تو نہیں مارا؟
سوما کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"تمھیں پولس والوں نے پریشان کیا ہوگا؟"، دھن سنگھ نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔
سوما سر جھکائے چپ رہی۔

دھن سنگھ کے سوال دہرانے پر اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔" جی اب بیت گئی کا کیا رونا!

تمہیں زندہ دیکھ لیا سب پا لیا۔"

اِس جگہ پر زیادہ باتیں کرنا ممکن نہ تھا۔ دھن سنگھ کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ بھی طے نہ کر پا رہا تھا۔ وہ سوما کے لفظوں کے بہت سے معنی نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ کیا پولس نے اسے بھی مارا پیٹا ہے؟ یا....... ؟ وہ سوچتا کہ بدمعاش پولس والوں نے مجھے مارنے کی دھمکی سوما کو کیوں دی ہوگی؟ کیا اُسے ڈرا کر بس میں کیا ہوگا؟ ان لوگوں نے ایسا کیا ہے تو مجھے اس عورت سے کیا مطلب؟ وہ سڑک پر گھومتے ہوئے دل ہی دل میں بیج ناتھ جا کر تھانے دار ہری رام، کریم اور نفیس کا قتل کر کے پنجاب بھاگ جانے کی بات سوچنے لگا۔ اُسے اپنی زندگی کا کوئی اور مقصد دکھائی نہ دیتا تھا۔

سوما لگ بھگ چار مہینے لالہ جوالا سہائے سرولا کی کوٹھی میں رہ چکی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی کہانی لالہ جی تک پہنچ گئی تھی۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ لڑکی بری نہیں، بے چاری بدقسمت ہے۔ دھن سنگھ کو وہ اچھا اور بھروسے کے لائق ماننے کو تیار نہ تھے۔ ایسے آدمی کے ہاتھ میں وہ اپنی دس پندرہ ہزار کی گاڑی بلکہ اپنی جان سونپنا انھیں عقل کی بات نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن منّو نے کہا۔ "میں تو اسے کہہ چکی ہوں۔"

لالہ جی نے دھن سنگھ کو بیٹھے ہی بیٹھے پندرہ دن کی تنخواہ مخواہ دی۔ پھر پندرہ دن اِس سے اِدھر اُدھر کے کام کراتے رہے۔ لیکن منورما کو جب بھی اکیلے یا ماں جی کے ساتھ نیچے بازار تک بھی جانا ہوتا تو وہ گاڑی چلانے کے لیے دھن سنگھ کو ہی پکار لیتی تھی۔

کچھ ہی دن بعد منورما پر دھن سنگھ اور سوما کی ذمہ داری اور زیادہ آن پڑی۔ پولس بھوشن کو دو دوسرے کمیونسٹوں کے ساتھ گرفتار کر کے لاہور لے گئی تھی۔ منورما کو بھوشن کی گرفتاری سے بہت دکھ ہوا تھا۔ مگر منھ سے کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

سرولا صاحب کی کوٹھی اونچی جگہ پر تھی۔ وہاں صرف ایک ہی گاڑی کے لیے گیرج تھا۔ باقی گاڑیوں کے لیے ایک فرلانگ نیچے کوتوالی بازار کے نزدیک گیرج تھے۔ وہاں کچھ کوٹھریاں نوکروں کے لیے بھی تھیں۔ منورما نے ایک کوٹھری دھن سنگھ اور سوما کو دلا دی۔

دھرم شالہ میں اگست کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ کوٹھری میں ان لوگوں کی مشترکہ زندگی کی پہلی رات آئی۔ سوما نے رسوئی تیار کی۔ دونوں نے کھائی۔ دوپہر سے لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ دھن سنگھ نے پھر سوما سے بیج ناتھ کے تھانے میں سلوک کی بات پوچھی۔ سوما نے جواب دیا۔
"ہاں جی، سب تو کہہ دیا۔ اب وہی یاد دلا کے کیوں دُکھی بناتے ہو!"

دھن سنگھ بگڑ اُٹھا "تو چالاک ہو گئی ہے۔ باتیں چھپاتی ہے۔ بات چھپائے تو میرا منہ دیکھے۔"
سوما کانپ اُٹھی۔ رو رو کر اُس نے کہا۔ "کہا تو میں نے، جب انھوں نے کہا کہ نہیں مانے گی تو چمٹا لال کر کے تمہارا بدن نوچیں گے، تو میں نے کہا کہ میرا چاہے جو کریں، تمھیں نہ چھوئیں۔ مجھے چھوا تو میں رونے لگی۔ پیاس سے میرا گلا سوکھ رہا تھا۔ ایک آدمی لوٹے میں پانی لایا۔ کڑوا کڑوا اور شراب جیسی بُو۔ کہنے لگے یہاں کی باوڑی میں پتے سڑ گئے ہیں۔ پانی پیا تو سر چکرایا ....
جاگی تو روتی رہی۔"
دھن سنگھ کا سر گھوم گیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور لمبی سانس لے کر بولا۔ "اسی لیے چھپا رہی رہی تھی تو؟ مجھے اب تجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ میں اُس تھانے دار کو قتل کر کے پانی پیوں گا۔ اپنا دھرم ایمان تو جان۔"
دھن سنگھ چلنے لگا تو سوما اُس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ دھن سنگھ نے اُسے ڈانٹا، گالی دی۔ سوما نے پاؤں نہ چھوڑا تو اسے خوب پیٹا۔ سوما اپنی پوری طاقت سے دھن سنگھ کا پاؤں پکڑے تھی اور کہے جا رہی تھی۔ "مجھ سے مطلب نہیں تو مجھے ختم کر کے جاؤ۔ جانا ہے تو پہلے میرا گلا کاٹ کے جاؤ۔"
دھن سنگھ نے بے بس ہو کر سر دیوار پر ٹیک دیا اور خود بھی دیر تک روتا رہا۔
دھن سنگھ دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا رہا۔ اور سوما اس کے پاؤں کو بیڑیوں کی شکل میں جکڑے رہی۔ پاؤں ذرا بھی ہلتے دیکھتی تو پوری طاقت سے پنڈلیوں تک سینے سے چمٹا کر پکڑ لیتی۔ دھن سنگھ نے چھوٹنے کے لیے اُسے گھونسوں سے پیٹا۔ جوتوں سے سوما کے کندھے اور کمر میں درد ہو رہا تھا۔ سوما نے درد کی پروا نہ کی۔ اِس کوشش میں دھن سنگھ تھک گیا۔ دیوار سے سر ٹکائے سوچتا رہا، اُس کا کیا قصور؟ اسے کس کے آسرے چھوڑ جاؤں؟ دُنیا تو جیسی ہے اُسے پریشان ہی کرے گی .... لالہ جی کیا کہیں گے؟ بھوشن جی کیا کہیں گے؟
دھن سنگھ نے سوما کے ہاتھ اپنے پاؤں سے ہٹاتے ہوئے یقین دلایا۔ "اچھا کہہ دیا، نہیں جاؤں گا۔"
سوما نے آنسوؤں سے بگڑی اور لال آنکھیں دھن سنگھ کے منہ کی طرف اُٹھا کر پوچھا۔
"جی میرے سر کی قسم۔"
دھن سنگھ نے ہاں کہا۔
سوما نے پھر کہا۔ "جی اب مجھے چھوڑ کے جانا ہو تو پہلے میرا گلا کاٹ دینا نہیں تو میں تی

کا پھندا لگا لوں گی ۔،،

بارش بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ لالہ جی عام طور پر باہر نہ جاتے تھے۔ دھن سنگھ کی ڈیوٹی ان کی کار پر ہی تھی۔ لالہ جی سخت ضرورت سے اگر کہیں جاتے بھی تھے تو برسات کی وجہ سے رات کو سفر نہیں کرتے تھے۔ رات کے وقت باہر ہی رہ جاتے تھے۔ ایسی حالت میں سوما رات کے وقت کوٹھری میں اکیلی خوف سے ٹہلتی رہتی تھی۔

دھن سنگھ لالہ جوالا سہائے سروالا کے یہاں اپنا کام بڑی مستعدی سے کر رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کہیں نہ جاتا۔ اپنے گھر پر رہنے کے لیے اسے کافی وقت ملتا تھا۔ مگر وہ سوما سے بہت کم بولتا۔ بولتا بھی تو صرف کام کی بات، اور دو ٹوک۔ نہ وہ اسے چھوتا، نہ سکھ دکھ کی بات کرتا جیسے اُس سے پرہیز سا کر رہا ہو۔ سوما نے اِس سلوک کی کوئی شکایت نہ کی۔ کبھی وہ سوچتی، ان کی عادت ہی ایسی ہو گی۔ لیکن آدمی کبھی تو ہنستا ہے۔ اُس دن تو اور طرح کی باتیں کی تھیں۔ نہیں، دل میں دُکھ ہے۔ وہ بھی چپ اور اُداس بنی رہتی۔ کبھی یہ خیال بھی آتا کہ سسرال سے آ گئی، لیکن کیا بنا۔ دوسرے کے سر بوجھ ہی تو ہے۔ بے چارا بھلا لوگ ہے جو جھیل رہا ہے۔ ایسے خیالوں سے بچنے کے لیے وہ دن بھر کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی۔ بے کار بیٹھنے کی عادت اُسے یوں بھی نہ تھی۔

کبھی بارش نہ ہونے پر منورما کی ماں اسے کام کاج کے لیے کوٹھی پر بلا بھیجتی۔ یا اپنے پُرانے لحافوں کی روئی یا اُون اس کے گھر بھجوا دیتی۔ ایک چرخہ بھی انھوں نے اُس کے یہاں بھجوا دیا تھا۔ دھرم شالہ کے چوما سے کی جھڑی لگتی رہتی اور سوما اپنے گھر کے اندر چرخے کی گھوں گھوں میں ماں جی کے لیے سوت یا اُون کاتتی رہتی یا اپنی رسوئی کی تیاری میں لگی رہتی۔ اُس کی زندگی دھیرے دھیرے چلنے والے کولھو کے بیل جیسی تھی۔

لالہ جی کچھ دن کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے۔ دھن سنگھ کو گاڑی لے کر کہیں جانا نہ ہوتا تھا۔ پانی بھی روز جیسا برس رہا تھا۔ وہ کوٹھری میں چارپائی پر لیٹا بارش کی طرف نظر لگائے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ سوما چارپائی کے سرھانے کی طرف بیٹھی کسی کام میں لگی ہوئی تھی۔ دھن سنگھ کو اپنے سرھانے سسکی کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر اُس نے دیکھا۔ سوما ایک ہاتھ کھاٹ کی پٹیوں پر رکھے منھ آنچل میں چھپائے رو رہی ہے۔

"کیا بات ہے ؟" دھن سنگھ نے پوچھا۔

"جی تم بڑے اُداس رہتے ہو۔ میرا تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ تم اپنی گھروالی کو لے آؤ۔ تمہارا دل لگے گا۔ تم سکھی رہو۔ سب سے بولتے ہو۔ مجھی سے دُکھی ہو۔" سوما نے سسک کر کہا۔

"میں تجھے کیا کہتا ہوں ؟"

"تم بڑے بھلے ہو جی۔ دیوتا تمہارا بھلا کریں۔ پہلے تم کتنی اچھی طرح بولتے تھے۔ میرا تو پہلے بھی کیا تھا ؟ میں تو رانڈ ہوں لیکن تم کیوں بسورتے ہو !" سوما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دھن سنگھ کے منہ سے نکلا "لوگوں نے تیرے ساتھ بُرا کیا۔ تیرا کیا قصور ہے ؟"

دھن سنگھ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گیا کہ یہ بات اسے پہلے کیوں نہ سوجھی۔ اُس نے سوما کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "پاگل روتی کیوں ہے ؟" اور اسے کھینچ کر کھاٹ پر بٹھا لیا۔

سوما اور بھی زور زور سے رونے لگی۔

دھن سنگھ نے پچکار کر بے چینی کے ساتھ کہا "روئے تو مجھے کھائے !" اور بتایا۔ "میرا ابھی دنیا میں تیرے سوا اور کوئی نہیں۔" وہ اسے پچکارنے لگا۔

سوما نے گھبرا کر ٹوکا۔ "ہائے دیکھو تو کواڑ کھلا ہے۔"

اُس دن دونوں میں مہینے بھر سے آتی دوری مٹ گئی۔ دھن سنگھ نے سوما کو اپنی کھاٹ پر بٹھا کر صلاح کی۔ "سن تو آریہ والا بیاہ کر لیں، چودھری جی کرا دیں گے۔"

سوما شرما گئی۔ "میں تو تمہاری ہی ہوں۔ رانڈوں کا کہیں بیاہ ہوتا ہے ؟"

دھن سنگھ نے گمبھیر لہجے میں شکایت کی۔ "کیا کہتی ہو، کیا میں مر گیا ہوں ؟ میں مر جاؤں تو اپنے کو رانڈ کہنا۔"

سوما نے اُس کے سر کی بلا اپنے اُوپر لے کر دیوتا کو یاد کیا۔

ستمبر کا مہینہ آگیا۔ دھرم شالہ کے چہرے پر چھائے رہنے والے بادل ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں اُڑ گئے۔ جاڑے کی ٹھنڈی ہوا نے انھیں جما دینے کے لیے برفانی چوٹیوں کی طرف پھینک دیا۔ دھرم شالے میں دُھوپ کھلکھلانے لگی۔ سوما کے دل میں بھی دھوپ کھلکھلا اُٹھی تھی۔ منورما کے کالج کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں، اور وہ لاہور چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے انھوں نے سوما کو ملنے کے لیے بلایا تھا۔ دھن سنگھ ہی انھیں کار میں پٹھان کوٹ لے گیا تھا۔ یہ علاحدگی سوما کو بہت محسوس ہوئی تھی۔ جیسے ماں سے بچھڑ رہی ہو۔

سوما دھرم شالہ آئی تھی تو دوپہر یا شام کے وقت پڑوس میں، یا کبھی کوٹھی پر بھی گانا سُنائی دینے لگتا تھا۔ ہر وقت گانا سن کر اُسے حیرت ہوتی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا۔ فونوگراف ہوتا ہے۔ سوما کو گیتوں کے سُر تو اچھے لگتے تھے۔ لیکن گیتوں کے لفظ وہ سمجھ نہ پاتی۔ ہاتھ کام میں اُلجھے رہنے کے باوجود اِن گانوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی اور کبھی کبھی منورما بی بی سے سُنے ہوئے یا گراموفون کے گیتوں کے ٹکڑے گنگنانے لگتی۔ ایک دن ایسے ہی کوٹھی سے آیا سوت کاتتے وقت وہ گانے لگی۔ سوما نے آہٹ پاکر گھوم کر دیکھا، دو آدمی دروازے کے باہر کھڑے اُس کا گانا سُن رہے تھے۔ وہ شرم سے مرجھا سی گئی۔ میکے یا سسرال میں کوئی عورت کھُلے کھیتوں میں بھی گاتی رہتی تو کوئی خیال نہ کرتا۔ اُس دن اُس نے سمجھ لیا کہ شہروں میں غریبوں کی اچھی عورتیں اونچی آواز میں نہیں گاتیں۔

سوما کے ہاتھ شاید ہی کبھی خالی رہتے ہوں گے۔ کام کرتے رہنا اُس کی عادت تھی۔ میکے اور سسرال میں وہ اُپلے تھاپنے، دھان کوٹنے، اناج ڈھونے، پانی بھرنے، گھر بھر کے برتن مانجھنے، کپڑے دھونے اور جانور چرانے یا کھیتی کا کام کرتی تھی۔ اب پانی اُس کے گھر پر نل سے آجاتا تھا۔ آٹا دھن سنگھ پسا پسایا بازار سے لا دیتا تھا۔ کھیتی کے نام پر دو چار پودے دروازے کے سامنے لگا دیے تھے۔ اِس لیے صرف دو آدمیوں کے چوکے برتن کا کام ہی کتنا؟ سوما دھوپ میں بیٹھ کر کوٹھی پر سیکھی کچھ بُنائی سلائی کرتی۔ پہلے اُسے چار چھ دن کے پہنے کپڑے میلے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اب سرولا صاحب کے گھر کے اثر سے وہ کپڑوں کو چوتھے پانچویں دھو ڈالتی تھی۔ اِس کے علاوہ اُس نے اپنے بدن کو سنوارنے کا کام بھی سیکھ لیا تھا۔

منّو بی بی اور دوسری عورتوں کو دیکھ کر سوما کا دل بھی چاہتا کہ اپنے بالوں کو اُن کی طرح باندھے لیکن ہمت نہیں ہوئی تھی۔ دھن سنگھ نے ولایتی صابن لا دیا تھا۔ پہاڑ کی ٹھنڈی خشک ہوا سے گال پھٹنے لگتے تو چہرے پر چکنائی لگانا ضروری ہو جاتا۔ سسرال میں وہ ساس کی نظر بچا کر گھی کی ہانڈی میں سے انگلی بھر منہ پر مل لیا کرتی تھی۔ دھن سنگھ نے کریم اور پاؤڈر لا دیا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح دھن سنگھ کو بھی اپنی پتنی کو سجانے کا شوق تھا۔ سوما چکنی، نازک اور شرمیلی ہوتی جا رہی تھی۔ پاس پڑوس کے مرد گزرتے وقت اُس کی طرف گھورتے تو اُسے ڈر محسوس ہوتا۔ اُس نے کوٹھری کے دروازے پر ایک چک لگوا دی تھی۔ دھوپ میں بیٹھا ہوتا تو سڑک کی طرف کھاٹ کھڑی کر کے آڑ کر لیتی تھی۔ بھلے گھر کی عورتوں کا یہی طریقہ تھا۔

پہاڑوں میں گرمیوں کے شروع ہی سے آمد و رفت بڑھ جاتی ہے۔ پنجاب سے لوگ آنے لگتے ہیں اور دھرم شالہ کی اُجڑی اُجڑی اُونگھتی سی بستی جاگ کر کلکاریاں مارنے لگتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں لڑائی کی وجہ سے ضلع میں بہت سے کیمپ کھُل گئے تھے۔ رنگروٹوں یا چھٹیوں پر آئے سپاہیوں کی وجہ سے ہر طرف خاکی وردی پہنے لوگ دکھائی دیتے تھے۔ اِن سپاہیوں کی زندگی میں نہ کوئی اُمید تھی نہ کوئی ذمّہ داری۔ نہ کسی کا لحاظ نہ مروّت، یہ لوگ موت کی پروا نہ کرنے کے خیال میں، واجب، غیر واجب کی پروا بھی چھوڑ بیٹھے تھے۔ اِن لوگوں کی بدتمیزیوں سے دھرم شالہ میں بھلے گھر کی عورتوں کے لیے ہاٹ بازار میں نکلنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ میم اور صاحب لوگ کے درجے کی عورتوں سے یہ سپاہی ڈرتے تھے۔ گرمی کے شروع ہی میں منورما بی بی لاہور سے آ گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی چھوٹی بھاوج، دو بچے اور بیرسٹر جگدیش سرولا بھی آ گئے تھے۔ کوٹھی پر کام بہت بڑھ گیا تھا۔ دھن سنگھ کو دن بھر باہر رہنا پڑتا اور کبھی کبھی رات میں بھی۔

ایک شام سوما نے دھن سنگھ سے کہا۔ "جانے کیسے لوگ آ گئے ہیں! رات کو آ کر دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور بُری بُری باتیں کہتے ہیں مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ تم رات کو باہر نہ رہا کرو۔"

دھن سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ بے بسی کے ساتھ بولا۔ "پرائی نوکری میں کیا بس؟ میں شام تک نہ آؤں تو کوٹھری میں تالا لگا کر رات میں کوٹھی پر چلی جایا کر۔ اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ یہ سپاہی اور ٹرکوں کے ڈرائیور تو جانور ہوتے ہیں۔ کس کس سے لڑیں گے۔"

سال پورا ہو کر اگست کی جھڑیوں کے دن آ گئے تھے۔ دھن سنگھ نے صبح نو بجے آ کر کہا۔ "میں لالہ جی کو لے کر لاہور جا رہا ہوں۔ رات کو تو میں لوٹ نہیں سکوں گا۔ تمھیں اوپر پہنچا آؤں؟"

سوما نے جواب دیا۔ "ابھی چلی جاؤں گی تو گھر کا سب کام رہ جائے گا۔ رات بھی وہیں رہنا ہو گا۔ کئی دن بعد دُھوپ نکلی ہے۔ کچھ کپڑے دھو لوں۔ میں دوپہر بعد آپ ہی چلی جاؤں گی۔"

اپنے گھر کا کام چھوڑ کر کوٹھی کے کام میں اُلجھی رہنا سوما کو اچھا نہ لگتا تھا۔ اب کوٹھی پر کام بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ منّو بی بی اور لالہ جی کو چھوڑ کر کوئی آدمی ایسا نہ تھا، جس کا ایک نہ ایک کام سوما کو نہ کرنا پڑتا ہو۔ وہ شرم کے مارے کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی کہ اُس کا پاؤں بھاری ہو رہا تھا۔ چوتھا مہینہ لگ گیا تھا۔ ماں جی چُننے بٹورنے کے کاموں کو صفائی سے کرانے کے لیے اُس کا

انتظار کرتی رہتی تھیں۔

منورما کی چھوٹی بھابی بیرسٹر جگدیش سہائے سرولا کی پتنی پورے طور پر بیرسٹر صاحب کا جواب تھی۔ بدن سے پھیلی ہوئی، چال میں سُست۔ اُن کے دونوں بچّوں تارا اور بھوپی کو صرف سوما ہی بس میں رکھ سکتی تھی۔ اُن بچّوں کے لیے کوئی نہ کوئی کشیدہ یا بنائی سوما کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ سوما کوٹھی پر رہتی تو بچّوں کو کھلانے پلانے اور اُن کے کپڑے بدلوانے کا کام بھی اُسی کو کرنا پڑتا تھا۔ شروع میں سوما نے چاؤ اور پیار سے اپنا دل بہلانے کے لیے یہ کام خود ہی کر لیا تھا۔ اب اِس وجہ سے اُسے گھر لوٹنے میں بہت دیر ہو جاتی تھی۔ اور تو اور بیرسٹر صاحب کا غصّہ سنبھالنے کا کام بھی ساوتری بھابی سوما سے لینے لگی تھی۔ جیسے سوما کو اپنے گھر کی کوئی فکر ہی نہیں تھی۔

بیرسٹر صاحب مزاج کے کچھ تیکھے ہی تھے۔ صفائی اور قاعدے کی کچھ باتیں ولایت سے ایسی سیکھ آئے تھے کہ ساوتری بھابی نباہ نہ پاتی تھی۔ اُن کا خاص بیرا اُدھم سنگھ چھٹّی پر تھا۔ اس لیے اُن کی چائے اور کپڑوں کے انتظام میں گڑبڑی رہتی اور وہ چڑتے رہتے تھے۔ سوما ایک تو ان کی نوکر نہ تھی۔ دوسرے عورت! اِس کا شرمانا، جھجکنا اور آنکھیں اُنھیں پسند تھا۔ اُس کے الھڑپن کو بھی وہ مسکرا کر برداشت کر جاتے تھے۔

ساوتری بھابی اور ماں جی کو یہ اچھا ذریعہ بیرسٹر صاحب کو بس میں رکھنے کا مل گیا تھا۔ انھوں نے سوچا۔ جب تک وہ منھ لگا کم بخت اُدھا چھٹّی پر ہے۔ یہی سہی۔ سوما دوپہر بعد کوٹھی پر ہوتی۔ یا دھن سنگھ کی غیر حاضری میں رات کوٹھی پر گزارتی تو بیرسٹر صاحب کو شام کی چائے اور صبح کی چائے (بڈ ٹی) سوما ہی کو پہنچانی پڑتی تھی۔

دھن سنگھ لالہ جی کو لے کر لاہور جا رہا تھا۔ پٹھان کوٹ میں معلوم ہوا کہ پی، ڈبلیو، ڈی کے چیف انجینئر صاحب وہیں آئے ہوئے تھے۔ لالہ جی کی ان سے ملاقات ہو گئی اور لاہور جانا ضروری نہیں رہا۔ بارش تھمی ہوئی تھی اور وقت بھی تھا۔ لالہ جی نے دھن سنگھ کو دھرم شالہ واپس چلنے کو کہا۔

دھن سنگھ گاڑی لے کر دھرم شالہ میں کوٹھی پر پہنچا تو شام کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ کوٹھی کے گیرج میں دوسری گاڑی بند تھی۔ لالہ جی کی گاڑی کو اُسے نیچے کے گیرج میں چھوڑنا تھا۔ اُس نے نوکر بدلو سے خبر بھجوائی۔ سوما کہیں اندر اُلجھی ہوئی تھی۔

دھن سنگھ کو بھوک ستا رہی تھی۔ اُس نے سوچا۔ سوما کب گھر پہنچے گی اور کھانا پکائے گی

اُس سے اچھا ہے بازار سے کھالے اور جاکر سو رہے۔ کوٹھی کے چوکیدار سے اُس نے سوما کو کہلا دیا۔ دیر ہو گئی ہے، کوٹھی پر ہی رہے، صبح آکر لے جائے گا۔ وہ گاڑی لے کر بازار کی طرف اُتر گیا۔ بازار میں رام جی کی دوکان پر جہاں دوسرے ڈرائیور کھانا کھاتے تھے، اُس نے کھانا کھایا۔ اور گاڑی گیرج میں بند کر کے اپنی کوٹھری میں کھاٹ پر جا لیٹا۔

دھن سنگھ کو تھکاوٹ سے جھپکی آ رہی تھی۔ اسے کواڑوں میں کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ پہلے تو اُس نے سمجھا کہ باہر ہوا ہو گی۔ لیکن منہ سے سیٹی بجانے کی آواز اور کچھ بات بھی سنائی دی۔ دھن سنگھ کو یکایک یاد آیا، سوما کہتی تھی کہ رات میں بدمعاش لوگ دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ اُس نے سوچا۔ آج سالوں ...... کو ٹھیک کروں گا!۔

سیٹی اور آہٹ پھر سنائی دی۔

دھن سنگھ آہستہ سے کھاٹ سے اُٹھا کہ آہٹ نہ ہو۔ اور اُس نے کواڑوں کی دراڑ سے کان لگا کر سُنا۔ باہر کوئی کہہ رہا تھا۔ "ارے بی بی جان کیواڑ کھول دے۔ غریبوں سے بھی دو باتیں کر لے۔ بڑے بڑے آدمیوں تک تیری پہنچ ہے تو کیا ہوا؟ ہم بھی تیرے عاشق ہیں۔ ہمارے نوٹ کیا کھوٹے ہیں۔ کیا ہمارے نوٹ میں کانٹے لگے ہیں؟ یہ لے دس روپے!"

کواڑ کی جھری میں سے ایک کاغذ کھسک کر آتا دکھائی دیا۔

دھن سنگھ سمجھ گیا۔ یہ سمجھ کر کہ وہ باہر گیا ہوا ہے۔ بدمعاش اُس کی گھر والی کو پریشان کرنے آئے تھے۔ آواز اُسے کچھ پہچانی سی لگی۔ اُس نے پہچانا "دھولی دھار" کمپنی کے ڈرائیور شمشل اور جگی تھے۔ اُس کا خون کھول اُٹھا۔ دل میں بولا۔ "اچھے موقع پر آئے تم۔ آج بہن ..... کو سمجھوں گا۔"

باہر سے سیٹی اور بے ہودہ اشارے سنائی دے رہے تھے۔ اور ساتھ ہی شراب کی اُبکائی پیدا کر دینے والی تیکھی بو، کواڑ کی جھریوں سے اندر آ رہی تھی۔ دھن سنگھ نے کونے میں رکھا لوہا بندھا ڈنڈا اُٹھا لیا اور جھٹکے سے کواڑ کی زنجیر کھول دی۔ بدمعاشوں کے سنبھل پانے سے پہلے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے ڈنڈا اُٹھا کر دونوں پر ٹوٹ پڑا۔

ایک دبی سی آواز میں "ہائے!" اور ایک آدمی چکرا کر گر پڑا۔ دوسرا بھاگا لیکن لڑکھڑا کر وہ بھی گر گیا۔ دھن سنگھ نے اُس کے سر پر بھی دو ڈنڈے بھرپور ہاتھ سے مارے اور پہلے گرنے والے آدمی کو بھی تین چار جانٹے اور لگا دیے۔

دھن سنگھ ہانپتا ہوا اپنی کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ پل بھر بعد ہی اسے خیال آیا، کہیں زیادہ چوٹ تو

نہیں آئی۔ بہن ..... دروازے پر ہی پڑے ہیں ۔ یہ بُرا ہوا۔

رات کے سنّاٹے میں ٹھنڈی تیز ہوا فرّاٹے سے بہہ رہی تھی ۔ پڑوس سے کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آسمان پر کچھ بادل بھی تھے۔ چاند نہیں تھا۔ بازار کی سڑکوں پر بجلی کی بتّیاں جل رہی تھیں۔ ان کی وجہ سے اندھیرا گہرا نہیں تھا۔ دھن سنگھ نے نزدیک گرے آدمی کے پاس جاکر دیکھا۔ سر سے بہت سا خون بہہ کر آس پاس کی زمین پر جم گیا تھا جس سے اندھیرے میں وہ کالی دکھائی دے رہی تھی۔ جھک کر دیکھا، وہ جگی تھا۔ سانس چلتی نہیں معلوم ہوئی۔ دھن سنگھ گھبرا گیا۔ دوسرے آدمی کے سر کے نزدیک بھی زمین کالی ہو رہی تھی۔

دھن سنگھ کے غصّے کا زور غائب ہو گیا۔ غصّے کی جگہ دل ڈر سے ڈوبنے لگا۔ اب کیا ہوگا ؟ اِس کا خیال اِن لوگوں کو مار ڈالنے کا نہیں تھا۔ مرگیا تو جیسا ایک ویسا دو! گرفتاری، جیل، پھانسی! وہ کانپ اُٹھا۔ دل کو ٹھنڈا کرکے سوچنے کی کوشش کرنے لگا کہ لاشوں کو اُٹھاکر دور کھڈ میں پھینک آئے لیکن دونوں راستوں پر بستیاں پڑتی تھیں۔ خون سے تر زمین کا کیا کرے گا ؟ کھود ڈالے ؟ اتنے میں کوئی آتا جاتا دیکھ لے گا تو ؟ اِن لوگوں کی لاشیں ملیں گی۔ جانچ پڑتال ہوگی !

بھاگ جانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ دھن سنگھ کا جسم خوف سے کانپنے لگا۔ لاٹھی چھُرے کا خوف نہیں، پولس اور سرکار کا خوف تھا۔ جس سے کوئی بچاؤ نہیں تھا..... سوما کو خبر دے آئے؟ گھبرا جائے گی۔ کوٹھی پر شور مچ جائے گا...... زندہ رہے گا تو پھر ان سے ملے گا۔ اِس وقت تو کسی طرح پولس سے جان بچے۔ اُس نے کوٹھری کے اندر جاکر سب روپے لے لیے اور اپنی حفاظت کے لیے لوہا بند ڈنڈا بھی ہاتھ میں لے لیا۔

دھن سنگھ سڑک سے بچتا، پگڈنڈیوں سے اُترتا، کانگڑے کی طرف چل دیا۔

سوما کو لالہ جی کے آجانے کی خبر اُس وقت ملی، جب وہ بدلو سے چوکا اُٹھوا رہی تھی۔ سوچا، دھن سنگھ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اُس نے اور بھی جلدی کی لیکن کمزور بدن۔ بی بی جی نے اسے پکار لیا تھا۔ 'بڑی پیاری بہن ہے سوما۔ لالہ جی آ گئے ہیں۔ ترکاریاں تو ہیں ہی، دو پھُلکے ان کے لیے تو اپنے ہاتھ سے اُتار دے۔ اتنے میں بدلو لالہ جی کے لیے گرم پانی رکھ دے گا۔

سوما لالہ جی کے لیے پھُلکے سینک کر نکلی تو دھن سنگھ اُسے صبح لے جانے کا سندیش چھوڑ کر جا چکا تھا۔

سوما کو بہت بُرا لگا۔ صبح بھوکے ہی رہ گئے تھے، اب آئے تو بازار میں کھائیں گے۔ سچ مچ امیر آدمی دوسروں کو کچھ سمجھتے نہیں ہیں۔ اس نے سوچا کہ بوڑھے مالی کو ساتھ لے کر چلی جائے، لیکن سوچ کر رہ گئی کہ ماں جی اور بھابی جی کہیں گی، بڑی بے صبری ہے۔ ان لوگوں کی وہ گھر کے بزرگوں کی طرح عزت اور ان کا لحاظ کرتی تھی۔

سوما کے لیے رات کوٹھی میں ٹھہرنے کا مطلب تھا کہ صبح بیرسٹر صاحب اور منّو بی بی کو بڈ ٹی ان کے کمروں میں دے کر جائے۔ دونوں ہی صبح جلدی چھ بجے اُٹھ جاتے تھے۔ دھن سنگھ صبح چھ، ساڑھے چھ بجے سے پہلے کیوں آتا؟ اس لیے سوما کو اس میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ بہت جلدی اُٹھتی تھی۔

منورما اور بیرسٹر دونوں چاہتے تھے کہ چائے بستر کے پاس رکھ کر اُنھیں جگا یا جائے۔ منورما کو تو سوما پکارے بغیر ہاتھ ہلا کر جگا دیتی تھی۔ بیرسٹر صاحب کے کمرے میں جاتے ہوئے اسے جھجک ہوتی تھی پکارتی تو کیسے؟ وہ پیالی میں چمچی کھٹکا کر انھیں جگا دیتی اور اُن کے آنکھ کھولتے ہی بھاگ جاتی۔ بیرسٹر صاحب کو آنکھ کھولتے ہی بھولے پن اور شرم کی یہ ادا رجھا دیتی۔ وہ کہتے 'لو لی'۔

اُس دن سوما کو بھاگتے دیکھ کر بیرسٹر صاحب نے کہا۔" مسز سنگھ ایک پیالہ چائے بنا جاؤ۔ خود سگریٹ سلگانے لگے۔

سوما مسز سنگھ پکارے جانے سے شرماتی تھی۔ منورما بھی کبھی کبھی اسے مسز سنگھ پکار لیتی تھی، مگر وہ دوسری بات تھی۔ سوما پلکیں جھکائے چائے بنانے لگی۔ بیرسٹر صاحب کو مطمئن کر دینا اس گھر میں سگھڑاپے کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ سوما اس کامیابی کے لیے فخر بھی محسوس کرتی تھی۔ سوما نے سانس روک کر چائے کا پیالہ بنا دیا اور باہر برآمدے میں جا کر دم لیا۔

سوما نے نیچے بازار کی طرف سے کوٹھی کی طرف جانے والی پگڈنڈی اور سڑک پر نظر دوڑائی کہ شاید لینے آتے ہوں۔ سوچا بھابی جی اور بچوں کے اُٹھنے سے پہلے چلی جائے تو اچھا ہے۔ نہیں تو کوئی نہ کوئی کام اس کو اُلجھانے کے لیے نکل آئے گا۔ دھن سنگھ اسے دکھائی نہ دیا۔ ابھی کافی سویرا بھی تھا۔ سورج پورب کی طرف ابھی اُٹھا بھی نہیں تھا۔

سوما سوچ رہی تھی، جلدی آجاتے تو اچھا تھا۔ خالی ہاتھ کیا بیٹھتی، وہ منورما کے کمرے میں جا کر اُس کا خالی پلنگ درست کرنے لگی۔ سورج چڑھ گیا مگر دھن سنگھ نہیں آیا۔ برآمدے میں کھڑی ہو کر سڑک اور پگڈنڈی کی طرف دیکھتے رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟ سوما پل بھر میں اندر جاتی اور پل بھر میں برآمدے میں آتی۔

بڑی چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔ آسمان رات بھر صاف رہا تھا۔ درختوں، پودوں اور گھاس پر گہری اوس پڑی تھی۔ کوٹھی کی چھت سے اوس کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ برسات کی دھلی ہوئی گہری ہریالی، سنہری دھوپ میں چمک رہی تھی۔ بادلوں کے ٹکڑے برسنے کا کام چھوڑ کر، اونچے اُڑ کر پہاڑیوں پر لوٹ لوٹ کر کھیل رہے تھے۔ غریب طبقے کی عورتیں گھڑے لیے گھر کے نزدیک نلکوں یا تالابوں کی طرف آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بھلے گھر کی عورتیں برسات کی نہ ملنے والی دھوپ دیکھ کر گھر کے سیلے ہوئے سامان کو دھوپ میں چھت پر رکھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کوٹھیوں میں رہنے والی عورتیں گدگدے پلنگ پر انگڑائیاں لے کر نوکروں کو پکار رہی تھیں۔ سوما کا دل چھٹپٹا رہا تھا۔ وہ بھی جائے اور گھر کو سنبھالے، لیکن دھن سنگھ کا کہیں پتہ نہ تھا۔

بچے جاگ اُٹھے۔ بھوپی اپنی چابی دار موٹر ہاتھ میں لے کر سویا تھا۔ وہی موٹر لیے وہ سوما کے گھٹنے سے آ چپکا۔ "ماچھی (موسی) اچھے تلا دو۔"

سوما نے اسے گود میں اٹھا لیا اور سڑک اور پگڈنڈی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی طبیعت جھلانے لگی تھی۔ اُدھر سے دھیان ہٹانے کے لیے وہ بھوپی کا منہ ہاتھ دھلانے کے لیے چلی گئی۔

آٹھ بج گئے۔ دھن سنگھ نہیں آیا۔ بھابی نے سوما کو پکارا۔ "ذرا بھوپی کو دودھ پلا دے اور تو کسی کی سنتا ہی نہیں۔"

سوما سوچ رہی تھی، کیا یہ صبح ہی کہیں ڈیوٹی پر چلے گئے۔ اسے اس زیادتی پر غصہ آ رہا تھا۔ بھوپی کو دودھ پلانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ ایک گھونٹ پیتا اور ساری کوٹھی کا چکر لگاتا تھا۔ دوسرا گھونٹ پیتا اور موٹر میں چابی دلوا کر اور چلا کر دیکھتا تھا۔ نو بھی بج گئے۔ سوما جھلا گئی۔ اس نے بدلو اور مالی سے دریافت کرایا۔ رات کہیں صبح ہی ڈیوٹی پر جانے کے بارے میں کچھ کہہ تو نہیں گئے تھے؟ اب وہ چاہ رہی تھی کہ اکیلے ہی جا کر، اپنا گھر جھاڑے پونچھے۔ جھلاہٹ کی وجہ سے ماں جی یا بھابی جی سے کچھ پوچھ نہ سکی۔ جانے سے پہلے دیپا کا فراک بدل کر، اس کے سر میں کنگھی کر کے فیتہ باندھ رہی تھی کہ بدلو نے آ کر گھبراہٹ سے کہا۔ "دھن سنگھ کی لاڑی (بہو) باہر تھانے کے سپاہی آئے ہیں۔ داروغہ بھی ہیں۔ تجھے بلا رہے ہیں۔"

سوما نے گونگی اور بہری کی طرح چپ پھیلی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ منہ سے 'کیا؟' بھی نہ نکلا۔ ہاتھ سے دیپا کے سر میں باندھنے کا فیتہ گر گیا۔ وہ سُن ہو کر رہ گئی۔

پولس کوٹھی پر آ کر سوما کو بلا رہی تھی۔ کوٹھی میں ہلچل مچ گئی۔ بھابی نے گھبرا کر سوما سے پوچھا۔

کیا ہوا ؟ دھن سنگھ کہاں ہے ؟ " کیا صبح نہیں آیا ؟ کیا کہیں موٹر کی ٹکر لگ گئی ؟ کسی کو چوٹ لگی ہے ؟ .... ہائے کیا بات ہے ؟ پولس والے کیا کہتے ہیں ؟ "

ماں جی اپنے ہاتھوں سے دہی میں سے مکھن نکال رہی تھیں ۔ سُنا تو لتھڑے ہوئے ہاتھ لیے اُٹھ آئیں ۔ انھوں نے بھی اس واقعہ کی وجہ پوچھی ۔ اور کہہ بیٹھیں ۔ " بھائی وہ تو خطرناک آدمی ہے ۔ میں تو پہلے ہی ڈرتی تھی ۔ کیا کوئی جیل ویل کی بات تو نہیں ہے ۔ ؟ جاکر لالہ جی کو خبر دو یا جگدیش (بیرسٹر) سے کہو ۔ "

منورما نے سوما کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ۔ " بتا تو سہی کیا بات ہے ؟ "

سوما رو پڑی ۔ " آپ جانتی ہیں ۔ میں کل شام سے یہیں ہوں ۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں ۔ رات کب آئے اور کیا کہہ گئے ۔ صبح سے راہ دیکھ رہی تھی ۔ "

منورما نے فکرمند ہو کر کہا ۔ " تو یہیں بیٹھ ۔ میں بھائی سے کہتی ہوں ۔ "

بیرسٹر صاحب نے آکر سوما کو صلاح دی ۔ " مسز سنگھ پہلے ہم پولس سے بات کرلیں ، اس کے بعد تم بیان دینا ۔ تم پولس کے ساتھ جانا مت ۔ ایک دفعہ پولس کے ہاتھ پڑ جاؤگی تو پھر نکلنا کٹھن ہو جائے گا ۔ "

سوما گھٹنے میں سر دبائے بیٹھی روتی رہی ۔ پولس کے ہاتھ پڑنے سے تو وہ جان دے دینا اچھا سمجھتی تھی ۔

بیرسٹر سرولا نے داروغہ سے بات کی ۔ داروغہ سے معلوم ہوا کہ دھن سنگھ کی کوٹھری کے سامنے ایک لاش پائی گئی ہے ۔ اور دوسرا آدمی بھی تشویش حالت میں گھایل پایا گیا ہے ۔ دونوں کے سر پھٹے ہوئے ہیں ۔ دھن سنگھ کی کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا اور وہ لاپتہ ہے ۔ داروغہ تحقیقات کے لیے سوما کو کوتوالی میں لے جانا چاہتا تھا ۔

بیرسٹر سرولا نے داروغہ سے دلیل کی ۔ مسز سنگھ کل شام سے اس کوٹھی پر ہے ۔ رات جس وقت دھن سنگھ لالہ جی کو لے کر آیا تھا ، جلدی میں یہاں سے چلا گیا تھا ۔ اس کی ملاقات اپنی عورت سے نہیں ہوئی تھی ۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ دھن سنگھ نے یہ قتل کیا ہے ، یا حملہ کرنے والوں میں سے دو چوٹ کھا کر گر گئے اور باقی لوگ دھن سنگھ کو مار کر اس کی لاش اُٹھا لے گئے ہیں ۔ مسز سنگھ اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہے ؟ بیرسٹر نے کہا ۔ " ہم بھی بیرسٹر ہیں ۔ آپ قانوناً تحقیقات کیجیے ۔ قانون کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے لیکن مسز دھن سنگھ کو آپ حراست میں نہیں لے سکتے ۔ اس سے تحقیقات کر سکتے ہیں ۔ وہ شریف عورت ہے ۔ مسٹر دھن سنگھ ہمارے گیرج کا مینجر ہے ۔ اگر آپ کو مسز دھن سنگھ کے فرار ہونے کا ڈر

ہے تو ہم انھیں گاڑی میں بٹھاکر ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے جانے کو تیار ہیں ۔ وہ کہیں تو ہم ضمانت دینے کے لیے تیار ہیں ۔ آپ کیا ضمانت چاہتے ہیں ؟ آپ جو سوال مسز سنگھ سے پوچھنا چاہیں ، ہمارے سامنے پوچھ سکتے ہیں ۔ جب ان کی حاضری کی ضرورت ہوگی ، جس عدالت میں ، یا جس مجسٹریٹ کے سامنے عدالت کا حکم ہوگا انھیں ہم پیش کر دیں گے ۔"

بیرسٹر سرولا کے مشورے سے منورما نے اندر جاکر سوما کے منھ ہاتھ دھلاکر کنگھی کی اور اسے اپنے کپڑے پہناکر داروغہ کے سامنے لے آئی ۔ اُس کے آتے ہی بیرسٹر ایک خاتون کے احترام میں کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ داروغہ کو اُس کے ساتھ اُٹھنا پڑا ۔ بیان دینے کے لیے سوما کو کرسی پر بٹھایا گیا ۔ اُس کے ایک طرف منورما بیٹھی اور دوسری طرف بیرسٹر خود بیٹھا تھا ۔

داروغہ بڑے احترام سے ، مسز سنگھ کہہ کر سوما کو مخاطب کر رہا تھا ۔ داروغہ نے پریشانی پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں کہی ۔ بلکہ سوما کے دُکھ سے دُکھی ہو کر مسٹر دھن سنگھ کو ڈھونڈنے اور پوری مدد کرنے کا یقین دلایا ۔

سوما کا صرف یہی بیان تھا کہ دھن سنگھ رات کو باہر رہ جاتا ہے تو گھر میں اکیلے ہونے کی وجہ سے اُسے ڈر لگتا ہے ۔ ایسی حالت میں وہ ہمیشہ کوٹھی پر آجاتی ہے ۔ سب لوگ گواہ تھے کہ ایسا ایک بار ہی نہیں ہوا ، ہمیشہ ہوتا تھا ۔ وہ پچھلی شام سورج کے ڈوبنے سے پہلے ہی کوٹھی پر آ گئی تھی ۔ اُس کے بعد دھن سنگھ کے بارے میں اسے پولس ہی سے خبر ملی تھی ۔

سوما نے منورما اور بیرسٹر کی مدد سے پولس کے سامنے جیسے تیسے بیان دے دیا ۔ لیکن اس کے ہوش و حواس ٹھیک نہیں رہے تھے ۔ اُس کے پیٹ میں بہت زور کا درد اُٹھ رہا تھا ۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے کیسا درد اُٹھ رہا تھا ۔ لیکن کس سے کہتی ۔ وہ ماں جی اور بھابی سے ڈرتی اور ہچکچاتی تھی ، اور منورما کنواری لڑکی تھی ۔ اسے پچھلے سال منورما نے جس کمرے میں ٹھہرا دیا تھا وہاں اب دونوں بچے سوتے تھے ۔ درد کے مارے اُس کے منھ سے چیخ نکل جانا چاہتی تھی ۔ وہ دوپٹے کا آنچل منھ میں دبائے کبھی اِس دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھتی ، کبھی اُس دیوار سے ۔ منورما نے دیکھا تو اسے کندھے کا سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے آئی ۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی ۔ اُس نے ماں جی اور بھابی کو بھی بلا لیا ۔

ماں جی اور بھابی نے آپس میں آہستہ آہستہ بات کی اور منورما سے کہا ۔ منو تو دوسرے کمرے میں چلی جا یا اسے دوسرے کمرے میں پہنچا دے ۔"

"اِسے یہیں رہنے دیجیے۔" منورما خود ہی باہر نکل گئی۔

بیرسٹر جگدیش نے معاملہ بھانپ کر لالہ جی کے منشی کو حکم دے دیا۔ فوراً لیڈی ڈاکٹر کو گاڑی پر لے آئے۔

شام ہوتے ہوتے سوما کا چار مہینے کا حمل گر گیا۔ وہ منہ چھپائے دل اور بدن کے درد سے رو رہی تھی۔ منورما بار بار آکر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیتی۔ اسے بار بار سوما کے پاس دیکھ کر بھابی نے دبے لہجے میں ڈانٹ دیا۔ "کیسی لڑکی ہے؟ تجھے تو کہا کہ رہنے دے۔ یہ تیری سمجھ کا کام نہیں ہے۔"

منورما کوٹھی کے دوسری طرف چلی گئی اور برآمدے میں پڑی ہوئی کپڑے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بے بسی میں دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے پیچھے دبا لیا۔ آسمان صاف تھا۔ منورما کی نظر 'تری یڈ' کی برفانی چوٹیوں پر تھی۔ پہاڑ کی سفید چوٹیاں ڈوبتے سورج کی کرنوں سے گلابی ہو رہی تھیں وہ چوٹیاں اپریل میں برف کی دیوار سی دکھائی دیتی تھیں۔ برسات میں پہاڑیوں پر بہت سی برف پگھل چکی تھی۔ پھر بھی سورج کی کرنوں کی جوت جگانے کے لیے کافی برف موجود تھی۔ برفانی چوٹیاں اور اُن پر منڈلاتے بادلوں کے ٹکڑے گلابی ہو رہے تھے۔ منورما سورج غروب ہونے کے اس نظارے کو دیکھنے کے لیے بیسیوں بار اِس جگہ پر بیٹھ چکی تھی۔

منورما پچھلے برس بھوشن کی گرفتاری سے پہلے اسی جگہ بیٹھ کر اپنی زندگی کے مستقبل کی بات سوچا کرتی تھی۔ یہاں بیٹھ کر اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ لیکھک بن کر اپنی زندگی کو مطمئن بنائے گی۔ وہاں بیٹھ کر ہی اُس نے سوچا تھا کہ سورج اور زمین کے ایک حصے کی جدائی بھی کتنی حسن کی تخلیق کر دیتی ہے۔ محبت کے یقین میں جدائی کا دکھ دل کی دولت کی شکل میں محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ وہ سوچتی تھی بے چاری سوما کی کلپنا (فکر) محدود ہے۔ وہ دکھ کے پہلو میں سُکھ کو نہیں پہچان سکتی۔ ہر شام نیا سورج نکلنے کا پیغام لے کر آتی ہے۔ یہی تو زندگی ہے۔

منورما اُس شام بیٹھ کر یہی سوچ رہی تھی۔ عورت کے لیے محبت کا انجام خون ہے اب دل کا خون اور بدن کا خون! مرد صرف ٹھوکر مار کر چلا جاتا ہے۔ بھوشن بھی، دمن سنگھ بھی، اور بے رنگ ہو کر پچھم میں جا چھپنے والا سورج بھی! لیکن زمین مسلسل اپنا خون پھیلا رہی ہے۔ یہی عورت کی تقدیر ہے اور یہی اُس کا سکھ بھی ہے۔

اس واقعہ کے بعد منورما اور بیرسٹر نے سوما کو کوٹھی سے باہر نہیں جانے دیا۔ سوما خود بھی

جانا نہیں چاہتی تھی۔ پولس کے دونوں روپ اُس نے دیکھے تھے۔ بیج ناتھ کے تھانے میں جہاں وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے داروغہ کے سامنے کھڑی کانپ رہی تھی۔ اور دل چسپی کے لیے اُس کے سر کا آنچل کھینچ کر اُس کے چہرے پر لالٹین کی روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ جہاں اُس کے رونے اور انکار کے کوئی معنی نہیں تھے۔ اُس تھانے کی کوٹھریوں میں گزاری پانچ راتوں کی یاد اُس کی زندگی کی سب سے ہول ناک یاد تھی۔ سوما اُسے بُرا خواب سمجھ کر بھلا دینے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

پولس کا دوسرا روپ ——— سوما کرسی پر بیٹھی تھی۔ داروغہ صاحب سامنے کھڑے تھے۔ اس طرح بات کرتے تھے۔ جیسے اُس کے نوکر ہوں اور معافی مانگ رہے ہوں۔ یہ صرف بیرسٹر سروِلا اور منورما کی مہربانی تھی۔ ورنہ وہ خود کیا تھی! اس کی حالت تو ایسی ہی تھی، جیسے مٹھائی کھانے کے بعد دونے کو مروڑ کر پھینک دیا جائے۔ اگر اس رات وہ کوٹھری میں ہوتی اور پولس اسے پکڑ کر حوالات میں لے جاتی تو اُس کا کیا ہوتا۔ دھن سنگھ کے بغیر زندگی ناممکن تھی۔ مگر دھن سنگھ کے بغیر حوالات کی زندگی میں، اور بیرسٹر صاحب یا منورما کی پناہ کی زندگی میں فرق تھا۔ سوما یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

سوما یہ جانتی تھی کہ اِس جھنجھٹ سے لالہ جی اور ماں جی خفا تھے۔ انھوں نے کہا تھا۔ خواہ مخواہ افسروں سے جھنجھٹ کرنا ٹھیک نہیں۔ سوما جوان عورت ہے۔ لوگ ہزاروں قسم کی بات بنائیں گے۔ لیکن منورما اور بیرسٹر، لوگوں کی، خاص کر اپنی حیثیت سے نیچے کے لوگوں کی باتوں کی پرواہی کیوں کرتے؟ نیچی سطح یا متوسط طبقے اِن پر تنقید بھی کیا کرتے؟ نیچے درجے کے لوگ دراصل اپنی حیثیت کے لوگوں کی غلط روی کو نہیں سہہ سکتے۔ بڑے لوگوں کے لیے وہ دوسرے ہی اصول اور آدرش سمجھتے ہیں۔ راہ میں کوئی کسی پر مٹھی بھر دُھول پھینک دے تو اُسے نہیں سہا جا سکتا۔ لیکن آندھی سے سیروں دُھول ہمارے سر اور آنکھوں میں آ پڑے تو صرف اپنی قسمت کو الزام دے کر رہ جاتے ہیں۔ آندھی کی مخالفت نہیں کرتے۔

سوما بہت اُداس رہتی تھی۔ اور سوچتی تھی کہ کسی حق کے بغیر اِن لوگوں کی مہربانی پر پڑی تھی۔ اِس مہربانی کی حق دار بننے اور اپنا دُکھ بھلانے کے لیے وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی تھی۔ بھابی بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بھابی کے لیے تو سوما جیسے بھگوان کی مہربانی تھی۔ منورما اِس بات پر بگڑتی رہتی۔ اُس نے کئی بار سوما کو برتن مانجھتے وقت باہنہ سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔ اور ہاتھ سے بالٹی اور میلے کپڑے، چھین کر پٹک دیے۔ اور اس کے میلے کپڑے زبردستی اُتروا کر اپنے کپڑے دیے اور کہا۔ "تم نوکر نہیں ہماری مہمان ہو۔"

سوما کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ مہمان کوئی کتنے دن تک رہتا ہے؟ اور پھر مہمان داری برابری کے لوگوں میں ہوتی ہے۔

منورما سوما کا جی بہلائے رکھنے کے لیے اسے اکیلی نہ بیٹھنے دیتی۔ اُسے پاس بٹھا لیتی۔ اُس سے پڑھنے کے لیے ضد کرتی۔ منورما کی زندگی اور مسئلوں سے تعلق رکھنے والی باتوں کو سمجھنا سوما کے لیے ممکن نہ تھا۔ منورما ایسی باتیں کرنے کی کوشش کرتی کہ سوما سمجھ کر جی لگا سکے، کبھی منورما گھومنے کے لیے ساتھ چلنے کو کہتی۔ سوما کی اپنی کوئی رائے یا خواہش نہ تھی۔ وہ ڈری ہوئی نظروں سے منورما کو دیکھ کر کہتی، جیسا آپ کہیں۔ منورما ہر بات میں سوما کی منظوری سے، کسی کبھی بات میں اس کی مخالفت یا اُس پر اعتراض نہ کرنے سے چڑ جاتی۔

سوما پہلے بھی منورما کی عزت کرتی تھی۔ لیکن اب اگر منورما اسے سیر کے لیے ساتھ چلنے کو کہتی تو سوما کو شرم اور ہنسی آجاتی تھی۔ غریب چھوٹے آدمی کب سیر کرتے ہیں؟ اس نے کبھی سیر نہ کی تھی۔ نہ کسی کو کرتے دیکھا تھا۔ دل بہلانا بھی ایک کام ہوتا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا۔ اُس نے شادی بیاہ میں عورتوں کو گیت گاتے دیکھا تھا۔ خود بھی گیت گائے تھے۔ مگر وہ تو بہت ضروری کام تھا۔ خاص موقعوں پر دوسرے کام چھوڑ کر بھی گیت گانے کا کام کرنا پڑتا تھا۔

منورما کو سوما کا حسن اور اُس کا رُوپ بہت بھاتا تھا۔ ایک دن اُس کا چھریرا بدن دیکھ کر بیرسٹر کی تجویز پر منورما نے اپنی طرح کی ساڑی پہننے کے لیے کہا تھا۔ سوما شرم سے مرگئی۔ "ہائے!" اُس کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ یہ بھی کوئی پہناوا ہے کہ نیچے سے بالکل کھلا!..... مرجائے تو بھی نہیں پہن سکتی!

سوما یہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ منورما بے شرم تھی۔ وہ مانتی تھی کہ بڑے لوگوں کی بات دوسری تھی۔ لیکن دھن سنگھ کے بھاگنے کے دن پولس کے سامنے جانے کے لیے اسے منورما نے اپنی ساڑی پہنادی تھی تو اُس نے کچھ اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب اسے نہ تو شرم اور ہچکچاہٹ کی فرصت تھی، اور نہ اپنے دل سے اچھا برا یا مناسب غیر مناسب سمجھنے کی۔ اسے جو کچھ کہا جاتا نباہ دیتی تھی۔ یہی بات منورما کو دُکھی کردیتی تھی، اور وہ سوما پر جھلا اُٹھتی مگر سوما شکر گزاری کے ساتھ آنکھیں پونچھ لیتی۔

بیرسٹر سرولا بھی سوما سے ہمدردی کرتے رہتے تھے۔ "مسز سنگھ گھبراؤ مت، معلوم ہوتا ہے۔ کوئی جھگڑا ہوگیا ہوگا۔ دھن سنگھ نے ارادے سے تو قتل کیا نہیں ہوگا۔ کچھ دن میں معاملہ دب جائے گا۔ دھن سنگھ لوٹ آئے گا۔ اُس وقت تک تم یہاں اپنا گھر سمجھو۔"

اکتوبر کے سنہرے دن دھرم شالہ میں پھر آگیے۔ نیلا آسمان، جگہ جگہ پھول، ہوائیں صحت بخش۔ عدالتیں

چھٹیوں کے بعد کھل گئی تھیں۔ اِن لوگوں کے لاہور چلے جانے کی بات اُٹھتی رہتی تھی۔ لیکن پہاڑ میں یہی موسم صحت کے لیے زیادہ فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔ اِس لیے پہاڑ سے لوٹنے کی بات پرسوں، نرسوں پر ٹلتی جا رہی تھی۔ بیرسٹر نے منورما کو سمجھایا کہ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد ماں جی اور لالہ جی کا کیا پتہ ؟ سوما کو رکھیں یا جنجال سمجھ کر اسے اپنا بندوبست کرنے کے لیے کہہ دیں ؟ منورما نے کہا " ہم اسے ساتھ لاہور لے جائیں گے۔"

منورما کی بھابی بدن سے بھاری اور کمزور ہونے کی وجہ سے سوما کی محنت کی عادت اور غریبی پر بہت مہربان ہوگئی تھیں۔ اُن کے دونوں بچوں کو سنبھالنا اور اتنی بڑی جنجال گرہستی کی دیکھ بھال ممکن نہ تھی۔ سوما کو وہ دیکھ اور سمجھ چکی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے ڈھیلے بدن پر چھوٹی سی گردن سے جڑے بھاری چہرے کو ہلا کر کہا۔" ہائے اس کے بغیر بچے کیسے رہیں گے ؟ سدا اسی کو یاد کرتے رہیں گے میں اکیلی کیا کیا کروں گی ؟ سوما تو ہمارے ساتھ جائے گی۔ یہاں اسے کرنا کیا ہے ؟"

پرائی لڑکی کی بلا اپنے سر لینا لالہ جی اور ماں جی کو عقل مندی نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن جب سارا گھر سوما کو لاہور لے جانے کے لیے تیار ہو گیا تو اُنھوں نے بھی کہا۔" ہم کیا کہیں ! تم سب لوگ سمجھ دار ہو سوچ سمجھ کر جیسا مناسب سمجھو، کرو۔"

سوما سے کسی نے رائے نہیں لی۔ دبے دبے بات کئی بار اُٹھتی رہی کہ سوما بھی منّا بھابی اور بچّوں کے ساتھ لاہور جائے گی۔

پہاڑ میں سوما کا کوئی اپنا نہ رہ گیا تھا۔ پہاڑ سے وہ صرف دُکھ بھری یادیں لے کر جا رہی تھی۔ پھر بھی اپنا دیش چھوڑتے وقت، جیوں جیوں موٹر پہاڑ سے اُترتی جا رہی تھی، سوما کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ سب کی آنکھ بچا کر خوب روئی۔

سوما اپنا دیس چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اُس کی دُنیا بدل رہی تھی۔ دیس سے ایک بار پاؤں اُکھڑ جانے پر نہ جانے پھر کہاں جا کر پاؤں ٹک پائیں گے۔ لیکن وہ کرتی کیا ؟ دنیا کی مصیبتوں کی دھوپ سے وہ منو بی بی اور بیرسٹر صاحب کے سائے میں پناہ پا رہی تھی۔ وقت کے بدل جانے کی وجہ سے اُس سائے کی جگہ بدل جانے پر سوما کی جگہ بدلنا بھی لازمی تھا۔

جیل سے بچ کر جیل میں

سمندر کی سطح سے سات ہزار فٹ اونچی بادلوں میں چھپی رہنے والی دھرم شالہ کی بستی سے دھن سنگھ اندھیری رات میں پگڈنڈیوں کی راہ ایسی تیزی سے اُترتا چلا جا رہا تھا جیسے پہاڑ کی ڈھلوان سے اُکھڑ کر لڑھکتا جانے والا پتھر نیچے چلا جاتا ہے۔ جسے راہ دیکھنے اور پہچاننے کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ دھن سنگھ اپنی دلی تحریک سے مقررہ راہ سے مقررہ جگہ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ راہ میں اُس نے دو تین بار کھڑے ہو کر پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں آ رہا تھا لیکن اس اطمینان سے اُس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس دشمن سے وہ بھاگ رہا تھا، اُس کی پہنچ اور طاقت کی کوئی حد نہ تھی۔ سرکار اور پولس پانچ کیا پچاس میل تک اپنے ہاتھ بڑھا کر اُس کی گردن دبوچ سکتی تھی۔ ہر پل اسے محسوس ہوتا تھا کہ سرکار اور پولس کی طاقت کا نہ نظر آنے والا ہاتھ اُس کی گردن کو چھوا ہی چاہتا ہے اور وہ اور بھی تیزی سے بھاگتا جا رہا تھا۔

دھن سنگھ اپنی اور اپنی عورت کی عزّت پر چوٹ سے بوکھلا اُٹھا تھا۔ اُس نے اپنی عزّت کی حفاظت کے لیے، اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے خوف کی پروانہ کی تھی۔ "شمشل اور جگّی" دو تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ اُن کے پاس چھُرے ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ ڈرا نہیں تھا۔ اب اُن کے مر جانے پر وہ ڈر رہا تھا۔ اب سرکار اُن کی طرف تھی۔ سڑک سے جانا آرام دہ ضرور ہوتا۔ لیکن راستہ ڈیوڑھا دوگنا ہو جاتا۔

دھن سنگھ کانگڑا کی بستی سے نکل گیا۔ جگہ جگہ اُس کی آہٹ یا بو پا کر کُتّے بھونکنے لگتے تھے۔ وہ بستیوں سے دور رہتا۔ دھن سنگھ کو اس وقت جنگل کے ریچھوں، شیروں اور بھیڑیوں کا ڈر نہ تھا۔ اُسے ڈر تھا تو آدمی سے۔ لیکن جنگلوں اور کھوہوں میں چھپے رہنے سے اُس کا نباہ کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ آدمی تھا۔ اُس کے ہر کام کے لیے آدمیوں کی ضرورت تھی۔

اگست کا مہینہ تھا مگر دھن سنگھ کی خوش نصیبی سے اُس رات بارش نہیں تھی۔ آسمان میں تارے کھل رہے تھے۔ کبھی کبھی ہلکے بادل تاروں کو پل بھر اوٹ میں کر کے چلے جاتے تھے۔ ہوا میں نمی

اور ٹھنڈک تھی، لیکن دھن سنگھ تیز چل رہا تھا۔ پیاس کے مارے وہ دو بار قُل قُل کرتے پہاڑی سوتوں کے کنارے جھکا اور پانی پی کر پھر چل دیا۔ اونچے پہاڑ، پھر نیچے پہاڑ، پہاڑیاں وہ اُترتا چلا جا رہا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک کم ہوتی جا رہی تھی۔

دھن سنگھ کو پہاڑ میں چھپ کر جان بچانے کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا۔ جگہ جگہ گنے چُنے آدمی اور گھرانے۔ یہ لوگ دس بارہ کوس کے پڑوس میں ہر شخص کو یا اُس کے گھر والوں کو اور کام کو جانتے تھے۔ کسی نیے آدمی کو دیکھتے ہی وہ چونکتے تھے، یہ کون ہے۔ یہاں کیوں آیا ہے۔ دھن سنگھ کو اِس سوال سے ڈر تھا۔ ڈرائیوری کے لائسنس کی شکل میں دھن سنگھ کا نام، گھر اور جگہ، اِس کے فوٹو کے ساتھ اس کی جیب میں موجود تھا۔ ایک جگہ سگریٹ جلاتے وقت اُس نے اپنی پہچان کو جلا دیا۔ اپنی پہچان کے نشان کو مٹا دینا ضروری تھا۔

سورج نکلتے وقت دھن سنگھ برسات کی وجہ سے خوب بھری ہوئی اور شرتی بنی بیاس ندی کے کنارے چٹان پر کھڑا تھا۔ دوسری طرف سامنے دیہرا گوپی پور کا قصبہ اور تھانہ تھا۔ دھن سنگھ تھانے کی طرف نہ جاکر ہوشیارپور جانے والی سڑک پر چلتا گیا۔ برسات کے موسم میں اِن سڑکوں پر موٹروں کا آنا جانا رُک جاتا تھا۔ پہاڑ عام طور ریتیلے ہیں۔ ندی نالوں پر پُل نہیں ہیں۔ دھن سنگھ چلتا ہی گیا۔ اُس کے گھٹنے اور پاؤں تھک کر چور ہو گیے تھے لیکن وہ چلتا ہی جا رہا تھا۔ سڑک پر جگہ جگہ خچروں پر مال ڈھونے والے، یا چھوٹی موٹی گٹھری اُٹھائے مسافر مل جاتے تھے۔ کچھ مسافر اپنے مقدموں میں پیشی کے لیے اِس یا اُس تحصیل میں جا رہے تھے۔ مقدموں کے کاغذ ٹین کے ڈھکن والے نل میں محفوظ، اُن کے ہاتھ یا بغل میں تھے۔ کاغذوں کو وہ خود پڑھ یا سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اِن کاغذوں میں ان کی قسمت کے مسئلے تھے لیکن اُسے ان لوگوں کے وکیل، عدالت یا پولس والے ہی پڑھ سکتے تھے۔ یہ لوگ اس فیصلے کے معاملے میں بے بس تھے۔

کچھ مسافر لمبے تگڑے جوان تھے۔ وہ خوب سنوار کر اینٹھی ہوئی نوک والی پگڑی باندھے تھے۔ یہ انگریزی فوج کے ڈوگرے سپاہی تھے۔ کچھ چھٹی پر گھر آ رہے تھے اور کچھ واپس جا رہے تھے۔ چھٹی پر آنے والوں کے چہرے خوش اور واپس جانے والوں کے اُداس تھے۔ لڑائی چل رہی تھی۔ گھر سے جاتے وقت سپاہیوں کے دل میں ڈر رہتا تھا، لوٹ کر آسکیں گے یا نہیں! یہ لوگ سڑک کے کنارے اونچی اُٹھی ہوئی مکئی اور دھان کی فصلوں کو ممتا بھری اُداس نظروں سے دیکھتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے کھیتوں میں ایسی ہی کھڑی فصل چھوڑ کر جا رہے تھے۔ چھٹی کے وقت میں انھوں نے

اپنے کھیت جوت کر فصل بو دی تھی۔ اِن کے چلے جانے پر اِن کے گھر کے لوگ فصل کاٹیں گے۔ فصل بوتے وقت ان کے بدن مٹّی، کیچڑ اور کھاد سے لت پت ہو جاتے۔

سپاہی چھاؤنی میں جا کر بوٹ اور وردی پہنیں گے۔ موٹر پر سوار ہو کر بندوق اور مشین گن چلائیں گے۔ لیکن مٹّی اور فصل کی محبت اور میل پسینے، گھی دودھ سے مہکتے بیوی بچوں کی محبت اُن کے قدموں کو مفلوج بنا رہی تھی۔ اُن کے گاؤں میں زندگی حقیر تھی۔ فوج میں رعب دار مگر ساتھ میں موت کا خوف بھی تھا۔ اِس خوف کے باوجود وہ لوگ چھاؤنی میں واپس جانے کے لیے مجبور تھے۔ گھر میں زندگی کی حفاظت کے لیے موت کی نوکری ضروری تھی۔ اُنھیں روپیہ چاہیے تھا جو ان کے کھیتوں کی زمینیں نہیں دے سکتی تھیں۔ فوج کی نوکری دیتی تھی۔ گھر آکر بھی وہ لوگ سرکار کے ڈر سے گھر سے لوٹ رہے تھے۔ سرکار کا ڈر کتنا زیادہ اور کٹھور تھا۔ دھن سنگھ بھی اسی ڈر سے بھاگ رہا تھا۔

دھن سنگھ لگاتار بیس گھنٹے چھیاسٹھ میل چل کر، ہوشیار پور پہنچ گیا۔ تھکاوٹ سے اُس کے بدن کا پرزہ پرزہ بکھر اجا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا، کہیں لیٹ جائے۔ اِس شہر میں لوگ اسے جانتے تھے۔ اِس لائن پر کچھ مہینے موٹر چلا چکا تھا۔ موٹر کے اڈّے پر کوئی جانا پہچانا مل سکتا تھا۔ اِس لیے اُدھر نہیں گیا۔ جی کڑا کر کے اُس نے کچھ کھانا کھایا۔ لیٹنے کے لیے دھرم شالہ میں پہنچا۔ چار پیسے میں چار پائی کرائے پر لے کر لیٹ گیا۔ پہاڑوں سے نیچے آکر دھن سنگھ کا بدن گرمی سے پسیج رہا تھا۔ محنت کرنے پر جیسے پسینہ بہہ کر بدن ہلکا ہو جاتا ہے۔ ویسے نہیں۔ بدن پر تیل سا پھیل گیا تھا۔ آس پاس مسافر عام طور پر ننگے بدن کھاٹوں پر لیٹے تھے اور پنکھا یا انگوچھا ہلا کر گرمی اور مچھروں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عورتیں اس گرمی میں بھی ڈھکی ہوئی اور کپڑے اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔

دھن سنگھ کا گرمی سے دم گھٹتا معلوم ہو رہا تھا۔ تھکن کی تکلیف سے اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اُسے یاد آرہا تھا۔ کل اِس وقت، اس نے ان دونوں بدمعاشوں کو مار گرایا تھا۔ پولس اسے دھرم شالہ، کانگڑا، پٹھان کوٹ یا ہمیر پور میں ڈھونڈ رہی ہوگی۔ وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ اگر پکڑا جاتا تو اس وقت حوالات میں بند ہوتا۔ اسے بیچ ناتھ میں لگ بھگ اسی وقت پکڑ کر تھانے میں بند کیے جانے کی بات یاد آئی۔ وہاں اُس پر پڑی مار سے زیادہ سوما کے ساتھ ہونے والا سلوک یاد آیا۔ وہ سوچ رہا تھا، اگر وہ تھانے دار مل جائے تو وہ اس ظلم کا بدلہ اچھی طرح لے۔ اُس بہن ..... نے مجھے آدمی نہیں سمجھا تھا۔

دھن سنگھ کو سوما کی یاد آئی۔ اگر وہ پولس کے ہاتھوں میں پڑ گئی تو کیا ہوگا؟ اُس نے بھاگ کر اپنی جان بچالی تو کیا فائدہ؟ اِس سے تو یہی اچھا ہوتا کہ سوما کو اپنی آڑ میں لے کر پولس سے لڑتا ہوا

مرجاتا۔ بیج ناتھ کے تھانے دار کی بے ڈھنگی صورت اُسے بار بار یاد آ رہی تھی۔ وہ تھانے دار پہاڑی دیس کو گالیاں دے رہا تھا۔ یہ ہے اُس تھانے دار کا دیس، جہاں دم گھُٹا جا رہا ہے۔ دھن سنگھ کا جی چاہا، پھر اُڑ کر دھرم شالہ کی ٹھنڈک میں پہنچ جائے۔ وہاں آدمی سانس تو لے سکتا ہے۔

ایک آدمی کی آواز دیر سے اُس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ آدمی اب اور اونچا بول رہا تھا۔ دھن سنگھ کروٹ لے کر اُس کی بات سُننے لگا۔ وہ آدمی فوج اور لڑائی کی باتیں سنا رہا تھا۔ فوج میں سُکھ کی باتیں۔ جہاں وردی اور بوٹ مفت ملتے ہیں۔ کھانے کے لیے گوشت، دودھ اور میوے ملتے ہیں۔ ساری تنخواہ جیب میں۔ وہاں خوب صورت عورتیں ہیں آ آ کر خوب بات کرتی ہیں۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اُس سے اُلجھنے لگا۔ "تو نے لام دیکھا ہے کبھی؟ تو رنگروٹ بھرتی کرا کے سرکار سے کمیشن کھاتا ہے۔ ہم نے فرانس اور مسوپوٹامیا کی لڑائی دیکھی ہے۔ تین تین دن پانی نہیں ملا۔ خچر مار مار کر کھائے......!"

آس پاس بیٹھے لوگ اِن دونوں کے جھگڑے پر ہنس رہے تھے۔

سرائے کے پھاٹک سے چار آدمی اندر آ گئے۔ دو کے ہاتھ میں لالٹینیں تھیں۔ ایک بجلی کی بتّی لیے تھا۔ ایک کے ہاتھ میں رجسٹر تھا۔ وہ لوگ گھوم کر مسافروں کو دیکھ رہے تھے اور ان کے نام پوچھ پوچھ کر رجسٹر میں درج کرتے جا رہے تھے۔

فوج کے آرام کی کہانی سُنانے والے آدمی نے ان لوگوں کے پاس فریاد کی۔ "حوال دار صاحب یہ دیکھیے یہ باغی آدمی ہے۔ لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے سے بہکاتا ہے۔"

دھن سنگھ نے پہچانا، یہ لوگ معمولی کپڑے پہنے پولس کے آدمی تھے۔ کیا اُسی کی تلاش میں آئے تھے؟ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

پولس کے آدمیوں نے دھن سنگھ کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ فوج میں بھرتی ہونے سے لوگوں کو بہکانے والے آدمی سے اُلجھے ہوئے تھے۔ ادھیڑ آدمی صفائی دے رہا تھا کہ وہ ۳۶ نمبر ڈوگرہ رائفلز میں سپاہی ہے۔ اُس نے اپنے کاغذات دکھائے۔ پولیس والوں نے اسے بغاوت پھیلانے کے جرم میں ساتھ چلنے کو کہا۔

دھن سنگھ ویسے ہی بے پرواہی سے لیٹا ہوا پولس والوں کی باتیں دھیان سے سن رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ لوگ فوج سے بھاگے ہوئے سپاہیوں اور سیاسی بدمعاشوں کی تلاش کر رہے تھے۔

دھن سنگھ صبح کو نیند سے اُٹھا تو اس کے بدن کے سارے جوڑ درد کر رہے تھے۔ وہ بازار میں

گھومنے چلا گیا۔ پولیس کو دیکھ کر اُس کا جی گھبرانے لگتا تھا۔ پولیس کی وردی یہاں بھی ویسی ہی تھی جیسی دھرم شالہ اور کانگڑے میں تھی۔

دھن سنگھ سوچ رہا تھا، اسے کوئی کام تو کرنا ہوگا۔ اُسے ایک کام آتا تھا۔ موٹر چلانا۔ ہوشیارپور میں اُسے پہچاننے والے مل سکتے تھے۔ اُس کا ضلع یہاں سے تھا ہی کتنی دور! موٹر پر کچھ گھنٹے کا راستہ۔ اُس نے طے کیا کہیں دور چلا جائے تو مطمئن ہو سکے گا۔ یہ سوچتا سوچتا اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا۔ کہاں جائے؟ لاہور؟ امرتسر؟ امرتسر اور لاہور تک وہ جوالا سہائے کی موٹر پر جا چکا تھا۔ اُس کے لیے سب سے محفوظ جگہ وہی تھی جہاں وہ کبھی نہیں گیا تھا۔

بیس گھنٹے تک لگاتار پیدل سفر کرنے کے بعد گاڑی میں بیٹھے بیٹھے سفر کرنا دھن سنگھ کو بڑا آرام دہ محسوس ہوا۔ پہلا اطمینان اسے یہ تھا کہ وہ خطرے سے دور چلا جا رہا تھا۔ سوما کی فکر تھی، اُس کا کیا ہوگا؟ یقین تھا کہ لالہ جی اور خاص کر منورما بی بی اُس کی مدد ضرور کریں گے۔ منو بی نے پہلے بھی اُس کی مدد کی تھی۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ اِس ڈبے میں ایک عورت اپنے مرد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ لوگوں کے سامنے جھجک کی وجہ سے دونوں آپس میں باتیں نہیں کر رہے تھے، اور کرتے بھی تو بہت آہستہ سے۔ دھن سنگھ سوچ رہا تھا، اگر وہ سوما کو لے آتا تو ایسے ہی ساتھ لے جاتا، لیکن اسے کہاں لے جاتا؟ خود تو وہ سرائے میں پناہ لے لے گا لیکن سوما کو دیکھ کر پولیس والے قدم قدم پر ٹوکتے۔

گاڑی میں بیٹھے دو آدمی کھدر کے کپڑے پہنے تھے، اور اخبار پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے آپس میں بات چیت شروع کی۔ انگریز لڑائی میں ہار رہے ہیں۔ جاپانی بڑھے آ رہے ہیں۔ اِس لیے انگریز سرکار نے گھبرا کر کانگریس، کے لیڈروں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا ہے۔ لیکن انگریزوں کو نکال دینے کا اندولن اب رُک نہیں سکے گا۔

دھن سنگھ دھرم شالہ میں لڑائی میں انگریزوں کے ہارنے کی خبر سُنا کرتا تھا۔ سارے لوگ چاہتے تھے کہ انگریز ہار جائیں۔ لالہ جی سرکار سے لاکھوں روپے کما رہے تھے لیکن اُن کے گھر میں بھی انگریزوں کی ہار سے سب لوگ خوش تھے۔ انگریزی سرکار اور پولس کے ظلم سے سارے لوگ دکھی تھے۔ خود انگریزوں کا سامنا کرنے کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے چاہتے تھے کہ جرمنی اور جاپان انگریزوں کو ہرا کر ہندوستان کو آزاد کرا دیں۔ دوسری طرف لاکھوں آدمی انگریزوں کی نوکری کر کے اُن کا کام اور اُن کی مدد کر رہے تھے۔ وہ لوگ ایسا نہ کرتے تو نباہ کیسے کرتے؟

کامریڈ بھوشن ڈرائیوروں کو چپکے چپکے سمجھایا کرتا تھا کہ انگریزی سرکار کی نوکری کرنا اپنے پاؤں پر

کلھاڑی مارنا ہے۔ جیسے پیڑ کی لکڑی لکڑہارے کی کلھاڑی کا دستہ بن کر اپنے پیڑوں کو کٹوا دیتی ہے۔ دھن سنگھ صرف ایک بات جانتا تھا۔ انگریزی سرکار ظالم تھی مگر سب سے زیادہ ظالم پولس اور پولس ہی سرکار تھی۔

جالندھر پہنچ کر دھن سنگھ کو لاہور سے دہلی جانے والی گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ زیادہ تر گاڑیوں میں خاکی وردی پہنے سپاہی بیٹھے تھے۔ ان گاڑیوں میں گھسنے کی ہمت دوسرے لوگ نہ کرتے تھے۔ سپاہی جہاں چاہتے گھس جاتے۔ عام مسافروں سے ٹھساٹھس بھری گاڑیوں میں جگہ نہ تھی۔ پھر بھی لوگ انھیں میں گھسنا چاہتے تھے۔ پہلے سے بیٹھے اور نئے آنے والوں میں جھگڑا ہوتا لیکن اگر سپاہی ان گاڑیوں میں بھی بیٹھنے کے لیے آجاتے تو انھیں کوئی نہ روکتا۔ دھن سنگھ بڑی مشکل سے ایک گاڑی میں گھس گیا۔ وہ دل ہی دل میں جھلّایا ہوا تھا۔ لوگ سپاہیوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ ڈریں کیسے نہیں، وہ سرکاری آدمی ہیں۔

گاڑی چلنے پر سب لوگ جیسی جگہ مل گئی اُس سے مطمئن ہو کر آپس کا جھگڑا بھول کر باتیں کرنے لگے۔ بات لڑائی کے بارے میں ہی تھی۔ لوگ اخباروں میں پڑھی باتوں پر خیال آرائیوں کا رنگ چڑھا کر سنا رہے تھے...... برما میں انگریز ہار گئے ہیں..... کلکتے میں جاپانی بم گرے ہیں........ کانگریس کے نیتاؤں کی گرفتاری کے خلاف جگہ جگہ بلوے ہو جانے کی خبریں۔ دھن سنگھ چپ بیٹھا تھا۔ لیکن ان باتوں میں اسے امید کی کرن دکھائی دے رہی تھی۔ سرکار ہار جائے، راج بدل جائے، پولس کا ڈر نہیں رہے گا۔ وہ پھر دھرم شالہ میں لوٹ کر سوما کے ساتھ رہ سکے گا۔

دھن سنگھ سوما کے پاس دھرم شالہ پہنچنے کی بات سوچتا ہوا دلّی پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر اور اسٹیشن کے ہر طرف پولس ہی پولس دکھائی دے رہی تھی۔ دھن سنگھ نے کسی سے راہ نہیں پوچھی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ چل کر وہ نزدیک ہی ایک چوڑے بازار میں پہنچ گیا۔ دکانیں عام طور پر بند تھیں۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بات چیت کر رہے تھے۔ ہر طرف ہتھیار بند پولس چوکی پر کھڑی تھی یا گشت کر رہی تھی۔ ابھی ایک ہی دن پہلے بیس گھنٹے تک چلنے، پھر ریل میں سمٹ کر بیٹھے رہنے کی تھکاوٹ سے دھن سنگھ سُست اور تھکن سے چُور تھا۔ چاہتا تھا کہ کہیں لیٹے اور بدن کو سیدھا کرے۔

دھن سنگھ نے ایک مکان کے سامنے بیٹھے آدمی سے دھرم شالہ کا پتہ پوچھا۔ دھرم شالہ نزدیک ہی تھی۔ وہ دھرم شالہ اُس کے پہاڑی دیس کی دھرم شالاؤں یا سرایوں کی طرح نہ تھی کہ جو آئے ایک طرف لیٹنے بھر جگہ صاف کر کے لیٹ جائے۔ جہاں ایک طرف خچّر، گدھے اور

بیل بندھے رہتے ہیں، اور آدمی بھی آرام کرتے ہیں۔ یہ دھرم شالہ لال پتھر کی عالی شان عمارت تھی۔ پھاٹک کی چھت کو نظر اُٹھا کر دیکھے تو سر سے ٹوپی کھسک جائے۔ پھاٹک میں تخت پر دری بچھائے، رجسٹر اور قلم دوات لیے ایک منشی جی بیٹھے تھے۔

منشی جی نے دھن سنگھ کو ٹوک دیا۔ "اے کہاں گھسے جا رہے ہو؟"

"مسافر ہوں، ٹھہروں گا۔"

"کہاں سے آر ہے ہو؟"

"ہوشیار پور پنجاب سے۔"

منشی جی نے دھن سنگھ کو سر سے پاؤں تک جانچا۔ اُس کے پریشان چہرے کو بھانپا۔

"اکیلے ہی ہو؟"

"ہاں۔"

"سامان، نہ کوئی گٹھری بستر انہ تھیلا؟"

"کچھ نہیں ہے۔"

منشی جی نے کچھ سوچا۔ "نہیں، جگہ خالی نہیں ہے۔ باہر جاؤ۔"

دھن سنگھ دھرم شالہ کے پھیلے ہوئے آنگن اور چوڑے برآمدے میں خالی جگہ دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف نل سے گرتی پانی کی موٹی دھار میں ایک آدمی "ہری نام" جپتے جپتے نہا رہا تھا۔ لیکن منشی جی کے انکار کر دینے کی وجہ سے دھن سنگھ کو لوٹ جانا پڑا۔

دھن سنگھ بازار کی طرف چل پڑا۔ ایک ڈھابے (تندور) سے آتی روٹی کی سوندھی بُو نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کھانے بیٹھ گیا۔ بہت دیر ڈھابے پر بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر بند بازاروں میں پھیلی ہوئی بھیڑ میں گھومنے لگا۔ کھانے کے بعد بدن میں زیادہ بھاری پن محسوس ہوا۔ وہ گھنٹہ گھر کے نزدیک ایک بند دوکان کے پاس، بات چیت کرتے لوگوں کے قریب ہی دوسری بند دوکان کے تختوں پر پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ اور بات چیت سُننے لگا۔

بات چیت اُس کی زبان میں نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن کانگڑہ، پٹھان کوٹ اور دھرم شالہ میں جگہ جگہ مسافروں سے سابقہ پڑنے کی وجہ سے وہ زیادہ باتیں سمجھ رہا تھا۔ گاڑی میں سُنی ہوئی باتیں یہاں بھی تھیں۔ سب لیڈروں کا پکڑ لیا جانا اور جاپان کی جیت۔ شہر میں لیڈروں کے گرفتار کیے جانے کے خلاف ہڑتال تھی۔ کچھ معلوم نہیں تھا

کہ سرکار لیڈروں کو کہاں لے گئی تھی ؟ کوئی کہتا گاندھی جی کو ولایت لے گئی ہے۔ نہرو جی کو افریقیہ لے گئی ہے۔ کوئی کہتا کانگریس نے کھُلی لڑائی کا حکم دے دیا ہے۔ کوئی کہتا ہتھیاروں کے بغیر کیسے لڑیں گے ؟ جاپان ہی ان سالوں کی خبر لے گا۔ دوسرے نے اِس سے اختلاف کیا۔ تم دیکھنا کیا کیا ہوتا ہے !

سنسنی تھی کہ پولس اور فوج جلوس کو روکے گی اور کانگریس ضرور جلوس نکالے گی۔ دلّی کے لیڈروں کو بھی گرفتار کیے جانے کی خبریں تھیں۔ دھن سنگھ وہ سب سُن رہا تھا اور سوچ رہا تھا رات کہاں گزارے گا ؟

انقلاب زندہ باد کے نعرے سنائی دیے۔ یہ لفظ دیس کے پہاڑوں سے لے کر سمندروں تک بھارت کی سب زبانوں میں ایک ہو چکا تھا۔ لوگ چونکے۔ جس طرف سے نعروں کی آواز آئی اُسی طرف دوڑ پڑے۔

"انقلاب زندہ باد۔ انگریزی حکومت مُردہ باد ! مہاتما گاندھی کی جے۔" اور بھی نعرے سنائی دیے۔ ترنگے جھنڈے لیے ایک ٹولی گھنٹہ گھر کی طرف چلی آرہی تھی۔ پولس نے فوراً جلوس کو گھیر لیا۔ پولس کے افسر نے حکم دیا اور بھیڑ پر لاٹھیاں پڑنے لگیں۔ بہت سے لوگ بھاگ گئے۔ لیکن کچھ لوگ لاٹھیوں کی پروانہ کرکے نعرے لگاتے رہے۔ "انقلاب زندہ باد ! لیڈر چھوڑے جائیں ! انگریزی حکومت مُردہ باد !"

نعرے لگانے والے لوگ نعرے لگاتے ہوئے لاٹھیوں کی مار سہہ رہے تھے لیکن آس پاس گھر جانے والے لوگوں سے نہتّوں کا مار کھانا چُپ چاپ نہ دیکھا گیا۔ وہ پولس پر پتھر پھینکنے لگے۔ دھن سنگھ کو بھی جوش آگیا۔ اُس نے پولس کو ہمیشہ ظلم کرتے دیکھا تھا۔ وہ پولس کو غریب کا دشمن سمجھتا تھا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اُسے جو کچھ ملا مار کھانے والوں کی ہمدردی میں پولس پر پھینکنے لگا۔

اب تک پولس کے دو دستے ایک طرف کھڑے تھے۔ یہ لوگ بھی بھیڑ پر ٹوٹ پڑے۔ اُسی وقت گولی چلنے کی آوازیں آئیں۔ مجمع لاٹھی کا جواب پتھر سے دینے کے لیے تیار تھا۔ لاٹھی صرف زخمی کرتی ہے۔ مگر گولی جان لے لیتی ہے۔

مجمع بھاگ نکلا۔ دھن سنگھ بھی بھاگا۔ ڈر کر نہیں۔ لڑائی میں آگے بڑھنا اور بھاگ کر بچنا دونوں باتیں ہوتی ہیں۔ بندوق لیے آدمیوں کا مقابلہ پتھروں سے کرتے وقت بھاگنا

اور بچ کر پتھر مارنے میں اُس نے بُزدلی نہیں سمجھی۔ دھن سنگھ مقابلہ کرنے کے لیے پھر لوٹا۔ لیکن کندھے پر لاٹھی کھا کر گر گیا۔

دھن سنگھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ بہت سے لوگ گرفتار کیے گیے تھے۔ دھن سنگھ کو بھی اُن کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ گرفتار ہونے والے نعرے لگا رہے تھے۔" انقلاب زندہ باد! ہمارے لیڈروں کو چھوڑ دو!" دھن سنگھ بھی نعرے لگانے لگا۔

جالی سے منڈھی کالے رنگ کی بسیں آئیں۔ گرفتار لوگوں کو بسوں میں بند کر کے حوالات میں پہنچا یا گیا۔ دھن سنگھ حوالات میں بند ہو گیا، لیکن وہ خوف زدہ نہ تھا۔ اُس کے ساتھ تیئیس آدمی اور تھے۔ ایسے آدمی جو پولس کو ڈانٹ دیتے تھے۔ ہم کیا آدمی نہیں ہیں؟ ...... یہاں گرمی ہے۔ یہاں ہوا نہیں ہے۔ ہم لوگ ہوا میں رہیں گے۔

شام تک کئی جگہوں سے گرفتار کیے گئے اور بہت سے آدمی آ پہنچے تھے۔ ان کی تعداد پچھتّر سے زیادہ ہو گئی تھی۔ گرفتار ہونے والوں کا حُلیہ اور پتہ لکھا گیا۔ زیادہ گرفتار لوگوں نے نام، باپ کا نام، گھر کا پتہ پوچھا جانے پر ایک ہی جواب دیا۔" انقلاب زندہ باد"

یہ جواب دھن سنگھ کے لیے بڑی سہولت تھی۔ اس نے بھی ہر سوال کے جواب میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا دیا۔ شام کے وقت اسے اور اُس کے ساتھیوں کو دلّی جیل میں پہنچا دیا گیا۔

دھن سنگھ پولس کے ہاتھ پڑنے، حوالات اور جیل جانے کے ڈر سے سوما کو چھوڑ کر جان کی بازی لگا کر بھاگا تھا۔ اُسے کہیں پناہ نہ ملی۔ آخر وہ حوالات اور جیل میں جا کر ہی ٹھہرا۔ لیکن اب حوالات اور جیل میں ڈر سے اُس کا دل کانپ نہیں رہا تھا۔ وہ عورت بھگانے والا اور قاتل مجرم نہیں تھا بلکہ بہادری اور قربانی کے جوش سے سینہ پھُلائے، غلامی اور ظلم کے خلاف لڑنے والا سپاہی تھا۔

دھن سنگھ کو جب دھرم شالہ کے جیل میں بند کیا گیا تھا تو اسے محسوس ہوا تھا کہ سرکار نے ہاتھ پاؤں باندھ کر اندھے کنوئیں میں ڈال دیا ہے۔ دلّی جیل میں وہ فخر سے سر اُٹھا کر سرکاری نوکروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اِس بار جیل میں بند ہونا اُس کی جیت

اور سرکار کی ہار تھی۔ دھرم شالہ جیل میں وہ زنجیر میں بند سے اور مار کھائے ہوئے کتّے کی طرح جیل کے وارڈروں کی دھمکی اور مار پیٹ سے سہما رہتا تھا۔ دلّی جیل میں اس کے ساتھی جیل کے افسروں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جیل کے افسر بھی اِن سے 'تو' تڑاخ نہ کر کے عزّت سے بات کرتے تھے۔

دھن سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کو قیدیوں کی پوشاک، آدھی باہوں اور گول گلے کے اونچے سے کُرتے اور ٹخنے تک اونچے پاجامے پہننے کے لیے دیے گئے۔ اِن کپڑوں پر لال موٹی دھاری پڑی ہوئی تھی۔ پوشاک ایک ہونے پر بھی اخلاقی مجرموں اور سیاسی قیدیوں میں فرق بہت صاف معلوم ہوجاتا تھا۔ سیاسی قیدیوں کے چہروں اور بول چال، طور طریقے میں بے خوفی تھی۔ جب کہ اخلاقی قیدیوں کی ہر بات میں شرم اور ندامت تھی۔

جو لوگ ایک بار جیل کی سزا پاکر دوبارہ جرم کر کے جیل میں آتے ہیں انھیں 'عادی' کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پکّے اور گھٹے ہوئے بدمعاش سمجھے جاتے ہیں۔ انھیں دوسرے 'اتفاقی' قیدیوں سے، جن کے سدھار کی امید کی جاتی ہے، الگ رکھا جاتا ہے۔ عادی مجرموں کے کپڑوں پر کالی یا نیلی دھاری رہتی ہے۔ اِن لوگوں کو دیکھ کر دھن سنگھ سوچتا تھا، اگر اس کے بھی پہلے جیل کی سزا پانے کی بات یہاں کے لوگوں کو معلوم ہوجائے تو وہ بھی 'عادی' بنا دیا جائے گا۔ دھن سنگھ نے اپنا راز کسی پر ظاہر نہ کیا۔

دھن سنگھ جیل میں دوسرے سیاسی قیدیوں کی طرح رہتا تھا۔ پیدائش، وطن اور زبان کے لحاظ سے مختلف سیاسی قیدیوں کے ساتھ مقصد کے اتحاد کی وجہ سے ایک ہوگیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ان لوگوں کے ساتھ یگانگت محسوس کرنے لگا۔ وہ جیل کے افسروں کا سامنا کرنے میں آگے رہتا تھا۔ اُس کے ساتھی اُس پر بھروسہ کرتے تھے، اور اسے چاہنے لگے تھے۔ دلّی جیل میں اُسے چکّی پیستے، رسّی بٹتے وقت پہاڑ سا دن دوبھر ہوجاتا تھا۔ سیاسی قیدی جیل کے افسروں کی کوششوں اور دھمکیوں کے باوجود جیل کے کسی کام میں محنت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اِس پر بھی ان کے لیے وقت بوجھل نہ ہوتا تھا۔

سیاسی قیدیوں کی عقل اور کوشش جیل کے افسروں کی آنکھ بچاکر باہر سے اخبار، بیڑی، تمباکو، چینی اور دوسری چیزیں منگانے میں لگی رہتی تھی۔ کچھ لوگوں نے چوری سے تاش منگا لیے تھے اور کھیلتے رہتے تھے۔ کچھ قصّہ کہانی، گپ بازی یا کپڑے دھونے میں وقت کاٹ دیتے تھے۔ کچھ

لوگ کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ جیل کے افسر لگ بھگ پونے دو سو سیاسی قیدیوں کے اتفاق رائے سے کچھ گھبرائے رہتے تھے۔ بکھیڑے سے بچنے کے لیے عام طور پر اُن کی بات مان لیتے تھے۔ جیل کے قانون کی خلاف ورزی ہونے پر بھی نظر انداز کر دیتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر دھن سنگھ کو اطمینان اور جیت کا احساس ہوتا تھا۔ اسے دھرم شالہ جیل میں سہی ہوئی تکلیفوں کا بدلہ سمجھتا تھا۔ جیل کے افسر سیاسی قیدیوں میں ذرا بھی اختلاف دیکھتے تو شرافت کو بھلا کر تشدّد اور سختی کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور کسی کو بیڑی اور کسی کو قیدِ تنہائی کی سزا دینے لگتے تھے۔

سیاسی قیدیوں میں بھی آپس میں اختلاف اور جھگڑے کی کمی نہ تھی۔ اجتماعی طور پر اِن کا جیل کے افسروں سے جھگڑا چلتا رہتا تھا۔ آپس میں بھی کانگریس کے کام کے بارے میں سیاسی بحث ہوتی رہتی تھی۔ بحث کبھی کبھی مار پیٹ تک پہنچ جاتی تھی۔ دھن سنگھ ایسی بحثوں کی گہرائی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اِس لیے عام طور پر چُپ رہ جاتا تھا۔

دھن سنگھ نے جیل میں اپنی مصیبت سے پناہ پائی۔ سیاسی قیدیوں کی صحبت میں وہ گھبراہٹ سے بچتا تھا۔ بہت کچھ سیکھنے کا موقع تھا۔ لیکن اسے جب کبھی تنہائی ملتی، وہ سوچنے لگتا۔ "چھ مہینے بعد وہ جیل سے چھوٹ کر کیا کرے گا؟ سوما کو کیا وہ بے سہارا چھوڑ کر بھلا دے گا؟

جیل کی دیوار پھاند کر جیسے خبریں اندر آ رہی تھیں۔ اُن سے دھن سنگھ کے سوالوں کا جواب خود ہی مل جاتا تھا۔ خبریں آ رہی تھیں کہ انگریز برما میں ہار گئے۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس آزاد ہند فوج کو لے کر مہینے دو مہینے میں بھارت کو آزاد کرانے کے لیے آ رہے ہیں۔ یوپی میں، بہار میں اور دکھن بھارت کی طرف انگریزوں کے خلاف بغاوت ہو رہی ہے۔ ریلیں اُکھڑ گئی ہیں۔ تھانے جلا دیے گئے ہیں۔ ہر طرف ہندوستانیوں کی اپنی سرکار قائم ہو رہی ہے۔

دھن سنگھ کا دل چھٹپٹا کر رہ جاتا۔ ایسے وقت میں وہ اگر کانگڑا ضلع میں ہوتا تو بیج ناتھ کا تھانہ پھونک کر اُس بدمعاش تھانے دار سے بدلہ لیتا۔ اس کا، اور اس کے بہت سے ساتھیوں کے دل جوش سے اُچھل رہے تھے کہ انھیں جیل کی سزا پوری نہیں کرنی پڑے گی۔ کسی دن بھی دلّی کی جنتا آکر جیل کا پھاٹک توڑ کر انھیں آزاد کرا دے گی۔ دھن سنگھ دل خوش کرنے والے تصور میں کھو جاتا کہ وہ سیدھا کانگڑا کی طرف چل دے گا۔

انگریزی جاننے والوں کی عزّت بھی زیادہ تھی۔ کبھی کبھی دلّی کے آس پاس کے گاؤں کے

جاٹ ساتھی یا ایسے کام کرنے والے، جو انگریزی نہیں جانتے تھے، انگریزی میں بولنے کی مخالفت کرنے لگتے تھے۔ روہتک کا بھورے سنگھ پرانا کام کرنے والا تھا۔ دیہاتوں کی جنتا پر اس کا بہت اثر تھا۔ وہ کھنجڑی بجا کر ہریانہ کی بولی میں انگریزوں کے خلاف گیت گاتا تھا۔ جنتا جھوم اُٹھتی تھی اور کسی بڑے سے بڑے نیتا کی سبھا سے زیادہ بھیڑ لگ جاتی تھی۔ بھورے سنگھ انگریزی میں بحث ہونے پر غصہ ہو کر ڈانٹ دیتا تھا۔ "یہ کیا گٹ پٹ کر رہو جی؟ سیدھے سیدھے اپنی بولی میں بولو، ہماری بھی سمجھ میں آوے۔ اپنے بھائیوں سے کس بات کا پردہ ہے جی؟ جنتا ہی ہماری بات نئیں سمجھے گی تو کیا انگریزوں کے سمجھنے کھاتر گٹ پٹ مار رہو ہو؟"

وصن سنگھ بھی انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اُسے بھورے سنگھ کی بات بہت جچتی تھی۔ وہ بھی ہندوستانی میں بات کرنے کو کہتا تھا۔ لیکن ہندوستانی میں بحث ہونے پر بھی وہ زیادہ نہیں سمجھ پاتا تھا۔ سب سے زیادہ بحث کرتے تھے کمیونسٹ ساتھی!

وصن سنگھ کو اپنے رسے بسے ساتھیوں کے مقابلے میں سوراج کی ضرورت کہیں زیادہ تھی۔ وہ اسی اُمید پر جی رہا تھا۔ انگریزی راج کا مطلب زندگی بھر کا گھر سے باہر نکالا اور سوما سے جدائی تھی۔ اور پکڑے جانے کا مطلب زندگی بھر کی قید ہونی تھی یا پھانسی۔ انگریزوں کی شکست اور سوراج کے لیے اُس کی بے چینی پاگل پن بن جاتی تھی۔ وہ خبروں کے لیے باؤلا ہو جاتا تھا۔ وہ سیاسی قیدیوں کے احاطے کے باہر جانے آنے والے قیدی نمبرداروں سے خبریں پوچھتا اور اُردو کا اخبار پانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہو جاتا۔

جیل کے قاعدے کے مطابق سی کلاس کے قیدیوں کو اخبار نہیں دیا جاتا تھا لیکن سیاسی قیدیوں کے احاطے میں اخبار پہنچ ہی جاتا تھا۔ رادھے چودھری اخباروں کے بہت ہی شوقین تھے۔ وہ جیل کے افسروں اور اپنے ساتھیوں کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ سرکار جو چاہے کرلے، اُن کا اخبار نہیں بند کر سکتی۔ ان کا مکان دلی میں ہی تھا۔ جیل وارڈروں سے ان کی سانٹھ گانٹھ رہتی تھی۔ وہ وارڈوں کو ایک روپے پر چونی کمیشن دے کر چوری سے جیل میں روپے منگوا لیتے تھے۔ بیس پچیس روپے پانے والے جیل وارڈروں کو جو قیدی مہینے میں تیس چالیس روپے کھلا دیتا، وہ قیدی ان کے لیے مالک سے کم نہ تھا۔ اخباروں میں جیل میں ہونے والی زیادتیوں کی خبریں چھپ رہی تھیں۔ کئی مرتبہ تو رادھے چودھری کو اکنی کا اخبار جیل میں منگوانے کے لیے دو دو روپے دینے پڑے۔ لیکن وہ اپنی آن باقی رکھنے کے لیے اس میں بھی نہیں جھجکے۔

کچھ کمیونسٹ جیل میں کئی مہینوں سے بند تھے۔ ان لوگوں نے اپنی برادری الگ قائم کر رکھی تھی۔ کمیونسٹ اخباروں اور کتابوں کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ جب رادھے چودھری کا اخبار نہ آ سکا تھا، تب بھی کمیونسٹوں کا اخبار آ گیا تھا۔ کسی طرح یہ خبر جیل کے آفس میں پہنچ گئی تھی اور سیاسی قیدیوں کی بارک کے احاطے کے جمعدار کو بدل دیا گیا تھا۔ اُس کی جگہ جیل کے سب سے سخت اور ایمان دار جمعدار نہال سنگھ کو ڈیوٹی پر لگا یا گیا تھا۔

شام ہو رہی تھی۔ جیل کے کارخانوں میں کام بند ہونے کی گھنٹی بج چکی تھی۔ اس وقت جیل کے کارخانوں میں کام کرنے والے اخلاقی قیدی اور کم سزا پانے والے، محنت کرنے کے لیے جیل سے باہر جانے والے قیدی احاطوں میں واپس لوٹتے تھے۔ ان لوگوں سے خبریں ملتی تھیں۔ رادھے چودھری کا اخبار دو دنوں سے نہیں آیا تھا۔ دھن سنگھ پریشان ہو کر ان قیدیوں کے انتظار میں بارک کے سامنے ٹہل رہا تھا، اور جنگلے دار پھاٹک سے سڑک کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا۔

کمیونسٹ سیاسی قیدی دیوان چند نے دھن سنگھ کے نزدیک آ کر کہا۔ "کھٹا کر آج بڑا غضب ہو جائے گا۔"

"کیا؟" دھن سنگھ نے پوچھا۔

"دو دن سے چودھری کا اخبار نہیں آ پایا، آج ہمارا اخبار بھی ضرور پکڑ لیا جائے گا۔ اگر ہمارا اخبار پکڑ لیا گیا تو پھر جیل میں اخبار نہیں آ سکے گا اور جیل کی خبر بھی آنا بند ہو جائے گی۔" دیوان چند نے فکر مند ہو کر کہا۔

"کیسے؟" دھن سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

دیوان چند نے دھن سنگھ کو ایک طرف لے جا کر بتایا۔ "سنا ہے، یہ جمعدار نہال سنگھ بھنگیوں کے پیپے کی بھی تلاشی لے لیتا ہے۔ اس نے تین نمبر کے احاطے میں بھنگی کے پیپے میں سے بیڑی کے بنڈل پکڑوائے تھے۔ اسی لیے اسے یہاں بھیجا گیا ہے۔ کسی سے کہنا نہیں، ہمارا اخبار کندن مہتر لاتا ہے۔ اگر وہ پکڑا گیا تو پھر سیاسی قیدیوں کا کاغذ کا ایک پُرزہ بھی باہر نہیں جا سکے گا۔ اپنا آدمی نہیں پکڑا جانا چاہیے۔"

"تو پھر؟" دھن سنگھ نے پوچھا۔

دیوان چند انگلیوں سے اشارہ کر کے دھن سنگھ کو سمجھاتا رہا۔ ایک طرف کھڑے نمبردار کی طرف بھی اُس نے اشارہ کیا۔

کارخانے اور دوسری جگہوں میں کام کرنے والے قیدیوں کی کمانیں (جماعت) احاطوں میں واپس آرہی تھیں۔ جمعدار نہال سنگھ دو نمبرداروں کی مدد سے ایک ایک قیدی کی بغلیں اور کمر بند کو ٹٹول ٹٹول کر اور کچھ سے پاجامے لنگی تک اُتروا کر تلاشی لے رہا تھا۔ ہر روز تلاشی کے قاعدے کے باوجود قیدیوں کے پاس کوئی نہ کوئی قابلِ اعتراض چیز نکل ہی رہی تھی۔ کسی قیدی کے پاس لوہے کی تیز کی ہوئی پتّی یا جیبی استرے کا بلیڈ۔ کسی کے پاس کھانے یا پینے کا تمباکو۔ یہ ساری چیزیں جمعدار نہال سنگھ ایک نمبردار کے حوالے کرتا جا رہا تھا۔

بھنگی کمان تلاشی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کمان کا پہلا آدمی کندن مہتر آگے بڑھا۔ اُسی وقت احاطے میں دردناک چیخ سُنائی دی۔ "مار ڈالا، مار ڈالا" اور پھر دُبلا پتلا دیوان چند دونوں ہاتھوں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوا دکھائی دیا جس کا پیچھا دھن سنگھ ایک نمبردار سے چھوٹا ڈنڈا چھین کر گالیاں بکتا ہوا کر رہا تھا۔ دھن سنگھ کے پیچھے ایک نمبردار دوڑا۔ دوسری طرف سے دیوان چند کو بچانے کے لیے واجد چلاتا ہوا بیچ میں آگیا۔ اور زور زور سے چلّانے، لپکارنے اور دھمکانے لگا۔

"کیا ہے؟ کیا؟" پکارتے ہوئے کئی دوسرے سیاسی قیدی بھی آ گئے۔

جمعدار نہال سنگھ پھاٹک پر تلاشی کا کام چھوڑ کر سیٹی بجاتا ہوا جائے وقوع پر دوڑ پڑا۔ اسے جیلر کی ہدایت تھی کہ سیاسی قیدیوں پر سختی کرنے کا موقع نکالنے کی کوشش کرے۔ انھیں دنگا کرنے والے اور بدمعاش ثابت کرے۔ جمعدار کی سیٹی بجتے ہی ہر طرف سیٹیاں بجنے لگیں، اور جیل کے پھاٹک پر لٹکا ہوا گھنٹہ ٹن! ٹن! بج اُٹھا۔

قیدی بارکوں میں بند ہونے کے لیے دوڑنے لگے۔ بھنگی کمان بھی اپنے پیپے کنستر اُٹھائے اندر آ گئی۔ پانچ سات منٹ میں سارے جیل کے ڈھائی ہزار قیدی تالوں میں بند کر دیے گئے۔

سیاسی قیدیوں کے بارک میں سنسنی پھیل گئی۔ رادھے چودھری اور بہت سے ساتھیوں نے کہا۔ "اگر سالے کمیونسٹوں نے دھن سنگھ کو سزا دلوائی تو ان کی خبر لی جائے گی۔"

کئی آدمی بولنے لگے۔ "سالوں کو کمبل ڈال کر ٹھیک کیا جائے!"

"ان لوگوں کا بائی کاٹ کیا جائے۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب، جیلر اور دوسرے افسر امن بحال کرنے کے لیے بندوق لیے سپاہیوں

کے ساتھ سیاسی قیدیوں کے بارک کے سامنے آ گئے۔ دھن سنگھ، دیوان چند اور واجد کو پیشی کے لیے صاحب کے سامنے بلایا گیا۔ دھن سنگھ، دیوان چند اور واجد کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئی تھیں۔ جھگڑے میں دھن سنگھ کو دو تین جگہ چوٹ بھی آ گئی تھی۔

صاحب کو جیلر نے سمجھا دیا تھا کہ یہ کمیونسٹ اور کانگریسی قیدیوں کا جھگڑا تھا۔ صاحب نے ہمدردی کے انداز میں دھن سنگھ کی طرف اشارہ کر کے دیوان چند سے پوچھا۔ "اس بدمعاش نے تم کو مارا ہے؟"

دیوان چند نے جواب دیا۔ "نہیں! مجھے کسی نے نہیں مارا۔"

صاحب نے ہونٹ سکوڑ کر دیوان چند کی طرف غصہ بھری نظر سے دیکھا اور پھر ہونٹ سکوڑ کر دھن سنگھ سے پوچھا۔ "تم کو اس نے مارا؟"

اسسٹنٹ جیلر آگے بڑھ کر بتانے لگا۔ کہ دھن سنگھ دیوان چند کو مار رہا تھا۔ نمبردار کے روکنے پر دھن سنگھ نے نمبردار سے ڈنڈا چھین لیا۔ اور نمبردار کو بھی مارا اور دیوان چند کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ دھن سنگھ نے واجد کو بھی مارا اور نمبردار کرپا کے روکنے پر اسے بھی مارا۔ کئی دوسرے کانگریسی قیدی بھی نمبرداروں کو مارنے کے لیے دوڑے تھے۔ جھگڑے میں سب کو پہچاننا کٹھن تھا۔

صاحب نے واقعہ سن لیا۔ لیکن دیوان چند یا دھن سنگھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ انھوں نے انگریزی میں جیلر سے کہا۔ "یہ لوگ بہت گھٹے ہوئے ہیں، انھوں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

اسسٹنٹ جیلر نے رائے دی۔ "حضور اس وقت تو یہ لوگ سمجھوتہ کر رہے ہیں، لیکن بارک میں بند ہونے کے بعد رات میں مار پیٹ کر سکتے ہیں۔ حضور کا حکم ہو تو ان تینوں کو "تنہائی کوٹھری" میں بھیج دیا جائے۔"

دیوان چند نے اعتراض کیا۔ "صاحب آپ سیاسی قیدیوں کو بدنام کرنے کے خواہ مخواہ دنگے کا الزام لگا رہے ہیں۔ ہم لوگ ورزش کے لیے کبڈی کھیل رہے تھے۔ نمبرداروں نے ہم پر ڈنڈا اچھالنا شروع کر دیا۔ یہ سب اس جمعدار کی شرارت ہے۔ جیلر نے اسے یہاں ہم لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ جب بھی یہ جمعدار اس احاطے میں آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی فساد کھڑا ہو جاتا ہے۔ جھوٹا الزام لگا کر ہم لوگوں کی بے عزتی کی جا رہی ہے۔ آپ مناسب فیصلہ کریں نہیں تو ہم شہر کے با اختیار لوگوں سے شکایت کریں گے۔"

صاحب غصّے کا اظہار کرنے کے لیے کوئی جواب دیے بغیر لوٹ گئے۔ چند قدم جا کر انھوں نے

جیلر سے کہا۔" ان لوگوں کو ساتھ رہ کر آپس میں لڑنے جھگڑنے دو۔ کوئی واردات ہوگی تو باہر عدالت میں معاملہ بھیج کر انھیں سزا دلانا ہی ٹھیک ہوگا۔"

احاطے میں یوں شور مچاکر بھی سیاسی قیدیوں کے بالکل سزا نہ پانے سے جیل کا دبدبہ بالکل ختم ہوجاتا، اس لیے صاحب نے دیوان چند، دھن سنگھ اور واجد کو دو دو دن اکیلے کوٹھری میں بند رہنے کی سزا دے دی تھی۔

سیاسی قیدیوں کی بارک کے احاطے میں دوسرا جوش پھیل گیا۔ کمیونسٹ جے رام اور سوشلسٹ ارجن لال نے کہا۔ دیوان چند اور دھن سنگھ صاف کہہ رہے ہیں کہ ان میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا تو انھیں سزا کس بات کی دی جارہی ہے؟ جیل والے اسی طرح ہماری بے عزّتی کریں گے تو ہم سب لوگ بھوک ہڑتال کریں گے۔

اِس سوال پر سیاسی قیدیوں کا جلسہ کیا گیا۔ سیاسی قیدیوں میں سب سے زیادہ عزّت سوم ناتھ جی کی تھی۔ شہر میں بھی ان کی عزّت تھی۔ وہ کانگرس کے پُرانے نیتا اور کام کرنے والے تھے۔ ان کے گھر میں کافی دولت تھی۔ لیکن انھوں نے غریبوں کے دکھ سے متاثر ہوکر تپسیا کی زندگی اپنالی تھی۔

سرکاری حکم سے سوم بابو کو 'اے' کلاس دیا گیا تھا۔ لیکن یہ ان کے اصول کے خلاف تھا۔ انھوں نے 'سی' کلاس میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جیل میں وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اپنے خرچ سے دو سیر دودھ اور کچھ پھل منگا لیتے تھے۔ مل کے سوت سے بنا کپڑا ابھی وہ نہیں پہنتے تھے۔ شدھ کھدر کا صرف ایک انگوچھا کمر میں لپیٹ کر پشمینے کی شال اوڑھے رہتے تھے اور دن بھر تکلی سے سوت کاتا کرتے تھے۔ چوری سے منگایا ہوا اخبار پڑھنا وہ بداخلاقی سمجھتے تھے۔ اِس لیے صرف خبریں سُن لیتے تھے۔

لوگوں کے بہت اصرار کرنے پر سوم بابو بھی جلسے میں آئے تھے۔ نوجوان ساتھی ارجن لال اور جے رام کی بھوک ہڑتال کی تجویز کے حق میں تھے۔ جیل والوں نے جو بے عزّتی تھی۔ اُس کے خلاف لڑنا چاہتے تھے۔ لیکن رادھے چودھری اِس تجویز کے خلاف تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس توہین کا بدلہ لینے کے لیے جیلر کو گالیاں دے کر اُسے پیٹنا چاہیے۔ ہم خود ہی بھوکے کیوں مریں؟ رادھے چودھری نے کھڑے ہوکر کہا۔" عورتوں کی طرح رُوٹھنے سے کیا ہوتا ہے کہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے! ایسے تو اُلٹے سرکار کا اناج بچتا ہے۔" اُنھوں نے وزنی گالی دے کر کہا۔" کوئی ...... ہمیں

سزا دے تو ہم سالے کا سر توڑ کر رکھ دیں! ہم تو نیتا جی کی بات مانتے ہیں۔ ہم لڑ کر اپنا حق لیں گے۔"
رادھے چودھری کے ساتھ ٹھنڈائی پینے والے چار پانچ آدمیوں کی ٹولی رہتی تھی۔ وہ لوگ مالش کر کے کسرت کرتے تھے۔ اور مہاتما گاندھی اور نیتا جی کی جے پکارتے تھے۔ باہر سے مٹھائی اور تمباکو مانگ کر کھاتے پیتے رہتے تھے۔ وہ سب ان کی حمایت کر رہے تھے۔
جے رام اور ارجن لال نے سمجھانا چاہا کہ "صاحب یا جیلر کو گالی دینے یا پیٹنے سے حالت سدھرے گی نہیں بلکہ بگڑے گی۔ جیل والوں کو ہم پر لاٹھی چارج کرنے کا بہانہ مل جائے گا اور جنتا بھی ہمیں فسادی سمجھے گی۔ بھوک ہڑتال بزدلی نہیں ہے۔ یہ ستیہ گرہ کا ہتھیار ہے جو مہاتما گاندھی نے ہمیں دیا ہے۔"
رادھے چودھری کے ساتھی تالی بجا کر 'ہو ہو' کر کے شور مچانے لگے۔ "لولو ہے، لولو ہے!
اس پر بھی زیادہ تر نوجوان جیل میں توہین نہ برداشت کرنے کے لیے بھوک ہڑتال کی مانگ کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے نیتا سوم بابو اُن کی طرف سے صاحب کو بھوک ہڑتال کی نوٹس دیں۔ سوم بابو نے یہ منظور نہ کیا تو ارجن لال اور جے رام نوٹس دینے کے لیے تیار ہو گئے لیکن ان کا کہنا تھا کہ سوم بابو بھی ہڑتال میں ساتھ دیں تو اچھا ہو۔
سوم بابو کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی چالاکی سمجھ گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ ہر وقت ان کا اثر کم کرنے کی سازش کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے سمجھایا۔ "اگر جیل والے اپنے قانون کے مطابق ہمیں کوئی سزا دیتے ہیں تو سزا کو ہمیں چپ چاپ برداشت کر لینا چاہیے۔ یہی ہماری روحانی طاقت ہے۔ ظلم کے بڑھ جانے سے ہی اُس کا ناس ہوتا ہے۔ گیتا میں لکھا ہے۔ جب دھرم کی گراوٹ آخری حد تک پہنچ جاتی ہے۔ تبھی بھگوان کی طاقت اوتار لے کر انصاف قائم کرتی ہے۔ ہمیں اگر بھوک ہڑتال کرنا ہے تو جیل والوں کے خلاف نہیں کرنی چاہیے بلکہ روحانی پاکیزگی کے لیے کرنی چاہیے۔ گاندھی جی کبھی مخالفت میں فاقہ نہیں کرتے سدا پرائشچت (کفارہ) میں ہی برت رکھتے ہیں۔ ہمیں جیل کے افسروں اور سرکار کا دل پریم سے بدلنا چاہیے۔ آپ لوگوں کا طریقہ ہنسا (تشدد) کا ہے۔ آپ جیل والوں کو ڈرانا چاہتے ہیں۔ گاندھی کا حکم ہے کہ ہم لوگ جیل میں جا کر تپسیا (ریاضت) کریں۔ جیل کے قاعدوں کو مانیں۔ لیکن آپ لوگ چوری سے اخبار منگاتے ہیں۔"
ارجن لال نے ٹوک دیا۔ "بابو جی، اگر جیل میں ظالمانہ قاعدوں کو ماننا ہے تو جیل سے باہر

ہی قانون کیوں توڑا جائے! انگریز سرکار کا قانون ہے کہ سب ہندوستانی وفادار غلام بنے رہیں۔ آپ اسی قانون کو مانیے۔ سوراج کیوں مانگتے ہیں؟ سوراج کی مانگ سرکار کی مخالفت ہی ہے۔ ہم سرکار سے مانگ کریں گے کہ ہمیں اخبار ملے۔ نہ ملنے پر اس کے خلاف بھوک ہڑتال کریں گے۔ ہم جانور نہیں آدمی ہیں۔"

سوم بابو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اگر آپ لوگ گاندھی جی کے حکم کے خلاف کریں گے تو میں خط لکھ کر مہاتما جی کو اور سارے نیتاؤں کو اس بات کی خبر دے دوں گا کہ آپ لوگ کانگریس کے ممبر ہونے کے لائق نہیں ہیں۔ ضرورت ہوگی تو میں جیل والوں کے خلاف آپ کے اس ظلم کے پرائشچت (کفارہ) پر آمرن برت کروں گا۔ جب بھی ہندوستانیوں نے انگریزوں اور سرکار کے خلاف تشدد کا طریقہ اپنایا ہے مہاتما گاندھی نے سدا برت رکھ کر اس کا پرائشچت کیا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی کرنا ہوگا۔

جے رام، ارجن لال اور واجد سوم بابو کو جواب دینا چاہتے تھے۔ مگر رادھے چودھری کے آدمیوں نے نعرہ لگا دیا۔ "مہاتما گاندھی کی جے!" انھوں نے کسی کو بولنے نہیں دیا۔ کوئی کچھ کہنا چاہتا تو وہ زور سے مہاتما گاندھی جی کی جے کے نعرے لگانے لگتے۔ انھوں نے کھلے عام دھمکی دی۔ "جو سالا اسٹالن کے بیٹوں کے کہنے سے فاقہ کرے گا اُس پر کمبل ڈالا جائے گا۔"

کمبل ڈالنا جیل میں پٹائی کا خاص ڈھنگ ہوتا ہے۔ جس میں مار کھانے والے کا سانس رُک کر تکلیف زیادہ ہوتی ہے اور مار کھانے والا یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے کون مار رہا ہے۔ ؟ ہڑتال نہ ہو سکی۔ دھن سنگھ کو دلی جیل میں کبھی اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ جتنی اِس واقعہ سے۔ وہ چاہتا تھا، رادھے چودھری سے دو دو ہاتھ کر کے اس کی خبر لے۔ لیکن دیوان چند، ارجن لال اور واجد نے اسے منع کر دیا کہ جیل والوں کے سامنے سیاسی قیدیوں کی بے عزتی کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ دھن سنگھ سوم بابو کے تیاگ کی وجہ سے ان کی عزت کرتا تھا۔ اب اس کا جی چاہتا تھا کہ جا کر اُن کے منھ پر تھوک دے۔

سیاسی قیدیوں کے احاطے میں پھوٹ پڑ گئی۔ جیل والوں نے ان پر سختی شروع کر دی۔ جن معمولی قاعدوں کو توڑنے کو جیل والے نظر انداز کر دیتے تھے۔ اب اُن کے لیے سیاسی قیدیوں کو سزائیں دی جانے لگیں اور سیاسی قیدیوں کو چکّی پیسنے اور رسّی بٹنے کا کام کرنا پڑا۔

دیوان چند نے دھن سنگھ کو سمجھا دیا تھا اپنا اخبار آنے اور اُس دن کے جھگڑے کا راز

کسی کو نہ بتائے کیوں کہ سیاسی قیدیوں کے احاطے میں بھی کئی مخبر ہیں۔

احاطے میں پھوٹ اور افسروں کی سختی بڑھ جانے سے دیوان چند کا اخبار آنا بھی رک گیا تھا۔ دھن سنگھ کو یہ کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ باہر سے دیس میں بغاوت پھیلنے، انگریزوں کے جاپانیوں سے ہار کر بھاگنے کی خبریں ملنا بند ہو جانے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوراج کا کھلتا ہوا دروازہ یکایک بند ہو گیا ہو۔ اس کی آیندہ زندگی کی آشا اور سوما سے دوبارہ ملنے کی اُمید مٹنے لگی۔

اخبار والے واقعے سے دھن سنگھ، دیوان چند اور واجد کا دوست بن گیا تھا۔ جیل میں آتے ہی یہ جان کر کہ وہ لوگ کمیونسٹ کامریڈ تھے، دھن سنگھ کو بھوشن کے ہمدردی بھرے سلوک کی یاد سے اُن کی طرف کچھ کشش ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کامریڈ لوگ مزدوروں کے مددگار ہوتے ہیں۔ لیکن جیل میں آکر سُنا کہ کمیونسٹ جاپانیوں کے خلاف ہیں، جو ہمارے دشمن انگریزوں سے لڑ رہے ہیں اور کمیونسٹ روس سے حکم ملنے کی وجہ سے انگریزوں کے مددگار بن گئے ہیں۔ دھن سنگھ کو یہ ساری باتیں ارجن لال نے سمجھائی تھیں۔

ارجن لال کے لیے دھن سنگھ کے دل میں زیادہ عزّت تھی۔ اس نے ارجن لال کو چاندنی چوک میں جم کر لاٹھیاں کھاتے دیکھا تھا۔ ارجن لال بہت پڑھا لکھا تھا۔ ارجن لال نے اسے بتایا تھا کہ وہ پہلے کان پور کے مزدوروں میں کام کرتا تھا اور دلی کے مل میں مزدوروں کا نیتا تھا۔ کمیونسٹوں سے اس کا اسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا کہ وہ لوگ انگریزوں سے مل گئے تھے اور کانگریسیوں کو گرفتار کروا رہے تھے۔ اس نے دھن سنگھ کو کمیونسٹوں کی لمبی چوڑی باتیں اور دلیلیں سننے سے منع کر دیا تھا۔ اور یقین دلایا تھا کہ اگر چھ مہینے میں سوراج نہ مل جائے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جا کر انقلابی کاموں میں حصّہ لینے کا موقع دے گا۔

رادھے چودھری کے پیٹ میں درد رہنے لگا۔ وہ کچھ دن جیل کے ہسپتال میں رہے۔ اور پھر رہا کر دیے گئے۔ احاطے میں پھر سے اتحاد ہو گیا تھا۔ اخبار پھر چوری چوری آنے لگا تھا۔ اور بھی تیز خبریں آرہی تھیں۔ جاپانی سار ابرما جیت کر آسام تک پہنچ گئے تھے۔ بنگال میں کئی جگہ اور کلکتہ پر بھی بم گرنے کی خبریں تھیں۔ قیدی بہت پُر امید ہو گئے کہ انگریز جاپانی فوج اور آزاد ہند فوج کی مار سے بھاگنے والے ہی ہیں۔ ان لوگوں کو جیل سے آزاد ہو جانے کی اُمید ہو گئی تھی۔

ارجن لال اور دھن سنگھ کے چھوٹنے کا وقت آرہا تھا۔ خبر ملی کہ گاندھی جی نے برت شروع کردیا ہے۔ برت کی وجہ لوگ سمجھ نہیں پائے تھے۔ دیوان چند اور واجد وغیرہ کچھ کمیونسٹ چھوٹ چکے تھے۔ لیکن ان کے کچھ چیلے پیچھے رہ گئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ گاندھی جی، کانگرس پر انگریز سرکار کے تشدد کا الزام لگانے کے خلاف فاقہ کر رہے ہیں .... ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ توڑ پھوڑ کا یہ اندولن کانگریس کا نہیں تھا۔ کانگریسی رہنما ایسی بے وقوفی کیسے کرسکتے تھے کہ دشمن سر پر کھڑا ہو اور وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کی اپنی طاقت برباد کردیں ؟ یہ تو سب انگریز نوکر شاہی کی چالاکی تھی۔ نیتاؤں کی غیر حاضری میں جنتا کو ظلم سے بھڑکا دیا اور من مانی کرنے کے لیے بہانہ ڈھونڈ لیا۔ سوشلسٹ اس چال سے احمق بن گئے۔

نوجوان لوگ ان باتوں سے مایوس ہونے لگے۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کا آندولن میں حصہ لے کر جیل جانا بے وقوفی ہی تھی۔ گاندھی جی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ دھن سنگھ بھی جھلایا ہوا رہنے لگا۔ غصے کی سب سے بڑی وجہ تھی کہ وہ پھر غلام ملک اور انگریزوں کی عملداری میں ہی جیل سے رہا ہو رہا تھا۔ اپنے پہاڑ پر جاکر سوما سے ملنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔

ارجن لال اور دھن سنگھ جیل سے چھوٹے تو ہر طرف دہشت اور بے دلی پھیلی ہوئی تھی۔ عام لوگ مہاتما گاندھی کے برت سے حیران تھے۔ عام طور پر لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ مہاتما گاندھی نے اس لیے برت رکھا ہے کہ جیل سے چھوٹ کر پھر اندولن چلا سکیں۔ سرکار نے بے تحاشہ جبر و تشدد سے عوام کو خوف زدہ کردیا تھا۔ آزادی کا اندولن یا سرکار کے خلاف کوئی مظاہرہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عام اندولن اور مظاہرے دب چکے تھے۔ لیکن انگریزی حکومت کے خلاف نفرت عوام کے دلوں میں اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ حکومت کے ہر کام میں عوام کو شک ہوتا تھا اور اسے ہر طرف حکومت کی کمزوری دکھائی دیتی تھی۔ حکومت نے غلّے کی کمی کی وجہ سے لوٹ مار کا خطرہ دور کرنے کے لیے راشننگ کا انتظام کردیا۔ عوام کو یقین ہوگیا کہ سرکار لڑائی کے لیے غلّہ بٹورنے کی وجہ سے انھیں کم کھانا دے رہی

جنوری کے مہینے میں جاپانی ہوائی جہاز رات میں آکر کلکتے میں تین بار بم پھینک چکے تھے۔ دلی میں سرکاری عمارتوں کو ریت کے بوروں اور پرداد یواروں سے ڈھنک دیا گیا تھا

جگہ جگہ بم کے حملے سے بچنے کے لیے پناہ گاہیں بنادی گئی تھیں۔ بڑے بڑے شہروں کو آسمان سے گرنے والے بموں کا نشانہ بننے سے بچانے کے لیے حکومت نے رات میں روشنی کم کرنے کا حکم دے دیا تھا اور دشمن کے ہوائی جہاز سر پر پہنچ جانے کے وقت شہروں میں فوراً اندھیرا کر دینے کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ کبھی کبھی بلیک آوٹ (بالکل اندھیرا) کرنے کی مشق کی جاتی تھی۔ عام لوگوں کو اس میں حکومت کی بزدلی دکھائی دیتی تھی۔ عوام کی حفاظت کے لیے ان سرکاری احکام کا لوگ مذاق اڑاتے تھے اور انھیں اس سے خوشی ہوتی تھی۔ عام لوگوں کے دل حکومت سے نفرت کی آگ میں جل رہے تھے۔ لیکن نفرت دبی ہوئی تھی۔

ارجن لال دھن سنگھ کو لے کر دہلی میں اپنے دوستوں اور جان پہچان کے لوگوں سے ملانے گیا تھا۔ نوجوان لوگ پچھلے اگست کے اندولن کو پھر چلانا چاہتے تھے۔ ارجن لال ایک سوشلسٹ لیڈر کے پاس گیا، انھوں نے اپنی بیماری بتا کر عذر کر دیا۔ گاندھی وادی نیتاؤں نے صلاح دی۔ ابھی انتظار کرو۔ گاندھی جی پر بھروسہ رکھو۔ گاندھی جی برت کے بعد حکومت سے خط وکتابت کریں گے۔ تبھی راستہ طے ہوگا۔

دلی کے مل مزدوروں میں ارجن لال کا خاصا اثر تھا۔ جیل سے چھوٹنے پر وہ حالت سمجھنے کے لیے مزدوروں کی بستیوں میں گیا۔ وہاں کمیونسٹوں نے اپنا اثر جما لیا تھا۔ ارجن لال کے جیل جانے سے پہلے تک کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ کمیونسٹ مزدور سبھا اور دوسری کئی تنظیموں کی آڑ میں کام کرتے تھے۔ اب وہ کھلے طور پر پرچار کر رہے تھے۔ ایک نئی ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی بھی بن گئی تھی۔ یہ پارٹی لال جھنڈا لے کر انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہونے کا پرچار کر رہی تھی۔ یہ پارٹی انگریزوں کو جمہوریت کا محافظ بتا کر انھیں جنگ میں پوری مدد دینے کی صلاح دے رہی تھی۔ کمیونسٹ، جاپان کے حملے کے وقت دشمن کے مقابلے میں کمی نہ ہونے دینے کے لیے، مزدوروں کو کسی طرح کی ہڑتال نہ کرنے کی صلاح دے رہے تھے، اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے، جنگ میں تعاون کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ عام لوگ ایک ہی سا جھنڈا لے کر چلنے والی ان دونوں پارٹیوں کے فرق کو سمجھ نہیں پاتے تھے اور انگریزوں کی مدد کا نعرہ لگانے والوں سے نفرت کرنے لگے تھے۔

کانگریس سوشلسٹ نیتا عام طور سے فرار تھے۔ ان کی تلاش میں ارجن لال کو دو دن لگ گئے۔ ارجن لال خرچ کی تنگی سے پریشان تھا۔ جنگ سے پہلے وہ بارہ آنے روپے میں بھی دن کاٹ لیتا تھا۔ اب مہنگائی کی وجہ سے ڈیڑھ دو روپے میں بھی کچھ نہ بنتا تھا۔ روپے کا اٹھارہ سیر بکنے والا اناج چار

سیر بک رہا تھا۔

ایک رات ارجن لال اور دھن سنگھ نے بہت دھیمے لہجے میں بولتا آزاد ہند ریڈیو سنا۔ ریڈیو پر سوشلسٹ لیڈروں نے صلاح دی، جیسے بھی ہو اگست ۱۹۴۲ء کے انقلاب کو جاری رکھا جائے۔ جاپان آرہا ہے وہ انگریزوں کے پاؤں اُکھاڑ دے گا۔ ہمیں مار کھاتے ہوئے انگریزوں کو دھکا دے کر اپنا راج لینا ہے۔ جنتا کو سمجھاؤ، حکومت سے تعاون نہ کرے۔ کسانوں کو سمجھاؤ حکومت کو فوج کے لیے اور راشن کے لیے غلہ نہ دیں۔ اِس سے حکومت کے خلاف بغاوت ہوگی۔ عوام کی بغاوت اور جاپان کی مار کے درمیان انگریزی حکومت ختم ہو جائے گی۔ گاؤں میں اندولن کرو۔ اگر گاؤں سے ملوں کے لیے کچا مال اور فوج کے واسطے غلہ اور سپاہی نہ ملیں گے تو انگریزی حکومت سات دن بھی نہ چل سکے گی۔

سیگاؤں ریڈیو سے سبھاش بابو کا پیغام سنایا گیا۔ "بھارت کے کروڑوں دیہاتی عوام اس وقت انقلاب کی راہ دکھانے والے نوجوان نیتاؤں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہندوستانی پولس اور فوج میں اس وقت انگریزوں کے خلاف نفرت کا جوالا مکھی دہک رہا ہے۔ وہ صرف عوام کی بغاوت کا انتظار کر رہے ہیں......"

کٹھن حالات میں سخت جد و جہد چل رہی تھی۔ ملک کی قسمت کا فیصلہ ہونے کا وقت تھا۔ لیکن دلّی کے شہری یا تو مایوسی میں سر لٹکائے ہوئے تھے یا سب کچھ بھول کر کسی طرح جی بہلا رہے تھے۔ بازاروں میں جانے کہاں سے پیسہ برس رہا تھا۔ روپے کی قیمت گر گئی تھی اور لوگ اسی طرح خرچ کر رہے تھے کہ جیسے پڑا مل گیا ہو۔ سینما گھروں کے آگے ایسی بھیڑ ہوتی جیسے کمبھ کے موقع پر تیرتھ استھانوں میں ہوتی ہے۔

ارجن لال اور دھن سنگھ کو حکومت کے تشدّد کے آگے سر جھکانے والوں سے نفرت تھی۔ آزاد ہند ریڈیو کا پیغام سُن کر ان کے دل جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے دیہاتوں میں جا کر انقلابی کاموں کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

ارجن لال نے دھن سنگھ کو سمجھایا۔ دیہات میں کام کرنا بہت آسان ہوگا، اور وہیں کام کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے گاؤں میں ابھی انسانیت اور ہماری قدیم تہذیب باقی ہے۔ کسانوں میں مہمان نوازی کا جذبہ بھی ہے۔ وہاں شہر کی سی حالت نہیں ہے کہ سب اپنا ہی پیٹ بھر رہے ہیں۔ جہاں جائیں گے دو روٹی اور چھاچھ کا لوٹا مل ہی جائے گا۔ اس نے تحریکوں

میں دلّی کے آس پاس کام کیا تھا۔ وہ دھن سنگھ کو گاؤں کے تجربے سناتا رہا۔ خفیہ پولس ان کا پیچھا نہ کر سکے، اِس لیے وہ لوگ رات کے وقت متھرا جانے والی گاڑی سے دلی سے نکلے۔ ان کا خیال ہاتھرس ضلع کے دیہات میں جانے کا تھا۔ اس دیہات کو ارجن لال کچھ جانتا تھا۔

ارجن لال کچھ دن ہاتھرس کی منڈی میں منیمی کا کام کر چکا تھا۔ اسے کاروبار سے دلچسپی بھی تھی۔ دھن سنگھ کو لے کر وہ منڈی گیا۔ اناج کے آنے کا موسم نہ تھا، لیکن منڈی میں کافی سرگرمی تھی۔ سرکاری ایجنٹ غلّہ خرید رہے تھے اور شہر کے بیوپاری ان سے بھی تیز دام پر خرید رہے تھے۔ ارجن لال کو یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوپار کے لیے اچھا موقع ہے۔ حکومت شہروں میں راشننگ اور فوج کے لیے جس دام پر غلّہ ملے گا، خریدے گی۔ یہ سوچ کر کھتی وار (گولے وار) لوگ خوب خریداری کر رہے تھے۔ بسیاکھ اور جیٹھ کے سودے اور بھی تیزی سے ہو رہے تھے۔

افواہ تھی کہ منڈیوں میں لوگ کانگرس کے اثر کی وجہ سے سرکار کو مال نہیں دے رہے ہیں۔ اِس لیے سرکار دیہاتوں میں افسروں کے دباؤ سے غلّہ خرید رہی تھی۔ ارجن لال نے دھن سنگھ کو سمجھایا۔ اس وقت دیہات میں جا کر سرکار کو غلّہ دینے کے خلاف پرچار کرنا چاہیے تاکہ سرکار کی اقتصادی جڑ کٹ جائے۔ ارجن لال اور دھن سنگھ سدھورا گاؤں کی طرف چل دیے۔ وہ لوگ منھ اندھیرے ہی پیدل چل پڑے۔ کھیتوں میں فصل گھٹنوں تک اُٹھ گئی تھی۔ کچّی سڑکوں کی دھول گھٹنوں تک چڑھ رہی تھی۔ جاڑے کی دھوپ ناقابلِ برداشت نہ تھی۔ لیکن پیاس سے گلا سوکھ رہا تھا۔ وہ لوگ ایکھ کے کھیتوں میں سے پگڈنڈی پر سدھورا کی طرف چلے جا رہے تھے۔ سامنے سے پگڑی باندھے ہوئے ایک کسان آتا دکھائی دیا۔

کسان نے نئے آدمیوں کو دیکھ کر پوچھا: "اے آسھر لو کہاں کو جائے رہے ہو؟"

"گاؤں میں جائیں گے۔" ارجن لال نے جواب دیا۔

"سو تو دیکھئی ہے، کون کے جا رہے ہو؟ کون ہو تم؟" کسان کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"دادا۔" ارجن لال نے جواب دیا۔ "بگڑتے کیوں ہو! سمجھ لو تمہارے ہی دوا کے جا بیٹھیں۔ ہمارا کون اپنا کون پرایا۔ کانگریسی آدمی ہیں، دیس کی بات کہنے آئے ہیں۔"

کسان نے لاٹھی کے سرے سے لوٹ جانے کا اشارہ کر کے کہا۔ "لوٹ جاؤ، جدھر تے آئے ہو۔ نہیں تو میرے سر آدمی کی ہتیا (قتل) دیتے ہو۔ بہت دیکھے ہیں تمہارے جیسے ٹوپی والے کانگریسی بنیے۔ دیہاتن نوچ نوچ کھائے ڈارو تم نے۔ آج کسانوں کو کھرے داموں چار پیسے بنا دن کو وقت

آئیو ہے تو اُلٹی پٹی پڑھاون چلے آئے۔ لوٹ جاؤ! سر پھوڑ ڈاریں گے، گاؤں میں پاؤں دھرو تو!"

ارجن لال نے حیرت اور ڈر بھی محسوس کیا۔ پھر بھی ہمت کر کے بولا" بگڑتے کاہے ہو۔ آٹھ میل پاؤں پیدل چل کر آئے ہیں۔ کہیں لوٹا بھر پانی تو پی لینے دو۔ بھوک بھی لگی ہے کھا کر چلے جائیں گے۔ ناراض ہوتے ہو تو کچھ نہیں دیں گے۔"

بوڑھا نہیں مانا۔ اُس نے پھر دھمکی دی۔" گاؤں کی طرف قدم بڑھایا تو پاؤں توڑ دیں گے۔" اُس نے لاٹھی سے اشارہ کیا۔" چلے جاؤ پورب لانگ" مسریا"۔ میں وہاں تمہارے جیسے کانگرسی بہت ہیں۔"

ارجن لال کے منت کرنے پر بھی بوڑھے نے انھیں گاؤں کی طرف قدم نہ بڑھانے دیا تو لوٹنا پڑا۔ پگڈنڈیوں سے میل بھر چل کر سڑک پر آ گئے اور ریکے پر جلبسر پہنچے۔ قصبے میں جو کچھ ملا کھا کر پانی پیا۔ رات دھرم شالہ میں کاٹ دی۔ اگلے دن پھر وہ دوپہر کے وقت کھاپی کر دیہات میں جانے کے لیے نکلے۔ شام ہوتے ہوتے وہ حگ باڑا میں پہنچے۔ یہاں بھی گاؤں کے باہر ہی ایک لٹھیت نے ان کا استقبال کیا۔ لٹھیت بائیس سال کا جوان لڑکا تھا۔ ارجن لال نے اُسے سمجھایا۔" ہم تو گھر بار چھوڑ کر تمہارے لیے جوکھم کھیل رہے ہیں۔ چاہتے ہیں، گاؤں کے لوگ آزاد ہو جائیں۔ کسانوں کو کوئی لگان نہ دینا پڑے۔ زمین دار کا ظلم ختم ہو۔ تم ہمارا ہی سر پھوڑنے کو پھر رہے ہو۔"

نوجوان کچھ پگھلا۔ اُس نے کہا۔" سڑک پار کھیتوں میں مڑھیا ہے، اُس میں جا کر چھپ جاؤ۔ اندھیرا پڑے میں آؤں گا، تب بات ہو گی۔ اس وقت گاؤں میں جاؤ گے تو بلّا ہو جائے گا۔ آگرے کے پاس کچھ لائن وائن اُکھڑی ہے۔ بلّا ہوا ہے تب سے تحصیل دار نے گاؤں والوں کا ہی پہرہ لگا دیا ہے۔ کوئی غیر آدمی آئے تو گاؤں میں گھسنے نہ پائے۔ گاؤں میں کوئی غیر دیکھا جائے تو تعزیری پولس بٹھائی جائے گی۔ گاؤں پر جرمانہ پڑے گا۔ سب لوگ گھبرائے ہوئے ہیں۔"

نوجوان رات ہونے پر ایک لوٹا ہاتھ میں لیے آیا۔ اُس نے چادر میں سے دو روٹیاں بھی نکال کر اُن لوگوں کو دیں۔ لوٹے میں دودھ تھا۔ نوجوان نے بتایا۔ وہ گاؤں میں دشا (پاخانہ) جانے کا بہانہ کر کے لوٹا ہاتھ میں لے کر آیا تھا۔ رات میں ٹونڈلہ سے سپاہیوں کی روند (راؤنڈ) چلتی ہے۔ تحصیل دار نے بتایا ہے کہ پورب میں جہاں جہاں لائن اُکھاڑی، لوگوں نے پولس کو پریشان کیا ہے۔ وہاں سرکار نے گاؤں پھونک دیے ہیں۔ لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ کسان سبھا

کے لال جھنڈے والے دو آدمی بھی آئے تھے۔ انھیں لوگوں نے گھیر کر پولس کے حوالہ کر دیا۔

ارجن نے یقین دلانے کے انداز سے نوجوان کو سمجھایا۔ "اب ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ دیش کے آزاد ہونے کا وقت آگیا ہے۔ جاپان نیتاجی کی مدد کر رہا ہے۔ نیتا جی ہندوستان کی سرحد پر آزاد ہند فوج کو لے کر آ پہنچے ہیں۔ تم لوگ سرکار کو غلّہ دینا بالکل بند کر دو۔"

نوجوان نے ٹوک کر کہا۔ "اجی لال جھنڈے والے کسان سبھا کے لوگ تو کہتے تھے کہ کھتّی بھرنے والے بنیوں کو غلّہ مت دو۔ یہ غریبوں کا پیٹ کاٹ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے بنگال کو بھوکا مار دیا۔ فوج اپنے دیس کو بچانے کے لیے جاپانیوں سے لڑ رہی ہے۔ اس کے لیے سرکار کو غلّہ بیچو۔ غلّہ نہیں دو گے تو شہر کے مزدور بھوکے مر جائیں گے۔ کپڑا اور دوسری چیزیں کون بنائے گا؟

ارجن لال نے جواب دیا۔ "لال جھنڈے والے کمیونسٹ رُوس کے دلال ہیں۔ روس انگریزوں سے مل گیا ہے تو لال جھنڈے والے بھی سرکار سے مل گئے ہیں۔ جاپان ہمارا دوست ہے۔ وہ نیتاجی کی مدد کر رہا ہے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ انگریز اب جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے دیس سے سب سونا چاندی سمیٹ کر نوٹ چلا دیے ہیں۔ نوٹ لے کر سرکار کو غلّہ دو گے تو پھوٹی کوڑی ہاتھ نہیں آئے گی۔ انگریز چلے جائیں گے تو ان کے نوٹ چیتھڑے بن جائیں گے۔ دیسی فوج کانگرس سے مل گئی ہے۔ نیتاجی کے ساتھ پانچ لاکھ ہندوستانی سپاہی انگریزوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ فوجی تو انتظار کر رہے ہیں کہ دیہات کے لوگ پہل کریں تو وہ ہتھیار لے کر اُس کی طرف ہو جائیں۔

جاڑے میں کھُلے آسمان کے نیچے کپڑوں کے بغیر رات کاٹنا مشکل تھا۔ نوجوان نے بتایا۔ رات کے چوتھے پہر ہاتھرس سے گاڑی ٹونڈلہ جاتی ہے۔ میٹھوالی کا اسٹیشن سڑک کے راستے تین میل ہے۔ سڑک ریل کی لائن کے ساتھ ساتھ گئی ہے۔ بہت سے مسافر اس گاڑی سے ٹونڈلہ جاتے ہیں۔ اندھیرا پاکھ ہے۔ لیکن آدھی رات کے بعد چاند نکل آئے گا۔ اِدھر سے مسافر نکلیں گے۔ تم بھی ساتھ ہو لینا۔

نوجوان کے چلے جانے کے بعد ارجن لال کچھ مایوس سا ہو گیا۔ تھکاوٹ سے اس کا بدن چور چور ہو رہا تھا۔ اُس نے دھن سنگھ سے کہا۔ "ابھی تو کان پور چلیں، وہاں دوسرے لوگوں سے مل کر ہی کچھ طے کریں گے۔"

اندھیرا بہت گہرا تھا اور جاڑا بہت کڑا۔ ارجن لال اور دھن سنگھ دبے لہجے میں باتیں کرتے

اسٹیشن جانے والے مسافروں کا انتظار کر رہے تھے۔ آدھی رات کے بعد سڑک پر مسافروں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

دھن سنگھ چلنے کے لیے جلدی میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھہرو"۔ ارجن لال نے سمجھایا۔ ہم لوگوں کو یوں اچانک نکلتا دیکھ کر یہ لوگ ہمیں چور سمجھ کر چلاّ نہ پڑیں۔ یا کہیں لٹھ ہی نہ دے ماریں۔ انھیں نکل جانے دو، ان کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔"

سڑک پر چار مسافر آ رہے تھے۔ تین مرد اور ان کے ساتھ ایک عورت تھی۔ دو مردوں نے جاڑے سے بچنے کے لیے بھورے رنگ کی رضائیاں اوڑھ رکھی تھیں اور ایک نے سفید رنگ کی دوہر۔ عورت بھی کوئی رنگین کپڑا اوڑھے تھی۔ اِن لوگوں سے بیس پچیس قدم پیچھے آواز کیے بغیر وہ دونوں سڑک پر نکل آئے۔ دونوں دلی سے بھورے رنگ کی ہلکی شال ساتھ لے کر چلے تھے۔ وہی اوڑھے تھے۔

جاڑے کے موسم کے کہرے بھرے آسمان میں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ سڑک پر گھور اندھیرا تھا۔ کالک سی برس رہی تھی۔ اندھیرے میں درخت اور بھی کالے معلوم ہوتے تھے۔ سر پر منڈلاتا کہر اور نیچے سڑک کی دھول ہی دھول اُڑتی معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کی جھاڑیاں بھی صاف نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ ارجن لال اور دھن سنگھ سے آگے آگے چلنے والے مسافر بھی چلتے پھرتے سائے معلوم ہو رہے تھے۔ سفید چدرے کی دوہر اوڑھے آدمی' میلے چونے سے بنے حد بندی کے اونچے کھمبے کی طرح چلتا معلوم ہو رہا تھا۔

جاڑے کی تیکھی ہوا کی سردی سے دھیان ہٹانے کے لیے ارجن لال اور دھن سنگھ آپس میں بات چیت کرتے جا رہے تھے۔ یکایک ارجن لال نے پوچھ لیا" وہ کون لوگ ہیں؟" سڑک بائیں طرف زمین سے اونچائی پر بنی ہوئی ریل کی لائن پر سے کچھ سائے سڑک کی طرف اُترتے دکھائی دیے۔

دھن سنگھ نے ارجن لال کا بازو تھام کر کہا" سپاہی معلوم ہوتے ہیں۔" وہ دونوں سڑک کے کنارے ایک پیڑ کے نیچے سائے میں گزر رہے تھے۔ سپاہیوں کی گالی اور دھمکی سنائی دی۔ "چلو لائن پر۔"

ارجن اور دھن سنگھ درخت کے سائے میں ٹھٹھک گئے اور ایک بڑی جھاڑی کی اوٹ میں ہو گئے۔ ریل کی لائن سڑک سے چالیس قدم سے زیادہ دور نہ تھی۔ مسافر آگے آگے اور سپاہی ان کے پیچھے پیچھے لائن کی طرف جانے لگے۔ وہ لوگ لائن پر پہنچے ہی تھے کہ بندوق دغنے کے بہت

زور سے دھماکے ہوئے۔ تین گولیاں چلیں۔ چیخوں کی آوازیں آئیں۔ دو گولیاں اور چلیں۔

ارجن لال اور دھن سنگھ سانس روکے جھاڑی کے پیچھے دبکے، ایک دوسرے کا کندھا پکڑے دھڑکتے دل سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ رونے کی آواز سنائی دی۔ عورت کا گلا تھا۔ سپاہیوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔

ایک سپاہی نے اونچی آواز میں گالی دے کر پچھمی پنجاب کی بولی میں کہا، "حرام زادی تو کیا رو رہی ہے؟ تیرے لیے تو پانچ سانڈ موجود ہیں۔ چپ رہ شور مچائے گی تو سرکار کا ایک کارتوس اور خرچ کرائے گی۔"

دوسرے سپاہی اور زور سے ہنس پڑے۔

ارجن لال سپاہیوں کی بات چیت سمجھ نہ سکا تھا۔ دھن سنگھ اس طرف کان لگا کر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سپاہی ہنس رہے تھے۔ "ارے یار، فضول ہی پریشان ہوئے۔ تینوں کے پاس کل سترہ روپے نکلے۔"

ایک بہت اونچی آواز سنائی دی۔ "سنو بھائی، یہ مالِ غنیمت ہے۔ خورشید کے پاس جمع رکھو۔ کل خورچے سے پانچ بوتلیں آئیں گی۔"

دوسرے نے گالی دے کر کہا۔ "یہاں لائن پر پڑے اسی سے وقت کٹے گا۔"

"ارے سالوں کی کمر ٹٹولو۔ یہ لوگ کمر میں روپیہ باندھتے ہیں۔"

سپاہی اس عورت کے بارے میں بھدا مذاق کرنے لگے۔ ایک سپاہی نے دیا سلائی جلا کر اپنے منہ کی طرف اُٹھائی۔ ہونٹوں میں سگریٹ تھامے اس کا چہرہ بہت ہی بھیانک معلوم ہوا۔ اس کے بعد اپنے دوسرے سپاہیوں کو بھی سگریٹ دیے۔ سپاہی سگریٹ کے دم لگانے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مرے ہوئے آدمیوں کی چتاؤں پر چنگاریاں دہکنے لگی ہوں۔

درختوں کی پھنگیاں اُجلی ہونے لگیں۔ اونچائی پر بنی ریل کی لائن پر کھڑے سپاہیوں کے چہرے دکھائی دینے لگے۔ ایک سپاہی نے اپنی رائفل زمین پر ٹیک دی اور جھگڑتے ہوئے سپاہیوں سے اونچی آواز میں کہا۔ "جھگڑنے کی بات نہیں ہے۔ لاٹری ڈالو، جس کا نمبر نکل آئے۔"

چاندنی سپاہیوں کے جسم پر اُترتی آرہی تھی۔ ان کی وردیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ایک سپاہی نے اپنی رائفل لائن کے سہارے ٹکا دی اور گولی کھا کر مرے ہوئے دو دیہاتیوں پر سے رضائیاں جھٹک کر اُتارنے لگا۔ رضائیاں لے کر وہ لائن سے اُتر کر اسی جھاڑی کی طرف چلا آرہا تھا جہاں ارجن

لال اور دھن سنگھ چھپے ہوئے تھے۔ اِن دونوں نے سانس روک کر سر جھکا لیے۔

جھاڑیوں کے بیچ خالی جگہ میں سپاہیوں نے دونوں رضائیاں ایک کے اوپر ایک بچھا دیں۔ وہ لوٹ کر گیا اور لائن کے پاس باہنوں میں سر چھپائے بیٹھی عورت کو بازو سے پکڑ کر رضائیوں کی طرف کھینچنے لگا۔

عورت ہاتھ جوڑ کر رونے لگی۔ سپاہی نے زور سے قہقہہ لگا کر گالی دی اور دھمکایا۔ "ابھی گولی مار دوں گا ..... کو۔" دوسرے سپاہی نے اِس گالی کے نیا پن پر قہقہہ لگایا۔

سپاہی عورت کو باہنہ سے کھینچ کر رضائیوں پر لے آیا۔ چاندنی میں عورت کے گالوں پر بہتے آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ سپاہی نے بلکتی ہوئی عورت کو باہنوں میں اُٹھا کر جھاڑیوں میں بچھی رضائی پر ڈال دیا۔ رضائی کا بستر ارجن لال اور دھن سنگھ سے صرف تین قدم کے فاصلے پر تھا۔ عورت کے بلک بلک کر رونے اور سپاہی کے بدحواسی میں بڑبڑانے کی آوازیں اِن دونوں کے کانوں تک آ رہی تھیں۔

دھن سنگھ کا بدن برفیلی سرسراتی ہوا میں بھی پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ آواز کے ڈر سے وہ ارجن لال سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ بدن میں ناقابلِ برداشت بے چینی، تمتماہٹ اور گرانی محسوس ہو رہی تھی۔ سانس گھُٹ رہی تھی۔ اُس نے ارجن لال کی باہنہ دبائی۔ ارجن لال کے دیکھنے پر اُس نے سپاہی کی طرف اشارہ کر کے اپنا گلا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سپاہی کو مار دینے اور عورت کو چھڑانے کی رائے دی۔

لائن پر کھڑے سپاہی اونچی آواز میں مذاق کر رہے تھے۔ "ابے نوشیر کے بچے، ہماری باری کا بھی خیال رکھنا۔ سالے خبردار! پہلے سب لوگ ایک ایک بار جائیں گے! جلدی کر بے۔ نہیں بنتا تو آکر تیری کمر پر ایک لات دوں۔"

ارجن لال نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کر کے انگلیوں سے بندوق چلانے کی نقل کی کہ وہ لوگ گولی مار دیں گے۔

عورت کو پکڑ کر لانے والا سپاہی گالی بکتا ہوا جھاڑیوں میں اُٹھ کھڑا ہوا اور پتلون کو کمر پر کستا ہوا لائن کی طرف چلا گیا۔ لائن کی طرف سے دوسرا سپاہی "میری باری" کہتا ہوا اس طرف دوڑ پڑا۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک پانچوں سپاہی آئے۔ عورت کی ہائے ہائے کی پکاریں دھیمی ہوتی جا رہی تھیں۔

پانچواں آدمی ابھی لوٹ نہیں پایا تھا کہ لائن پر کھڑے سپاہی چلا اُٹھے۔ "ابے قاسم روند آرہا ہے، سالے جلدی کر!"

لائن پر پورب کی طرف ایک بڑا تارہ سا چمکا۔ بہت تیز ٹارچ کی روشنی کی تکون بڑھتی چلی آرہی تھی۔

قاسم پتلون سنبھالتا ہوا لائن کی طرف بھاگ گیا۔ سپاہی اپنے برانکوٹ اور پیٹیاں کسنے لگے۔ کچھ منٹ بعد لائن پر ایک ٹرالی آکر ٹھہری۔ پانچوں سپاہیوں نے مستعدی سے لائن میں کھڑے ہوکر ٹرالی پر بیٹھے افسر کو سیلوٹ دیا۔

ٹرالی پر سے دو افسر اُترے۔ ایک انگریز اور دوسرا ہندوستانی تھا۔ دونوں افسروں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے ٹارچ تھے۔ ٹارچ جلا کر افسروں نے آپس میں مختصر سی بات چیت کی۔

ہندوستانی افسر نے سپاہیوں سے پوچھا۔ "کیا معاملہ ہوا؟"

ایک سپاہی نے ایک قدم آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "حضور یہ بدمعاش لوگ لائن کا پیچ کھولتا تھا۔ ہم لوگ ادھر روند پر گیا۔ ایک کھمبا پرے سے گولی مارا۔" انگریز افسر ٹارچ کی روشنی ڈال کر لائن کے آس پاس دیکھ رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی کی تیکھی تکون اس جھاڑی کی طرف گھومتی آرہی تھی، جہاں دھن سنگھ اور ارجن لال چھپے ہوئے تھے۔ وہ تیکھی روشنی ان کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں اور نیچے دبک گئے۔ دونوں افسر اس جھاڑی کی طرف اُتر آئے۔

دھن سنگھ اور ارجن لال کے دل دھڑک رہے تھے۔ انگریز افسر جھاڑیوں اور ڈھیلوں کو روندتا ہوا اسی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ دونوں کے بدن سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ ایسا لگا کہ انھیں بھی لائن پر لے جاکر گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ دھن سنگھ نے ہاتھ کی انگلیوں کے مُکّے کس کر طے کیا کہ افسر کا قدم ان کی جھاڑی پر پڑتے ہی اُس کی ناک پر پوری طاقت سے گھونسا مار دے گا اور ساری قوت لگا کر بھاگ جائے گا۔ پیٹھ پیچھے گولی مار دی جائے۔ لیکن وہ اس طرح جان نہیں دے گا۔

انگریز افسر اور اُس کے پیچھے پیچھے ہندوستانی افسر جھاڑی کی طرف آرہے تھے۔ ان کے ٹارچ کی روشنی جھاڑی سے بڑھ کر زمین پر بچھی ہوئی رضائی پر تھی۔ جھاڑی میں چھپے ہوئے دھن سنگھ کو دکھائی دے رہا تھا۔ رضائی پر عورت چت پڑی ہوئی تھی۔ گہری نیند میں تھی، یا بے ہوشی میں یا مر چکی تھی۔ عورت کی باہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ لہنگا کمر سے اوپر اُلٹا ہوا تھا۔

انگریز افسر نے عورت کے جسم پر نگاہ پڑتے ہی آنکھیں پھیر لیں، اور ٹارچ کی روشنی دوسری طرف

کردی۔ ہندوستانی افسر نے ٹارچ کو بجھا دیا۔ دونوں افسروں میں بحث سی ہو رہی تھی۔ انگریز کی آواز اونچی اور غصے سے بھری معلوم ہوتی تھی۔ ہندوستانی افسر لمبی بات کہہ کر اسے سمجھا رہا تھا، جواب دے رہا تھا۔

دونوں افسر لوٹ گئے۔ انگریز افسر غصے میں تھوکتا جا رہا تھا۔ واپس جا کر وہ کچھ بولے بغیر ٹرالی میں بیٹھ گیا۔ ہندوستانی افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "تم لوگ ابھی ایک دم ادھر سے مارچ کر کے سیدھا اسٹیشن کو جائے گا۔ لائن پر خبرداری رکھے گا۔ صبح کی گاڑی سے ٹونڈلہ پہنچ کر اسٹیشن کا دفتر میں رپورٹ کرے گا۔"

افسر نے جیب سے ایک نوٹ بک نکال کر کچھ لکھا۔ پرچہ پھاڑ کر ٹولی کے نائک کو دے دیا۔ "یہ کاغذ دفتر میں دے گا۔" سپاہی چستی سے ایک لائن میں ہو گئے۔ رائفلیں ان کے کندھوں پر پہنچ گئیں۔ اور ایک ساتھ بانہہ اور قدم اٹھاتے ہوئے پورب کی طرف چل دیے۔ ہندوستانی افسر بھی ٹرالی پر بیٹھ گیا۔ ٹرالی کی موٹر کا انجن غرایا۔ ٹرالی تیزی سے آگے چل دی۔

ارجن لال اور دھن سنگھ جھاڑی کے پیچھے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے بدن کے جوڑ اتنی دیر تک دبے رہنے کی وجہ سے سن ہو رہے تھے۔ بدن کی جکڑن کھولنے کے لیے انھوں نے بیٹھ اور گردن سیدھی کر کے انگڑائی لی۔ سامنے رضائی پر بے سدھ پڑی عورت دکھائی دی۔ ان کے سر شرم سے جھک گئے اور انگڑائی دب گئی۔ ہچکچاہٹ میں ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے رہے۔ دونوں سوچ رہے تھے۔ اس بے چاری کا کیا قصور؟ یوں ہی کیسے چھوڑ جائیں، لیکن عورت کی طرف دیکھنے اور اسے چھونے کی ہمت نہ ہوئی۔

عورت کے رندھے ہوئے گلے سے آہ کی آواز نکلی۔ کچھ کراہنے کی سی آواز آئی۔ عورت نے آدھی کروٹ لی اور لہنگا سنبھال کر سمٹ گئی۔ کہنی کے سہارے گردن اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔

ارجن لال نے ہٹ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھیا، چلو تمھیں گھر پہنچا دیں۔"

عورت زور سے رو اٹھی۔

ارجن لال نے دلاسا دے کر اسے گھر پہنچا دینے کی بات دہرائی، لیکن عورت سر پر ہاتھ مار کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "ہائے میں مر گئی۔ میں کہاں جاؤں گی! میں تو اب یہیں مروں گی۔ ان ناس پیٹوں کو لے کر۔"

ارجن لال اور دھن سنگھ بے بس تھے۔ عورت کو یوں چھوڑ کر جاتے نہ بنتا تھا۔ وہاں ٹھہرتے تو

کیا کرنے کے لئے! لائن پر گاڑی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ بے بسی میں ہونٹ دانتوں میں دبائے، آنکھوں میں آنسو روکے سڑک پر آ کر تیزی سے اسٹیشن کی طرف چلنے لگے۔ گاڑی کے ماتھے کی روشنی دور سے دکھائی دے گئی۔ وہ اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑے۔ مشکل سے وہ گاڑی میں بیٹھ پائے۔

ٹونڈلہ اسٹیشن سے سپاہیوں کی دو اسپیشل ٹرینیں پورب اور پچھم جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اسٹیشن خاکی وردی پہنے ہوئے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ دھن سنگھ کو ان میں سے ہر شخص دیس کا خون خوار، خونی معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا دل غصّے سے اُبل رہا تھا۔

ٹونڈلہ میں گاڑی میں بھیڑ بہت بڑھ گئی تھی۔ ارجن لال اور دھن سنگھ بھیڑ میں دبے بیٹھے تھے، اور مسافر دھنسے آنا چاہتے تھے۔ کھڑکی میں سے کسی نے دو تین بار پکارا۔ "پنڈت، او پنڈت! ارجن بھائی، ارے پہچاننا ہی نہیں چاہیے؟ ارے میں ہوں محفوظ۔ جگہ بناؤ میرے لیے۔"

ارجن نے ہاتھ بڑھا کر محفوظ کو کھڑکی سے کھینچ لیا۔ پہلے ہی سے تکلیف میں بیٹھے لوگ شکایت کرنے لگے۔ ارجن لال نے انھیں چپ کرنے کے لیے کہا۔ "ارے بھائی جانتے ہو، یہ سرکاری آدمی ہیں۔ چاہے تو ہم سب کو اُتروا دے۔"

"اب یوں جوتیاں مارو گے دوست۔" محفوظ نے اپنے روکھے بالوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا بات کرتے ہو۔" ارجن لال ہنس دیا۔ "کب آئے دیولی سے؟ کیسی کٹی؟"

"اما یار اپنا کیا ہے۔ باہر تھے تو سرکار سے لڑتے تھے۔ جیل میں رہے تو لڑتے رہے۔ اب بھی سی۔ آئی۔ ڈی والے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔" آس پاس بیٹھے لوگوں نے بھی دھیان دیا اور دھن سنگھ نے بھی۔

ارجن لال پھر ہنس دیا۔ "پولس خواہ مخواہ تمہارے پیچھے ہے۔ تم تو جنگ میں انگریزوں کی مدد کر رہے ہو۔ کہتے ہو پیپلز وار ہے۔"

محفوظ اونچی آواز میں بولا۔ "ہے تو، کہتے ہیں۔ انگریزوں کی مدد تو تمہارا گاندھی بھنڈار کرتا ہے، جو فوج کو کمبل سپلائی کر رہا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں جاپانیوں سے اپنے ملک کی حفاظت کرو۔ ہم تو کہہ رہے ہیں لڑائی ہماری ہے۔ ہمارے نیتاؤں کو جیل سے چھوڑ دو۔ ہم خود جاپان سے لڑیں گے انگریز تو ملک کو برباد کر رہے ہیں۔ وہ لڑ نہیں پاتے۔"

سیاسی بحث شروع ہو گئی۔ ارجن لال نے جوش میں آ کر کہا۔ "تم کہتے ہو لڑائی میں انگریزوں کا ساتھ دو۔ لو سنو۔" اُس نے پچھلی رات کا دیکھا واقعہ کہہ سنایا۔

دھن سنگھ چپ چاپ سُن رہا تھا۔ اُسے بار بار خیال آرہا تھا۔ ریڈیو پر نیتا جی نے کہا تھا کہ ہندوستانی فوج انگریزوں سے بغاوت کر کے اپنے ملک کی طرف سے لڑنے کے لیے تیار ہے۔ ارجن لال بھی دیہات میں یہی سمجھا کر آرہا ہے۔ یہی ہے ہندوستانی فوج کی وطن پرستی۔ اُس کا دھیان بحث سے اُچٹ کر پہاڑوں میں بچھڑ جانے والی سوما کی طرف چلا گیا۔ اُس رات اگر میں اُن بدمعاشوں کو نہ مار دیتا..... سوما کوٹھری میں ہوتی اور غلطی سے کواڑ کھول دیتی تو اُس پر کیا بیتتی؟

دھن سنگھ انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے حادثے کے بعد انگریز اور ہندوستانی افسر کی بحث سمجھ نہیں سکا تھا۔ ارجن لال جوش میں بحث بھی سُنا گیا۔ "انگریز افسر ہندوستانی سپاہیوں کی حرکت پر ناراض ہو کر اُنھیں وہیں سزا دینا چاہتا تھا۔ ہندوستانی افسر اس کی حمایت کر رہا تھا کہ مہینے بھر سے لائن پر پڑے ہیں۔ اگر یہ لوگ دیہات کے لوگوں سے بھائی چارہ بنانے لگیں تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ یہ لوگ بھی باغیوں سے مل جائیں گے۔"

محفوظ نے پوچھ ہی لیا۔ "یہی ہے تمھاری انقلاب کی تیاری، اب کہو۔"

ایک بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔ "بھائی اور جو کہو۔ انگریز انصاف کرتا ہے۔"

محفوظ نے مخالفت کی۔ "انگریز اگر انصاف کرنے والا ہوتا تو دوسرے کے ملک پر کیوں قابض رہتا؟ اب لوگوں کے دماغ پر قبضہ رکھنے کے لیے، اور آپ لوگوں کے دل میں اپنی عزّت اور اعتبار قائم رکھنے کے لیے وہ ایسا انصاف دکھاتا ہے۔ آپ انگریزوں کے غلام کتوں کے سلوک سے ہندوستانیوں کے کیرکٹر کا اندازہ لگاتے ہیں۔ واہ کیا عقل ہے آپ کی! یہ فوج ایسے ظلم اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عوام کا نہیں، عوام پر ظلم کرنے والوں کا نوکر سمجھتی ہے۔"

محفوظ نے ارجن لال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "اسی فوج کے بھروسے پر آپ ۴۲ء میں انگریزوں سے بغاوت کرنے چلے تھے؟"

ارجن لال دوسری بات کرنے لگا۔ اُس نے دلی جیل کے قصے اور محفوظ نے دیولی کیمپ کے قصے سنائے۔ دھن سنگھ چپ بیٹھا رہا۔

کان پور میں ارجن لال تین دن تک دھن سنگھ کو لیے گھومتا رہا۔ کان پور میں اُس نے اپنی ابتدائی سیاسی زندگی کے دن گزارے تھے۔ کانگریس کی طرف سے میونسپلٹی کے چناؤ میں حصّہ لیا تھا۔ یہاں اُس کے جانے پہچانے لوگ بہت تھے۔ بہت بھروسے سے وہ کانپور گیا تھا۔ لیکن بھروسہ ناامیدی میں بدلتا جا رہا تھا۔

کان پور میں پولس کا جال دلّی سے کم نہ تھا۔ کانگرس کے کچھ کر دھر سکنے والے لوگ گرفتار ہو چکے تھے۔ یا فرار تھے۔ ارجن لال موتی بھائی کے یہاں پہنچا۔ ۳۶ء کے میونسپل چناؤ میں اُس نے موتی بھائی کی بہت مدد کی تھی۔ موتی بھائی کبھی کبھی اپنی آڑھت پر ارجن لال کے نام سے دو ایک سودے کر کے اُس کی کچھ مدد کر دیا کرتے تھے۔ اسی آسرے پر ارجن لال مطمئن ہو کر سیاسی کام کرتا تھا۔ دلّی میں رامو بھائی کے یہاں اُسے موتی بھائی نے ہی لگا دیا تھا۔

موتی بھائی نے اِس وقت شہر کی حالت کا خیال کر کے ارجن لال اور اُس کے ساتھی کو جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ "جسے دیکھو ہمیں کھائے جاتا ہے۔ بازار تو سب چوپٹ ہو گیا ہے۔ سرکار نے سب کام چوپٹ کر دیا ہے۔ تم لوگوں کو چاہیے دیہاتوں میں جا کر کسانوں کو سرکار کی مدد نہ کرنے کو کہو۔ یہ توڑ پھوڑ کانگرس کا کام نہیں ہے۔ اسی لیے تو گاندھی جی برت رکھ رہے ہیں۔

ارجن لال اور دھن سنگھ موتی بھائی کے یہاں سے مایوس ہو کر لاٹھی محال کی راہ پر جا رہے تھے کہ ایک دوسرے آڑھتی مل گئے۔ جو شہر کوتوال کی محفل میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اور در پردہ کانگرس سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔

ارجن لال نے انھیں "جے رام جی" کہہ کر پکار لیا۔ وہ کچھ گھبرائے اور پھر ارجن لال کو دھن سنگھ سے ذرا الگ لے جا کر بولے۔ "بھلے آدمی، تم یوں پھر رہے ہو۔ پولس تمھیں ڈھونڈ رہی ہے۔"

ارجن لال نے کہا۔ "میں ابھی پرسوں تو آیا ہوں۔ کچھ بات بھی نہیں ہوئی۔ کیا وارنٹ ہے؟"

"وارنٹ نہ بھی ہو۔ کوتوال کے یہاں تمہارا ذکر ہو رہا تھا کہ شہر میں ہو۔ ہڑتال وڑتال کروا تے رہے ہو۔ کان پور تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"کہاں چلے جائیں؟ ...... ابھی دلّی جیل سے آ رہے ہیں۔"

"ارے کہیں چلے جاؤ۔ بمبئی چلے جاؤ۔ جب تک دن اچھے نہیں ہیں، کچھ روزگار ہی کر لو۔ بمبئی میں ہمارے اپنے آدمی ہیں، اُن کی آڑھت پر چلے جاؤ۔"

"پھر ملوں گا آپ سے۔" اِدھر اُدھر دیکھ کر ارجن لال نے کہا۔

"گھر پر تو آنا مت۔ بمبئی میں شیخ میمن اسٹریٹ میں ۹۶ نمبر ہے۔ اُن کا نام جگ جیون

بھائی ہے۔ تم نکل جاؤ کان پور سے۔ یہاں آب و ہوا ٹھیک نہیں ہے۔ سمجھے!" اور وہ آگے پیچھے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔

ارجن لال تلک ہال میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سوچا وہاں نہ لوٹنا چاہیے۔ لیکن جائے تو کہاں؟ گلیوں میں سے ہو کر وہ ایک پرانے ملاقاتی کے یہاں کرنل گنج میں جانا چاہتا تھا۔ گلی کے موڑ پر مل گیا گنیش۔ وہ سائیکل کو پکڑے ٹھیلتا ہوا چلا آرہا تھا۔ ایسے وقت میں کمیونسٹ سے ملاقات ہو جانا ارجن کو اچھا نہ لگا۔ مگر سامنا ہو گیا تھا۔ گنیش نے ارجن لال کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "دوست کہاں؟"

گنیش اور ارجن کی پرانی ملاقات تھی اور دونوں ایک دوسرے سے ملاقات کر رہے تھے۔ دونوں نے ۱۹۳۵ء کی ہڑتالوں میں ساتھ کام کیا تھا اور اس کے بعد چناؤ میں ایک دوسرے کے خلاف لڑے بھی تھے۔

ارجن نے پوچھا۔ "کہو بھائی، استالن کا کوئی خط آیا؟ اب کون فرنٹ (مورچہ) بدلنے کا حکم آیا ہے؟"

گنیش نے جواب دیا۔ "تو جو کا خط آیا ہے کہ انگریزوں کو نکال کر جاپانی حکومت قائم کرنے میں جتنے سوشلسٹ، کانگرسی مدد کریں گے، سب کو تھانے داری یا راشن شاپ (دکان) کا پرمٹ دیا جائے گا۔"

"اور جو کمیونسٹ کانگرسیوں کو گرفتار کرا رہے ہیں، انھیں انگریز تحصیل داری دیں گے۔"

"کس سالے نے، کس مادر..... کو گرفتار کرایا ہے!" گنیش نے ارجن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر اور منھ اُس کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔ "کل سب انسپکٹر چوبے تمھیں پوچھ رہا تھا۔ ہم نے کہا، ہم سے مطلب؟ وہ بولا۔ ارے صاحب شہر میں آ گئے ہیں۔ آپ سے نہ ملیں گے! اور پھر حرامی کہتا تھا کہ وہ لوگ آپ کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ نہ جانے کتنوں کو دیولی بھجوا دیا۔ اپنے لیے کہنے لگا۔ ہم تو سب کو ایک سا سمجھتے رہے۔ آنکھ بچا جاتے تھے کہ کیوں پریشان کریں۔"

"میں نے سالے کو ڈانٹا۔ ہم تمھیں خوب جانتے ہیں۔ دوسروں سے کہتے ہو کمیونسٹ کانگرسیوں کو پکڑواتے ہیں۔ خیر کہو تو تمھارے پردھان جی جہاں چھپے ہیں ملا دوں..... ملو گے؟"

"ہاں مل لیں گے۔" ارجن لال نے کہا، اور سوچا مل لیں، ان سے شاید کوئی کام کوئی راہ نکل آئے۔

گنیش ارجن لال کو دو قدم ایک طرف لے گیا اور پتہ بتا کر کہا "وہاں ان کا نام لینا۔ کہنا داؤ جی سے کام ہے۔" ارجن لال نے گنیش کی سائیکل لے لی۔ دھن سنگھ کو گنیش کے ساتھ جانے کو کہہ دیا اور فوراً دوسری طرف چلا گیا۔

دھن سنگھ گنیش کے ساتھ چپ چاپ گلی گلی جا رہا تھا۔ گنیش نے جیب سے دو بیڑیاں نکال کر کہا "کامریڈ بیڑی پیو!" دھن سنگھ کو بیڑی دے کر پوچھا "تم ان کے ساتھ ہی ہو! دلی سے آئے ہو! دلی میں کیا حال ہے؟"

"وہاں بھی ایسا ہی حال ہے۔ اب انگریز سے تو کوئی لڑتا نہیں۔ آپس ہی میں لڑ رہے ہیں۔ لیڈر کہیں کوئی ملتا نہیں۔ آپ کے ایک ساتھی دیوان چند ہمارے ساتھ جیل میں تھے۔" دھن سنگھ نے بے دلی سے جواب دیا۔

"اچھا دیوان چند کو جانتے ہو؟" "وہ یہاں آ گئے ہیں مگر الٰہ آباد گئے ہیں۔ دس پندرہ دن میں آئیں گے۔ اب تمہارا کیا خیال ہے؟ لیکن ابھی جیل سے آ رہے ہو۔ تم دیکھ سمجھ لو۔"

دھن سنگھ نے بیڑی ختم کر کے کہا "ہاں ارجن بھائی جیسے کہیں گے۔"

ارجن لال واپس آیا تو اور بھی اُداس تھا۔

گنیش نے پوچھا "کیوں بات کیا ہوئی داؤ جی سے؟"

"کہتے ہیں، ابھی گاندھی جی کا برت ختم ہوا ہے۔ جب تک حکومت سے ان کی خط و کتابت نہ ہو لے، انتظار کرنا ٹھیک ہوگا۔ کہتے ہیں اس وقت تک دیہات جا کر حکومت کے ہاتھ غلّہ نہ بیچنے کا پرچار کرو۔" ارجن نے اُداس ہو کر جواب دیا۔

گنیش بولا "ٹھیک ہے۔ کانپور کی حالت دیکھ ہی رہے ہو۔ غلّے کے لیے چاہے جس دن فساد ہو جائے۔ تم شہر میں اور غلّہ نہ آنے دو۔ آسام میں سامان نہ پہنچے۔ جاپانی بڑھے چلے آئیں گے۔ کلکتے میں تین بار بم گر چکے ہیں۔ پورب سے چالیس لاکھ آدمی بھاگ کر آئے ہیں۔ کل یہاں بم گرے گا تو کہاں جائیں گے؟ انگریز ایک مرے گا تو ہندوستانی دس ہزار۔ برما نے جاپانیوں کو خوش آمدید کہا تھا۔ جب سے جاپانی آئے ہیں وہاں مارشل لا لگا ہے۔ جنتا بھاگ بھاگ کر جنگلوں میں جا چھپی ہے۔ اور اب اپنی جان بچانے کے لیے لڑ رہی ہے۔ لیکن وہاں کے سرمایہ دار اب بھی جاپان کی خوشامد کر رہے ہیں۔ تمہارے ٹاٹا، گپتا، برلا بھی انتظار میں ہیں کہ تو جو کو سب سے پہلے سلام کریں۔"

ارجن لال بہت دکھی تھا۔ ایک چٹائی بچھا کر چپ چاپ لیٹ گیا۔ سو گیا یا سوچتا رہا۔ گنیش اس کی بغل میں لیٹ کر خرّاٹے بھرنے لگا۔ دھن سنگھ دوسری چٹائی پر لیٹا تھا۔ اسے اپنی زندگی بے سہارا اور برباد معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ کر سکنے کے دروازے ہر طرف بند تھے۔ ظلم کے خلاف کچھ کرنے پر سرکار اور پولس کی سزا۔ سرکار اور پولس سے لڑنے کے لیے کوئی سہارا نہیں۔ لوگ سرکار سے لڑنا نہیں کھیل کھیلنا چاہتے تھے۔ اس کی تو زندگی موت کا سوال تھا۔ وہ سوما کو چھوڑ آیا تھا۔ اس کے بغیر سوما کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ ریلوے لائن پر رات میں دیکھا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ سوما کے ساتھ بھی اگر ایسا ہی ہو؟ اگر وہ نزدیک ہوتی تو اُس کی حفاظت میں اپنی جان تو دے سکتا۔

دھن سنگھ نے سوچا۔ پچھلی رات وہ کیا کر سکا۔ اُس کا دل شرم اور غم سے بھر گیا۔ وہ تو تیار تھا۔ ارجن لال نے روک دیا تھا۔ اُس کا دل ارجن لال سے پھٹ گیا۔ یہ ڈرپوک آدمی ہے۔ یہ لیڈر ہے چھوٹا لیڈر اور دوسرے بڑے لیڈر ہیں۔ چھپے بیٹھے ہیں کہ گرفتار نہ ہو جائیں۔ یہ لڑیں گے کیا۔ سب کو اپنی اپنی جان کی پڑی ہے۔ آرام سے جو ہیں سالے!

دھن سنگھ کو پھر سوما کی یاد آ گئی۔ سرولا صاحب کے یہاں تھی۔ اگر لالہ جی نے جھگڑے میں پڑنے کے ڈر سے نکال دیا ہو! گزارہ کیسے کرتی ہوگی۔ بدمعاش اس کے پیچھے پڑ گئے ہوں گے۔ میں یہاں چھپ چھپ کر کوئی بہادری کر رہا ہوں۔ دن میں ارجن لال کے ساتھ مول گنج سے گزرا تھا۔ وہاں چھجے پر بیٹھی بے رونق چیتھڑا سی عورتوں کے چہرے یاد آنے لگے۔ کتنوں کے آدمی انھیں چھوڑ گئے ہوں گے؟ کیا کرتیں بے چاری؟

صبح دھن سنگھ کی نیند ٹوٹی تو گنیش غائب تھا۔ ارجن لال چپ چاپ فکر مند بیٹھا تھا۔ دھن سنگھ کو جاگا ہوا دیکھ کر ارجن لال نے کہا۔ ”دھن سنگھ بھائی اب یوں نہیں چل سکے گا۔ ہم دو چار روز کے لیے دیہات اپنے گھر جائیں گے اور پھر سوچا ہے کہ بمبئی نکل جائیں۔ یہاں پھر سے جیل میں جا بیٹھے تو کیا فائدہ؟ ہم اکیلے میں کر بھی کیا سکیں گے؟ اب تم بھی کہیں نوکری چاکری کر لو۔ کان پور میں کام کی کمی نہیں ہے۔ یہاں تمہیں پہچانتا کون ہے؟“

ارجن لال اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہمارے گاؤں کے لیے بس صبح ہی جاتی ہے۔ تمھیں ضرورت ہو تو لاٹھی محال میں موتی بابو سے مل لینا۔ ہم نے تمہارے بارے میں اُن سے کہہ دیا ہے۔“ اس نے کُرتا اُٹھا کر بنڈی کی جیب سے پانچ پانچ روپے کے دو نوٹ نکال کر دھن سنگھ کی طرف بڑھا دیے ”لو تب تک یہ کام دیں گے۔ دو چار دن میں کچھ کر ہی لو گے۔“ ارجن لال زیادہ باتیں کیے بغیر

مکان کے تنگ زینے سے اُتر گیا۔

دھن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے، اُنھیں ہونٹ کاٹ کر پی گیا۔ ارجن لال کے دیے روپے لینے میں اسے اپنی توہین محسوس ہوئی، لیکن لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس دور دیس میں ارجن لال ہی کا سہارا تھا۔ ارجن لال اسے ایسے چھوڑ کر چل دیا تھا جیسی لمبی کٹھن راہ میں تھک جانے پر کوئی بے کار بوجھ کو پھینک دے۔ دھن سنگھ کے ہاتھوں میں طاقت اور دل میں ہمت تھی لیکن ہاتھوں کی طاقت اور دل میں ہمت سے موقع ملے بغیر کیا ہو سکتا تھا؟ اس لیے یہ روپیہ ہی کھانے، پناہ اور کہیں آنے جانے میں مددگار ہو سکتا تھا۔

دھن سنگھ کوٹھری سے اُٹھ کر دیوار سے گھرے آنگن کے فرش پر بیٹھ گیا۔ پھاگن کی پیلی پیلی دھوپ اور پھرپھراتی ہوا ایسی ہی تھی جیسا موسم کانگڑا میں بیساکھ جیٹھ میں ہوتا ہے۔ آس پاس اُونچے اُونچے مکان تھے۔ پھڑپھڑاہٹ کی آہٹ سُن کر دھن سنگھ نے گردن پھیر کر دائیں طرف دیکھا۔ بغل کی اونچی چھت پر ایک عورت بھیگی دھوتی کو نیچے لٹکا کر سلوٹیں نکالنے کے لیے جھاڑ کر سوکھنے کو ڈال رہی تھی۔ دیوار کے اوپر دکھائی دیتی عورت کے بدن پر بے پروائی سے پڑے دھوتی کے آنچل کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

دھن سنگھ نے اپنے پہاڑی دیس میں عورت کو ایسی بے پردگی کی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ عورت دیوار پر کہنی ٹکائے جھک کر نیچے آنگن میں دیکھ رہی تھی۔ نگاہ اوپر کرنے سے دھن سنگھ کو عورت کے آنچل کے نیچے سے خوب اُبھرا سینہ دکھائی دے جاتا تھا۔ اُس کی آنکھیں جُھک گئیں۔ اسے جان پڑا عورت کسی سے بات کر رہی تھی۔ بات چیت دھن سنگھ نہ سمجھ پایا۔ دوسری آواز بھی عورت ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ اوپر دیکھنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ نزدیک ہی پانی گرنے کی ٹپ ٹپ سی آواز ہوئی۔ اُس نے اُدھر دیکھا۔ پیک تھی۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

دھن سنگھ نے اپنے اوپر مذاق کی کھلکھلاہٹ سنی تو غصے میں آنکھیں اوپر اُٹھے بغیر نہ رہ سکیں۔ دیکھا۔ دھوتی سوکھنے ڈالنے والی عورت کے ساتھ ایک اور جوان عورت تھی۔ دونوں دیوار پر کہنیاں ٹکائے، پان چباتی ہوئی اُس پر ہنس رہی تھیں۔ دھن سنگھ کے دل میں ہوا کہ انھیں پھٹکار دے۔ لیکن اوپر کھلے ہوئے چار گیندوں کی وجہ سے اُس کی نظریں جھک گئیں۔ نفرت سے دانت پیس کر چپ رہ گیا۔

ایک عورت نے اُسے سنا کر کہا، "جانے کہاں سے نگوڑے لنڈورے اکٹھے ہو گئے ہیں محلّے میں!

بدمعاش ہیں۔ نہ جانے کہاں سے روز نئے نئے چلے آتے ہیں۔"

دوسری نے کہا۔"بھلے لوگ ہوتے تو عورتیں نہ ہوتیں ان کے ساتھ۔ بدمعاش تو ہیں ہی۔"

عورت کے منہ سے گالی اور چھیڑ خانی سُن کر دھن سنگھ کی ڈرائیور والی عادت جاگ اُٹھی۔ للکارنا چاہتا تھا۔ 'یہاں آؤ تو بتاؤں'، لیکن فوراً پردیس میں گھرے رہنے کا خیال آیا۔ ہونٹوں پر آئی بات ہونٹوں میں ہی رہ گئی۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔ وہاں بیٹھ کر توہین سہنا ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ وہ اُٹھا اور زینے سے نیچے اُتر گیا۔

بازار میں آکر دھن سنگھ کی خواہش ہوئی کچھ کھانے پینے کی جگہ دیکھے۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ رہے گا کہاں ؟ اِس بڑے شہر میں کس کے سہارے رہے گا۔ ارجن لال بھروسہ دے کر ساتھ لایا تھا مگر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دھن سنگھ کا تو گھر بار تھا نہیں، جو تھا اس سے وہ بچھڑ چکا تھا۔ خیال آیا کمیونسٹوں کے ساتھ ہولے لیکن ارجن لال نے ان لوگوں سے بچے رہنے کے لیے کہا تھا، کہ وہ لوگ انگریزوں کے ایجنٹ بن گئے تھے۔

ارجن لال دھن سنگھ کا ساتھ چھوڑ کر گیا تھا۔ اُس کی بات پر دھن سنگھ کو بھروسہ نہ رہا۔ لیکن کمیونسٹوں سے وہ اُمید کیا رکھتا ؟ ارجن لال نے بڑے بڑے لوگوں سے اپنے تعلقات اور اُن پر اپنے اثر کی باتیں کی تھیں۔ کانگرس والنٹیر سینا میں بھرتی کرادینے کا یقین دلایا تھا۔ دھن سنگھ نے دیکھا کہ کمیونسٹوں کے یہاں تو لیٹنے کے لیے پلنگ بھی نہیں تھے۔ ان سے وہ کیا اُمید رکھتا۔

دھن سنگھ جی کڑا کر کے سیٹھ موتی بھائی کے یہاں لاکٹی محال میں پہنچا۔ اور عرضی کی صورت میں ارجن لال کا پیغام دیا کہ ضرورت کے وقت سیٹھ جی ضرور مدد کریں گے۔ اور بتایا کہ وہ کانگرس کے اندولن (تحریک) میں چھ مہینے جیل کاٹ کر آیا تھا۔ اب اسے اگر کوئی نوکری مل جائے۔!

سیٹھ جی نے کہا۔"کچھ لکھے پڑھے تو ہو نہیں کہ منیمی یا کلرکی کرو۔ تمہاری کوئی ضمانت یا جان پہچان بھی نہیں ہے کہ دربانی، چوکیداری ہی دلادیں۔ نوکری کرنا ہے تو سرکار کی کرو۔ کانگرس کی تو اُلٹے مدد کرنی چاہیے۔ بھگوان نے تمہیں اچھا بھلا بدن دیا ہے۔ بازار میں کام کی کیا کمی ہے۔ کچھ دن پلّے داری ہی کر لو۔ کانگرس میں کام کرنے والے سبھی نیتا بن جائیں تو کیسے کام چلے گا ؟"

دھن سنگھ موتی بابو کے یہاں سے چپ چاپ لوٹ آیا۔ اِس توہین سے اُسے اتنا ہی غصّہ آیا جتنا کہ اُس کے دل میں بیج ناتھ کے تھانے دار کے لیے تھا۔ وہ آزادی کا سپاہی بننا چاہتا تھا اسے کہا گیا، بوجھ ڈھونے والا قلی بن جائے یا سرکاری نوکری کرے۔

دھن سنگھ دن بھر کان پور کے بازار میں گھومتا رہا۔ بھیڑ کی وجہ سے کندھے سے کندھے چھِلتے تھے۔ سینما گھروں کے سامنے کمبھ کے میلے لگے ہوئے تھے۔ سبھی لوگ خوش اور اپنے کام میں مگن تھے۔ انگریزوں کے خلاف آزادی کے لیے بغاوت کی جو تصویر دلی جیل میں اُس کے تصور میں بن گئی تھی، سب جھوٹی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ رات کے بارہ بجے تک گھومتا رہا۔ رات کاٹنے کا سوال سامنے تھا۔ صرف ایک جگہ تھی۔ کمیونسٹوں کے اڈّے پر چلا جائے اور چٹائی پر جا لیٹے۔

دھن سنگھ کو نیند نہیں آ رہی تھی مگر وہ چپ چاپ پڑا تھا۔ ایک طرف گنیش اور اُس کے آگے قاسم لیٹے ہوئے تھے۔ قاسم بتا رہا تھا، وہ آرڈی ننس فیکٹری میں بھرتی ہو گیا ہے۔ کسی سالے نے کوئی تحقیقات نہیں کی۔ سرکار کو آدمیوں کی بھوک تھی، چاہے لاکھ بھرتی ہو جاتے۔ گنیش نے پُکار لیا۔

"کامریڈ۔"

"جی۔" دھن سنگھ نے جواب دیا۔

"کیا کرنے کا خیال ہے؟"

کچھ سوچ کر دھن سنگھ نے جواب دیا۔ "چاہتا ہوں کہیں نوکری مل جائے۔ ڈرائیوری کا کام جانتا ہوں۔"

"لائسنس ہے؟"

"نہیں، لائسنس تو نہیں ہے۔"

پنجاب میں بھی کافی توڑ پھوڑ ہوئی ہے؟ اخبار میں تو کچھ نہیں آیا۔"

"معلوم نہیں۔ میں تو ارجن لال کے ساتھ دلی جیل میں تھا۔"

"تم دلی میں ہی تھے۔ وہاں کے پنجاب پارٹی کے کامریڈوں کو جانتے ہو؟ پنجاب میں ہمارا کسان فرنٹ اچھا ہے۔"

"میں کسی کو نہیں جانتا۔"

"نوکری کرنی ہے تو لائسنس لینا ہو گا۔ کہہ دینا چوری ہو گیا۔"

"پولس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیا کچھ معاملہ ہے؟" گنیش نے دھن سنگھ کی طرف کروٹ بدل کر دیکھا اور کہا۔ "تو کون تمہارا فوٹو لیے بیٹھا ہے۔ دوسرا نام بتا دینا یا ابھی کوئی اور نوکری کر لو۔ سوال یہ ہے کہ کیا کرنا

چاہتے ہو؟"

"میں پڑھا لکھا بھی تو نہیں ہوں۔" دھن سنگھ نے کہا۔

دھن سنگھ کی آواز میں درد کی وجہ سے گنیش دوسری باتیں کرنے لگا۔ گنیش کچھ منٹ میں سو گیا۔ دھن سنگھ نے طے کیا۔ کسی کی باتوں میں نہ آ کر اپنے ہی دل سے سوچو۔

دھن سنگھ اگلے دن صبح راہ پوچھتا پوچھتا چھاؤنی جا پہنچا۔ ناپ کی لاٹھی کے لیے ایک بھرتی والا مل گیا۔ دھن سنگھ نے اس سے پوچھا۔ "بھرتی کا دفتر کہاں ہے؟"

"بھرتی ہو گے؟"

"ڈرائیوری میں بھرتی ہوں گے۔"

"لائسنس ہے؟"

"سامان کے ساتھ چوری ہو گیا۔"

اس آدمی نے دھن سنگھ کی طرف ایک سگریٹ بڑھا دیا۔ خود بھی سگریٹ سلگا کر بولا۔ "ہم سب کرا دیں گے۔ بولو کیا دلواؤ گے؟"

دھن سنگھ مسکرا دیا۔ "بابو سنا ہے بھرتی ہونے کا انعام ملتا ہے، تم اُلٹا ہم سے مانگ رہے ہو۔ ہم خود ہی جائیں گے۔"

اُس آدمی نے دھن سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "پنجابی ہو نا تبھی خود سے جاؤ گے۔ استاد لائسنس نہیں ہے۔ بیس جھگڑے ہوں گے۔ تحقیقات ہو گی۔ پولس گھر تک پہنچے گی۔ سمجھے استاد! تمہاری جیب سے تھوڑے ہی مانگ رہے ہیں۔ انعام میں سے دس روپے دینا۔"

دھن سنگھ نے منظور کر لیا۔

آدمی نے پوچھا۔ "افسر لائسنس کے لیے پوچھے تو کیا کہو گے؟"

"سچ کہہ دیں گے۔ ریل میں اسباب کے ساتھ چوری ہو گیا۔"

"اماں اتنے سیدھے ہو تبھی بھرتی ہونے پنجاب سے کان پور آئے ہو۔ راستے میں بھلا کوئی جگہ تھی۔ ہمیں سکھانے چلے۔ یہاں روز ہی یہ کام ہے۔ جانے کتنے فراریوں کو بھرتی کرا دیا ہے۔"

دھن سنگھ کو حیرت ہوئی۔ لیکن بظاہر مسکرا دیا۔ "بھیّا ہم دھوکا نہیں دے رہے ہیں۔

تم اپنے وس پندرہ لے لینا - لائسنس کھو گیا ہے تو کیا کریں ؟"

"تم کہنا کلکتے میں نوکری کرتے تھے - کہنا ٹیکسی چلاتے تھے سمجھے - کہنا گاؤں جا رہے تھے کہ کمائی گھر والوں کو دے کر بھرتی ہو جائیں گے کہ راہ میں سب مال اور لائسنس چوری ہو گیا -"

دھن سنگھ نے اقرار کے انداز میں سر ہلا دیا -

"کون ضلع ہے تمہارا ؟"

"ہوشیار پور -"

"قوم" ؟

"راج پوت -"

"ٹھیک - تو سمجھ گئے ؟"

"ہاں -"

معزز لوگ

سوما بیرسٹر سرولا صاحب، ان کی پتنی، منورما بی بی، بھوپی اور دیپا کے ساتھ لاہور آ گئی۔ سوما دھن سنگھ کے فرار ہو جانے کے بعد ڈھائی مہینے لالہ جی کی کوٹھی میں رہی تھی۔ پچھلے برس بھی وہ چار مہینے وہیں رہی تھی اور زندگی کے ایک نئے باعزت طریقے کا پتہ پا چکی تھی۔ لاہور کی کوٹھی میں آ کر اُس نے کچھ اور دیکھا۔ دھرم شالہ کی کوٹھی میں نئے اور پرانے کا میل تھا۔ خاندان کے ڈھنگ اور طور طریقے پر ایک حد تک لالہ جی اور ماں جی کا حکم چلتا تھا۔ لاہور کی کوٹھی میں مالک لالہ جی نہیں، بیرسٹر صاحب تھے۔ یہاں نئے طریقے زیادہ تھے اور پرانے بہت کم اور وہ بھی صرف بھابی کے آس پاس ہی۔ طور طریقے اور ماحول میں ایک طرح کی صفائی تھی۔

بیرسٹر صاحب اور منورما سوما کو اپنے ساتھ لاہور مہمان کے طور پر لائے تھے۔ وہ اُسے عزت کے ساتھ رکھتے تھے۔ سوما اپنی بدقسمتی، شرم، صاحب اور منو بی بی کے احسان سے دبی جا رہی تھی۔ صاحب اس کے آرام اور اس کی عزت کا خیال رکھتے تھے۔ سوما ان کے اور ان کے گھر والوں کے لیے اپنے فرض کا، سوما سرولا خاندان میں اپنی حیثیت کے مطابق نوکر کی طرح رہنا چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں اس کی جگہ وہی تھی۔ صاحب اور منورما اسے بانہہ سے کھینچ کر مہمان بنا کر گھر کے آدمی کی سطح پر لے آنا چاہتے تھے۔ اِس کھینچ تان میں سوما کو اپنے بھاری دکھ کا بوجھ ہلکا معلوم ہوتا تھا۔

کاتک کا مہینہ بیت رہا تھا۔ لاہور میں لوگ کہتے تھے موسم اچھا ہو گیا ہے۔ لیکن سوما کے لیے بہت گرمی تھی۔ وہ دن بھر پسینے پسینے رہتی اور آنچل سے چہرہ پونچھتی رہتی۔ ایک دن شام کے وقت صاحب اور منورما چائے کے لیے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ سوما چائے کی ٹرے لا کر پیالے میں چائے بنا رہی۔ منورما نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہہ دیا۔ "ہائے دیکھو تو اِس گرمی میں یہ کیسے نکھرتی جا رہی ہے؟"

"ہاں! جتنی بار آنچل سے منہ پونچھتی ہے رنگ کھلتا جاتا ہے۔" صاحب نے تائید کر دی۔

سوما کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اُس نے چائے دانی ٹرے میں رکھ دی۔ وہ چائے بنا نا چھوڑ کر سر جھکائے چلی گئی۔ لیکن شرم سے اُس کو غصہ اور توہین نہیں، دل کے اندر سنسنی اور گدگدی سی معلوم ہوئی اور چہرے پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ اسے بیرسٹر صاحب کے سامنے جانے میں جھجک ہونے لگی۔ بیرسٹر صاحب کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے تھے۔ منورما ان کی تائید میں مسکرا دیتی تھی۔ سوما بھی کیسے نہ مسکراتی۔ ان کی کسی بات کو نظر انداز کرنا کیسے ممکن تھا۔ کچھ ہی دن بعد پھر شام کے وقت بیرسٹر اور منورما سینما جانے کے لیے تیار ہو کر چائے پی رہے تھے۔ سوما چائے دے رہی تھی۔ منورما نے کہہ دیا۔ " یہ ڈھنگ سے کپڑے پہنے تو کتنی اچھی لگے۔"

" اسے بھی سینما لے چلو" صاحب نے انگریزی میں کہا۔ " دیکھنا کیسے چونکے گی۔ مزا آئے گا۔"
منورما کو دل میں آئی بات کو دبا دینے کی عادت نہ تھی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ " سوما! سوما بہن!" منورما سوما کو ہاتھ سے پکڑ کر رسوئی سے اپنے کمرے میں کھینچ کر لے آئی۔ سوما کچھ سمجھی نہیں تھی۔ لیکن جب منورما نے اپنی الماری کھول کر ایک ساڑی بلاؤز نکال کر کوچ پر پھینک دیے اور کہا " جلدی سے کپڑے بدلو۔" تو سوما گھبرا گئی۔

سوما نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ " ہائے نہیں بہن جی یہ مجھے نہیں آتا۔ آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔"

" وھاٹ نان سنس (کیا پاگل پن)" منورما نے پیار سے ڈانٹ دیا اور خود اس کے کپڑے بدلنے لگی۔ سوما سکڑ کر گھٹنوں میں سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ منورما اُٹھی اور غصے میں کمرے سے واپس جانے لگی تو سوما نے سہمی ہوئی آواز میں معافی مانگ لی۔

منورما لوٹ کر پیار سے بولی۔ " تم تو پاگل ہو۔ ساری دنیا کیا کپڑے نہیں پہنتی؟"

سوما نے عاجزی سے کہا۔ " میں شلوار پہن لوں گی۔ ساری اُس نے ایک ہی بار، دھرم شالہ میں پولس کے سامنے جاتے وقت آدھی بے ہوشی کی حالت میں پہن لی تھی۔ لیکن اس پوشاک میں اُس کے لیے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ دھرم شالہ میں پنجاب اور دیس کی عورتوں کو ساری پہنے دیکھ کر پہاڑی عورتیں تھوڑی پر انگلی رکھ کر ان پر تنقید کرتی تھیں۔ " ہائے یہ بھی کوئی پہناوا ہے۔ پیچھے سے بالکل کھلا۔ ہائے رے کیسی بے شرمی!" سوما اسے اپنے لیے ناممکن ہی سمجھتی تھی۔

سوما نے منورما کی بات مان لی۔ سوما نے کپڑے بدل لیے۔ لیکن نوسکھیا پن نہ چھپا۔ منورما نے ذرا پاؤڈر اور کاجل لگا لینے کا اشارہ کیا۔ سوما کے لیے اور مصیبت ہو گئی۔ وہ دھرم شالہ میں اپنی کوٹھری میں ان چیزوں کا تھوڑا بہت استعمال کرتی رہی تھی۔ دھن سنگھ کے لیے سنگار کر کے اُسے

خوشی ہوتی تھی۔ اب کس کے لیے کرتی! منورما نے اسے سر پر آنچل رکھے بغیر، سر اُٹھا کر بے دھڑک چلنے کے لیے کہا تو اور مصیبت ہو گئی۔ سوما رونی سی ہو رہی تھی۔ صاحب کے سامنے آ کر تو وہ جیسے بالکل زمین میں گڑ گئی۔

بیرسٹر نے ہنس کر کہا۔ "یہ کیا تماشا ہے؟"

منورما نے اپنی کوششوں میں ناکامی دیکھ کر کہا۔ "اچھا رہنے دے۔"

بھابی بھی برآمدے میں آ گئی تھیں۔ انھوں نے خوش ہو کر کہا۔ "ہائے اچھی تو لگتی ہے۔ اسے بھی لے جاؤ نا!"

منورما نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا اور بھائی کے ساتھ چلی گئی۔

منورما اور صاحب کے چلے جانے کے بعد سوما پھوٹ پھوٹ کر خوب روئی۔ اُس کے ساتھ کیا ظلم ہو رہا تھا۔ سوما احسان مندی میں ان لوگوں کے لیے جان دے دینا چاہتی تھی۔

کوٹھی کا کوئی نوکر میلے کپڑے پہنے نظر آتا تو صاحب کو اپنی بے عزتی معلوم ہوتی۔ بیرے اُدھم سنگھ کی نظر صاحب کے پرانے کپڑوں پر رہتی تھی۔ ڈرائیور برکت خود ہی چھیلا تھا۔ سوما یوں بھی کچھ میلی نہیں رہتی تھی، لیکن کبھی اُداسی یا کام کاج کی اُلجھن میں اُس کے کپڑے میلے یا مسلے ہوئے دکھائی دیتے تو صاحب مسز سرولا سے اُلجھ پڑتے۔ "اس کے لیے گھر میں دو کپڑے نہیں ہیں؟ اسے بچوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ وہ کیا سیکھیں گے۔؟"

مسز سرولا اپنے بھدے انداز سے جواب دیتیں۔ "بدل لے گی۔" لیکن سوما شرم سے گڑ جاتی کہ اُس کی وجہ سے بھابی کو بات سننی پڑی۔ مگر سوما دن بھر کام کاج میں کپڑوں کا کلف اور استری کیسے بنائے رکھتی! گھر کا سب کام تو وہی دیکھتی تھی۔ بھابی جی کی نظرت ایسی تھی کہ جتنا کام کوئی دوسرا کر دے اچھا۔ کچھ دن سے ان کی طبیعت یوں بھی خراب تھی۔ بھوپی اور دیپا کے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دوسرے ہی مہینے سے انھیں پانی بھی نہ پچتا تھا۔

ماں جی گھر پر نہیں تھیں۔ ساری ذمہ داری سوما پر ہی تھی۔ چابیوں کا گچھا سوما ہی کے پاس تھا۔ منورما کو اِن سب باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ پہلے اسے کالج سے وقت نہیں بچتا تھا۔ اب تھوڑی بہت "سوشیل لائف" اور 'پبلک ورک' تھا۔ نمک تیل کا حساب اور دھوبی کی دھلائی لکھنے کے لیے ہی اس نے ایم اے پاس نہیں کیا تھا۔

صاحب کا لگ بھگ سارا کام، بڈ ٹی سے لے کر رات سرہانے پانی کی بوتل رکھنے تک، ان کے

کپڑوں کو سنبھالنا اور کمرے کی صفائی سوما ہی پر آ پڑی تھی۔ اگر صاحب مہمانوں کے ساتھ دفتر میں چائے پیتے تھے تو اُدھم سنگھ کی ڈیوٹی رہتی تھی۔ گھر میں منورما کے ساتھ یا اکیلے پیتے تو سوما خود ٹرے لاتی تھی۔ ایسے وقت صاحب کہہ دیتے۔ "آؤ، تم بھی پی لو۔" اور اس کے لیے ایک کرسی لانے کا حکم دے دیتے۔ منورما ان کی تائید کر دیتی۔ لیکن سوما کے لیے صاحب اور منورما کے برابر کرسی پر بیٹھ جانا ممکن نہ تھا۔

بھابی جی کے لیے صاحب کے ساتھ چائے پر بیٹھنا نہ انھیں پسند تھا اور نہ آسان۔ انھیں چائے کا کسیلا مزہ پسند نہ تھا۔ وہ زکام ہونے پر دوا کے طور سے دودھ میں چائے ڈال کے پی لیتی تھیں۔ اپنے پھیلے ہوئے بیمار جسم کو خشکی اور کمزوری سے بچانے کے لیے دودھ اور لسّی زیادہ پسند کرتی تھیں۔ کرسی پر سمٹ کر اور ٹنگ کر بیٹھنے میں اُنھیں تکلیف بھی ہوتی تھی۔

بیرسٹر کبھی منورما کے نہ ہونے پر بھی سوما سے اپنے ساتھ چائے پینے کی فرمائش کر بیٹھتے اور کہہ دیتے۔ چائے اور شراب اکیلے پینے میں مزا نہیں دیتی، سوما شرم سے مر جاتی۔ اس کا رواں رواں سنسنا اُٹھتا۔ کوئی جواب دیے بغیر کھڑے ہی کھڑے صاحب کے لیے پیالی تیار کر دیتی۔ لیکن مسکرانا تو پڑتا ہی تھا۔ پیالی میں چائے ضرورت سے کم یا زیادہ ہو جاتی۔ دودھ کی ایک زیادہ بوند پیالی سے باہر گر جاتی اور چینی کے کچھ دانے بکھر جاتے۔

سوما جانتی تھی، صاحب کو بھوہڑپن بُرا لگتا تھا۔ لیکن اُس کے ہاتھ کپکپانے پر صاحب ہنس دیتے تھے۔ صاحب کا ایسا سلوک سوما کو بہت بوجھ معلوم ہوتا تھا۔ کبھی صاحب کے لہجے میں ایک گہرائی سی محسوس ہوتی۔ سوما کو پسینہ آ جاتا۔ ہاتھ پاؤں بے حس اور بے بس سے ہونے لگتے۔ چہرے پر گلابی پن آ جاتا۔ وہ کہیں چھپ جانا چاہتی اور کسی کام میں ہاتھ لگا دیتی۔ بھوپی یا دیپا کو پکڑ کر ان کے کپڑے بدلنے لگتی، لیکن دل نہ لگتا۔

سوما جانتی تھی، وہ خوب صورت تھی۔ صاحب کو اچھی لگتی تھی۔ منّو بی بی بڑے لوگ ہیں۔ کتنی پڑھی لکھی ہیں۔ رنگ گورا ہے۔ مگر خوب صورت تو نہیں ہیں۔ ہونٹ ذرا موٹے ہیں۔ آنکھیں ضرور اچھی ہیں۔ ماتھا کتنا اونچا ہے۔ بھابی کے چہرے پر بھولا پن ہے۔ اچھی لگتی ہیں، مگر کتنی پھیل گئی ہیں۔ کپڑوں سے باہر بکھری رہتی ہیں اور سدا ہی بیمار۔

...... اچھی لگنے میں کتنا ڈر تھا اور غرور بھی۔ دھرم شالہ میں اُس کی کوٹھری کے آس پاس سے آنے جانے والوں کو، رات میں اس کی کوٹھری کے دروازے پر آکر شرارت کرنے والوں کو بھی وہ کتنی اچھی لگتی ہوگی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ...... مجھیرا کے نمبردار کے چھوکرے کو بھی وہ اچھی لگتی تھی۔

اُس نے چھوکرے کو کیسے اُلٹے ہاتھ کا تھپّڑ مار دیا تھا۔ اب وہ کسی کو تھپّڑ نہیں مار سکتی تھی۔ بیچ ناتھ کے تھانے میں اُس کے چہرے کے پاس لالٹین اُٹھا کر دیکھا گیا تھا۔ وہ تھانے دار اور سپاہیوں کو اچھی لگی تھی۔ ایسے خیال سے خون جمنے لگتا تھا۔ صاحب کو اچھی لگنے کے خیال سے جو میٹھی بے چینی محسوس ہوتی وہ ڈر اور شک میں بدل جاتی تھی۔ پھر سوچتی۔ صاحب تو بھلے آدمی ہیں۔ بڑے آدمی ہیں اور کتنے دیالو (مہربان) ہیں۔

سوما کو دھن سنگھ کی یاد ستانے لگتی۔ وہ اُداس ہو جاتی۔ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ منورما اُسے اُداس دیکھ کر بھانپ جاتی۔ اُس کے ہاتھ کا کام چھڑا کر اپنے کمرے میں کھینچ کر لے آتی۔ تین چار بار وہ اُسے سینما بھی لے گئی تھی۔ پہلی بار منورما اور صاحب کے ساتھ باہر جانے کے لیے جو جھگڑا سا ہوا تھا وہ پھر نہیں ہوا۔ صاحب کے ساتھ نہ ہونے پر سوما کو جھجک بھی نہیں ہوتی تھی۔

منورما سوما کو اپنے کمرے میں لے جا کر، کوچ یا پلنگ پر اپنے ساتھ لٹا کر بات چیت کرنے لگتی۔ یقین دلاتی کہ دھن سنگھ دھرم شالے سے بھاگ گیا ہوگا۔ چھ مہینے بیت گئے ہیں۔ یہ جگہ وہ جانتا ہی ہے۔ کسی نہ کسی دن یہاں آ جائے گا۔

منورما گھر میں بات کرتی تو کس سے؟ بھابی اس کے مقابلے کی تھی لیکن فطری طور پر خاموش اور اپنے آپ میں مگن۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو بیاہی اور دو بچوں کی ماں سمجھتی تھی۔ اور منّو کو کنواری لڑکی۔ جب دل گھبراتا تو وہ سوما کو ساتھ لے بیٹھتی۔ منورما نے سوما سے اپناپن اور بھابی سے دوری محسوس کر کے کہہ دیا۔ بھائی تو ایک دوسری لڑکی کو چاہتے تھے۔ وہ انھیں چاہتی تھی۔ ماں جی نے یہ رشتہ ڈھونڈ نکالا۔ بھابی کے گھر کے لوگ پرانے خیال کے ہیں۔ بس ایک بار لڑکی دکھانے کو رضا مند ہوئے۔ بھائی اُس وقت چہرے پر ہی ریجھ گئے۔ جب آئی تھی دُبلی پتلی، دیکھنے میں بہت خوب صورت لگتی تھی مگر چہرہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ بھائی سے دو بات بھی تو نہیں کر سکتی۔ آٹھویں جماعت تک پڑھی ہے۔ گھر والوں نے کہا تھا گھر پر انگریزی پڑھ رہی ہیں۔ بدن تو دیکھو! بچے دو ضرور ہو گئے ہیں۔ لیکن کبھی ان دونوں کو آپس میں بات کرتے نہیں دیکھا۔

بیرسٹر صاحب کورٹ جاتے ضرور تھے لیکن ان کی پریکٹس زیادہ نہیں تھی۔ جو مقدمے مل جاتے انھیں اچھا نباہتے تھے۔ لیکن مؤکل بہت کم آتے تھے۔ مؤکلوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے طریقے انھیں توہین آمیز معلوم ہوتے تھے۔ ججوں کے سامنے جی حضوری انھیں پسند نہ تھی۔ اُن کی اکڑ نبھی جا رہی تھی کیوں کہ پریکٹس نہ چلنے پر بھی مالی کٹھنائی کی کوئی فکر نہ تھی۔

لالہ جی چاہتے تھے. جگدیش سہائے بھی دونوں بڑے بھائیوں کی طرح کاروبار کریں۔ جو برکت کاروبار میں ہے، بیرسٹری میں نہیں ہو سکتی۔ بڑے سے بڑے بیرسٹر کیا ہیں۔ کاروبار کرنے والوں کا ہی تو پیسہ کھاتے ہیں لیکن جگدیش سہائے کو کاروبار کے چکّر کچھ اچھے نہ لگتے تھے۔ وہ چاہتے تھے، عزّت سے رعب داب سے رہنا۔ لیکن جنگ کے دوران گھر کا کاروبار بہت بڑھ گیا تھا۔ پتاجی سدا دھرم شالہ میں رہتے تھے۔ بڑے بھائی کرشن سہائے کلکتے میں۔ منجھلے بھائی وشنو سہائے کراچی میں کام سنبھالتے تھے۔ اِس لیے لاہور میں کاروبار کی دیکھ بھال جگدیش کو کرنی پڑتی تھی۔ یوں تو لالہ جوالا سہائے کے پُرانے اور بھروسے کے مینجر پنڈت لچّا رام سب کام سنبھالتے تھے۔ بیرسٹر کا کام تھا نظر رکھنا۔ لیکن پچھلے تین مہینے سے انھوں نے خود بھی ایک ٹھیکہ لے رکھا تھا۔

کلب میں وِسکی پیتے ہوئے جگدیش کے دوست میجر باسو نے خفگی ظاہر کی۔ مسز باسو گھوڑ دوڑ میں چار ہزار ہار آئی تھی۔ میجر کی تنخواہ صرف دو ہزار تھی۔ ماہوار خرچ اِس سے کم نہیں تھا۔ میجر چاہتا تھا کہ بیرسٹر کچھ مہینوں کے لیے چار ہزار اُدھار دے دے۔ اُدھار لینے کی ضرورت کی ذمہ داری مسٹر باسو پر تھی۔ اِس لیے جگدیش بھلمنساہٹ دکھانے کے لیے بے چین تھا۔ وِسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ رقم کافی ہے ...... مسز باسو کی طرف نظر گئی تو مسکرا کر کہہ بیٹھا۔ "کچھ تو کرنا ہی ہوگا!"

مسز باسو اپنی غلطی پر پشیمان تھی۔ شرما کر انگریزی میں بولی "میں بہت شکر گزار ہوں۔"

میجر باسو نے یقین پا کر اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور دھیمی آواز میں بولا "تم اتنے بڑے کاروباری کے بیٹے ہو۔ تم خود کچھ کیوں نہیں کرتے؟ ایسی حالت ہمیشہ تو نہیں رہے گی۔"

میجر باسو لاہور چھاؤنی میں ڈاکٹری سامان کی خرید اور تقسیم کے افسر تھے۔ بیسیوں آدمی ان کے پیچھے پیچھے گھومتے رہتے تھے۔ لیکن جگدیش نے اتنی قربت کے باوجود ان سے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔

"مجھ سے کیا بن پڑے گا۔" جگدیش نے ایسے کہا، جیسے اُس کا دل نہ چاہ رہا ہو۔

میجر باسو جگدیش کی طرف جھک کر بولے "تم بلّی کی آنتیں سپلائی کرو...... ڈھائی لاکھ روپے کا آرڈر کل ہی دے سکتا ہوں۔"

"ڈھائی لاکھ روپے کی بلّی کی آنتیں؟" جگدیش ہنس پڑا "بلّیاں مارنا میرے بس کا نہیں۔

اتنی بلیاں شاید ملک بھر میں نہ ملیں گی۔ بلّی کی اتنی آنتوں کا کیا ہو گا؟"

میجر نے آہستہ آہستہ سمجھایا۔ "زخموں کو سینے کے لیے بلّی کی آنت کام میں آتی ہے۔ اس وقت ولایت سے نہیں آ رہی ہے، بلکہ برٹین ہم سے مانگ رہا ہے۔"

"لیکن اتنی آنتیں آئیں گی کہاں سے؟"

"اس کا وزن کم اور دام زیادہ ہے اور کچھ بھی ہو جو چیز آنت نظر آئے سپلائی کر دو۔"

"لیکن زخموں میں ایسی خطرناک چیز پہنچنے سے کتنے آدمی مریں گے!" جگدیش نے اعتراض کیا۔

"پاگل ہو تم! تم کیا سمجھتے ہو، مجھے پرمیشور کا ڈر نہیں ہے؟ ایسا پاپ میں کر سکتا ہوں؟ آنت گودام میں آ جائے گی۔ تمہارا بل پندرہ دن کے اندر ادا ہو جائے گا۔ وہ آنت گودام سے ہسپتال نہیں بھیجی جائے گی۔ نہیں سمجھے؟ گودام میں آنت کے بنڈل بے کار ہو جائیں گے۔ ان پر تیزاب گر سکتا ہے۔ میں اسے کنڈم کر کے اپنے سامنے جلوا دوں گا۔ تم چاہے سڑی ہوئی ستلی ہی سریس میں بھگو کر سپلائی کر دو۔ لیکن قاعدے سے۔ اس میں دس فی صد اسٹاف کا ہو گا۔ یہ تو روز کا کاروبار ہے۔"

جگدیش "سوچوں گا۔" کہہ کر کلب سے لوٹ آیا تھا۔ رات میں سوچا، زیادہ روپیہ نہ کما سکنے کی وجہ سے دونوں بھائیوں کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کا یہ آسان طریقہ ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ کامیاب آغاز ہوا تو کام چلتا رہتا ہے۔ جگدیش نے دوسرے دن میجر باسو کو منظوری دے دی۔ آنت اکٹھا کرنے کا کام پنڈت لچّا رام کے سپرد ہو گیا۔ بعد میں جگدیش نے کئی اور ٹھیکے پٹیاں اور دوسرا سامان سپلائی کرنے کے لیے۔ کام بہت آسان تھا۔ ضمانت جمع کر کے بڑے ٹھیکے اچھے بھاؤ پر لے لینا اور چھوٹے چھوٹے ٹھیکیداروں کو کم ریٹ پر بیچ دینا۔ پانچ لاکھ کے ٹھیکے میں پانچ فی صد بچ جانا تو کیا برا تھا۔ خود کو تو کچھ پریشانی تھی نہیں۔ قسمت نے ان کو بھی کاروباری بنا دیا تھا۔

بیرسٹر جگدیش کو ڈنر (رات کا کھانا) کے لیے کلب جانا تھا۔ سوما نے کالا سوٹ، سوٹ کے ساتھ کی کلف دار قمیص، موزے جوتے، سب ان کے کمرے میں پلنگ پر رکھ دئے تھے۔ جگدیش شام کی سیر سے لوٹا تو جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگا۔ قمیص بدل کر دیکھا۔ قمیص کے کف میں بٹن نہیں تھے۔ کلف لگے کفوں میں ایک ہاتھ سے بٹن لگانا سہل نہ تھا۔

جگدیش جھنجھلا اٹھا۔ "کپڑے کس نے رکھے ہیں؟ لنک نہیں لگائے؟" بظاہر یہ جھنجھلاہٹ بھابی یا اُدھم سنگھ پر تھی۔ لیکن کرتی تو سب کچھ سوما ہی تھی۔ سوما ساتھ کے کمرے میں ہی کچھ کر رہی تھی کہ صاحب کسی ضرورت سے پکاریں تو انھیں پریشانی نہ ہو۔

سوما نے صاحب کی جھنجھلاہٹ سنی تو شرم سے کٹ گئی۔ صاحب قمیض پہن چکے تھے اور ایک ہاتھ سے بٹن اٹکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ صاحب کی مدد کرنے کے لیے سوما نزدیک پڑا دوسرا بٹن اُٹھا کر اُن کی دوسری آستین کے کف میں لگانے لگی۔ صاحب کے سینے سے اتنی نزدیک کھڑی ہونے کے سبب سوما کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

جگدیش کی جھنجھلاہٹ کافور ہو گئی۔ اپنی جھنجھلاہٹ پر جھینپ محسوس ہوئی۔ سوما کو دلاسا دینے کے لیے وہ مسکرا دیا اور اپنی دوسری بانہہ اس کی کمر پر رکھ دی۔ سوما کے ہاتھ سے قمیض کا کف چھوٹ گیا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔ جگدیش نے اس کی بانہہ تھام لی اور کمر سے سنبھال لیا۔ سوما کا سر اس کے سینے سے ٹک گیا۔

جگدیش نے انگلی سے اُس کی ٹھوڑی اوپر اُٹھا کر پوچھا۔ "کیا ہو گیا ؟"

سوما کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھلک آئیں۔

"پاگل ہو۔ گھبرانے کی کیا بات ہے ؟" جگدیش نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

جگدیش کی سانس تیز اور آواز بھاری ہو گئی۔ سوما نے یہ محسوس کیا۔ اس کی تھرتھراہٹ رُک گئی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ صاحب اسے کچھ اور ہی دکھائی دیے۔ اُس نے اتنے نزدیک سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صاحب نے بے صبر ہو کر ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

سوما کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ اُس نے صاحب کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور سر صاحب کے سینے پر رکھ کر گہری سانس لی۔

اِس واقعہ کے بعد سوما نے دو دن اُداسی اور فکر میں گزارے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ پر لعنت بھیجتی رہی۔ یہ تو کیا کر بیٹھی ؟ اسے دھن سنگھ کی یاد آتی رہی۔ خاص کر اس اس بات کی کہ دھن سنگھ بیج ناتھ کے تھانے کی بات سُن کر داروغہ کو قتل کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ سوما اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی تھی۔ تب دھن سنگھ نے اپنا سر دیوار سے پھوڑ لیا تھا اور سوما کو بُری طرح پیٹ ڈالا تھا۔ دھن سنگھ کے ہاتھوں کی کھائی ہوئی اس مار پر اسے کتنا فخر تھا۔ اُس کی یاد کتنی میٹھی تھی۔ صاحب کا ایک بوسہ قبول کر کے اُس نے سب پر کالک پوت دی تھی۔ لیکن صاحب کو بھی کیسے ناراض کر دیتی ؟ صاحب نے اس کے لیے کیا نہیں کیا تھا ؟ اس کا بدلہ وہ کیسے دیتی ؟ وہ صاحب کے گھر کا کام کرتی تھی۔ مگر اتنا تو سارے نوکر کرتے ہیں۔ سوما نے اپنے دل کو سمجھایا۔ ان کی مہربانیوں کے بدلے میں اُس کے پاس سوائے انکار

نہ کر سکنے، انھیں ناراض نہ کرنے کے اور کچھ نہیں...... جو کھو گیا اسے کب تک روئے۔ روتے رہنے سے ہاتھ کیا لگے گا؟

پہاڑ جانے کی بات بار بار اُٹھتی تھی۔ لیکن بیرسٹر جگدیش سہائے کے لیے، کاروبار اور بہتے چلے آتے روپے کے جوش میں پہاڑ جانا ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ دھرم شالہ سے ماں جی بار بار لکھ رہی تھیں۔ بچوں کو ہی بھجوا دو۔ جگدیش نئے شروع کیے کاروبار کو کیسے چھوڑ دیتا۔ سوما کو ساتھ لے کر جاتا تو ماں جی اور لالہ جی کی نظروں سے ڈرتے ڈرتے جان مصیبت میں پڑ جاتی۔ منورما کو بھی اس سال پہاڑ جانے میں زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔

گرمی سے مسز سرولا کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر وہ اکیلی کیا کرتی؟ پانچواں مہینہ لگ رہا تھا۔ ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ بستر سے اُٹھنا بھی کٹھن تھا۔ پورا گھر سوما کے ہی سر تھا۔ گھر کو تو سوما بہت دنوں سے سنبھال رہی تھی لیکن اب اس کے طور طریقے سے نوکروں کا انداز مٹتا جا رہا تھا۔

سوما پہلے کام کرتی تھی۔ اب عام طور پر دوسروں سے کام لیتی تھی۔ دوسرے نوکروں سے کہنے کے بدلے حکم دینے لگی۔ وہ لوگ بھی جان گئے تھے۔ بی بی جی کی بات ایک بار ٹل بھی جائے مگر سوما بی بی کی کبھی نہیں ٹل سکتی۔

منورما نے دھرم شالہ میں سوما کو کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ لینے کے لیے شوق دلایا تھا۔ پاس بٹھا کر کچھ سکھایا بھی تھا۔ سوما کو اس میں بڑی شرم معلوم ہوتی تھی۔ اب سوما کو گھر کے انتظام میں اُدھم سنگھ یا ڈرائیور کو بلا کر دھوبی کے کپڑوں یا دوسرا حساب لکھانے میں توہین محسوس ہوتی تھی۔ اور صاحب اُسے جیسا دیکھنا چاہتے تھے ویسا بننے کے لیے بھی پڑھنا لکھنا سیکھنا ضروری تھا۔

سوما نے ذریعہ بھی نکال لیا تھا۔ دیپا اور بھوپی کانونٹ کے انگریزی اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ سوما نے بچوں کے لیے گھر پر بھی ایک ماسٹر رکھ لیا تھا۔ وہ نزدیک بیٹھ کر دیکھتی رہتی کہ ماسٹر ٹھیک سے پڑھاتا ہے کہ نہیں۔ ایک ہی مہینے بعد وہ جیسے تیسے دُھلائی کا اور دوسرا حساب خود لکھنے لگی۔

دن بیتتے گئے۔

جگدیش نے عادت کے مطابق مسز سنگھ کہہ کر سوما کو مخاطب کیا۔ سوما نے دیکھا۔ کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔

اُس نے مسکرا کر اپنے پتلے لال ہونٹوں کے آگے انگلی رکھ کر کہہ دیا۔ "نو ڈیر، سوما!"۔ وہ شرم اور ہنسی سے دُہری ہو گئی۔ سوما کی ایسی ہی باتوں سے جگدیش بالکل ہی لُٹ گیا تھا۔ مسز سرولا کی حالت ایسی ہی تھی کہ کوٹھی میں ہونا صرف پریشانی کی وجہ ہو سکتی تھی۔ سوما کو صاحب کی اس حالت پر رحم آتا تھا۔ یوں سوما کا اپنا کمرہ تھا لیکن صاحب اسے اپنے کمرے سے کافی رات بیتنے سے پہلے نہ جانے دیتے تھے۔

سوما صاحب کے منھ سے اپنی صورت اور سگھڑپن کی تعریف سنتی تو نشہ سا ہو جاتا۔ مالک کی زبان سے ایسی تعریف سننے سے بڑا سکھ اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہ نشہ شراب کے نشے کی طرح کچھ گھنٹے نہیں بلکہ آٹھوں پہر باقی رہتا تھا۔ سوما اب جیسے تیسے بدن ڈھانکنے کے لیے جلدی جلدی کپڑے لپیٹ نہ لیتی تھی۔ اب کپڑوں سے اپنی حیثیت بنانے اور بدن کے سنوارنے کی فکر زیادہ رہتی تھی۔ ساڑی کے کنارے یا دوپٹے کو بدن کے دباؤ اور اُبھار کے خیال سے نبھاتی تھی۔ اپنے سگھڑپن کا غرور بڑھ گیا۔ وہ امیر گھروں کی موٹروں میں گھومنے والی عورتوں کے قیمتی کپڑوں سے ڈھنکے جسموں سے اپنے بدن کا مقابلہ کرتی اور صاحب کی بات یاد آ جاتی۔ "خوشبودار زرق برق کپڑوں میں لپٹی کوڑے کی گٹھریاں ہیں۔ قسمت کی بھول سے امیروں کے گھر پیدا ہو گئیں۔ دوسرے امیروں کے یہاں انھیں سسرال مل گئی۔" اس نشے سے سوما کے لہجے اور طور طریقے میں اختیار کا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ منورما کے ساتھ سینما یا بازار جاتی تو اس کی نوکر نہیں بہن یا بھابی کی حیثیت سے برتاؤ کرتی تھی۔

سوما کو صرف بھابی جی ہی نام سے پکارتی تھیں۔ صاحب اسے پکارتے ہی نہیں۔ نوکر اس کا ذکر سوما بی بی کہہ کر کرتے تھے۔ منورما سوما کو بہن کہتی تھی۔ بچے ماسی پکارتے تھے۔ نوکر بھی سوما بی بی یا ماسی جی کہنے لگے تھے۔

سوما گھر کا کام ڈر یا فکر سے نہیں، شوق اور اختیار کے ساتھ کرتی تھی۔ اب نوکروں کو ڈانٹ بھی دیتی تھی۔ گھر کے نوکر زیادہ تر پُرانے تھے۔ ماں جی کے رکھے ہوئے۔ وہ سوما کو بھی نوکر ہی سمجھتے تھے۔ وہ تنخواہ نہیں لیتی تھی تو کیا! نوکر اسے صاحب کی رکھیل سمجھتے تھے۔ مالک کی خیر خواہی سوما کی ڈانٹ پھٹکار انھیں ناقابل برداشت تھی۔ مگر بے بس تھے۔ بھابی جی سے شکایت کرتے تو وہ نوکروں ہی کو حرام خور سمجھتیں۔ گھر کی حالت ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

گھر کا سودا نوکر لاتے تھے۔ اس میں سوما کو سو نقص دکھائی دیتے تھے۔ اور بے ایمانی کا بھی شک ہوتا تھا۔ سوما پہلے دو بار منورما کو کار میں ساتھ لے کر گھر کا سودا لینے بازار گئی۔ منورما کو وہ

جھنجھٹ پسند نہ تھا۔ سوما اکیلے ہی بٹوا لے کر کار میں بازار جانے لگی۔ اس کا بٹوا گھر کا بٹوا تھا۔ کافی بھاری رہتا تھا۔ شروع میں بھابی جی اور سب چابیاں سوما کو سونپ کر روپے پیسے کی چابی اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔ لیکن یہ جھنجھٹ بھی اب انھیں غیر ضروری معلوم ہوا۔ گھر کا روپیہ بھی سوما کے پاس رہنے لگا۔

سوما ڈرائیور برکت کے سامنے ہی آئی تھی۔ برکت چست، سڈول اور اُمنگ بھرا نوجوان تھا۔ سینما اور غزلوں کا شوقین تھا۔ یہاں تک کہ کبھی صاحب یا گھر کی عورتوں کو گاڑی میں سینما لے جاتا تو ان کے سینما گھر میں چلے جانے کے بعد گاڑی کو پارک کر کے خود بھی آٹھ آنے کا ٹکٹ لے کر اندر جا بیٹھتا۔ لیکن ختم ہوتے ہی اُن سے پہلے گاڑی کے پاس آ کھڑا ہوتا۔ تتلی جیسی مونچھیں۔ فلم ایکٹروں جیسی لمبی قلمیں۔ کن پٹیوں تک بھرے بھرے بال۔ وردی پہننا اُسے اچھا نہ لگتا تھا۔ کار بھی اس ادا سے چلاتا تھا۔ جیسے خود ہی مالک ہو۔ اس کے سگریٹ پینے میں، چلنے پھرنے میں، ہر حرکت میں ایک ادا تھی۔

برکت نے سوما کے روپ رنگ، طور طریقے اور حیثیت میں تبدیلی آتے دیکھی تھی۔ اس وجہ سے بازار سے سودا لانے کا فائدے کا کام برکت کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ دل میں سوچتا، صاحب کی رکھیل بن گئی ہے تو کیا، ہے تو نوکرانی ہی۔ وہ اس سے مسکرا کر بات کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے کار میں لے جاتا تو بے پروائی دکھانے کے لیے کوئی غزل گنگناتا رہتا۔ سوما کو یہ اچھا نہ لگتا تھا۔ لیکن نظر انداز کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ توہین کو سمجھنا توہین کو قبول کرنا تھا۔

برکت جانتا تھا۔ گھر میں سوما کی چلتی تھی۔ اُسے دل پھینک عورت سمجھتا تھا۔ اگر وہ اس کی طرف جھک جاتی! ...... دنیا (سینما) میں کیا ایسا نہیں ہوتا؟ آخر تھی تو اُسی کی حیثیت کی۔ صاحب کی رکھیل بن گئی تھی تو کیا! ...... ایک بار اُسے مسکرا کر دیکھ لے۔ پھر راہ نکل آئے گی۔

ایک دن بازار میں سوما ایک دوکان پر کام ختم کر کے گاڑی کی طرف واپس آئی تو برکت نے گاڑی کا دروازہ کھول کر ادا سے سلام کر کے مسکرا دیا۔ اور کہہ دیا۔ "سرکار ذرا غریبوں کا بھی خیال رہے۔"

برکت عاجزی سے دو چار روپے بخشش مانگ لیتا تو سوما دے دیتی۔ جان گئی تھی کہ انعام و اکرام دیتے رہنے سے ہی نوکروں سے عزت ملتی ہے۔ سوما احترام کا مزا پا چکی تھی۔ لیکن برکت کی حرکت میں احترام نہیں شرارت تھی۔ سوما کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ تیوریاں چڑھ گئیں۔ "کیا بکتا ہے!" اُس نے ڈانٹ دیا۔ "جو کہنا ہے صاحب سے بولو۔"

برکت سہم گیا۔ دانت پیس کر سوچا۔ دیکھا جائے گا۔

پچھلے سال جاڑے کے شروع میں منورما گھر والوں کے ساتھ دھرم شالہ سے لاہور آئی تھی تو کچھ ہی دن بعد بھوشن اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیل سے چھوٹا تھا۔ ڈھائی برس پہلے کمیونسٹ جنگ میں ساتھ دینے کی مخالفت کرنے کی وجہ سے انگریز سرکار کے غصے کا شکار تھے۔ جون ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا تھا اور جاپان بھارت کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ کمیونسٹ انگریزی سامراج کے خلاف تھے، لیکن جرمنی اور جاپان کے فاشزم کو اس سے بھی بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ جرمنی کی شکست اور روس کی فتح سے انھیں بین الاقوامی سطح پر سوشلسٹ جمہوری طاقتوں کے مضبوط ہونے کی امید تھی۔

کمیونسٹ سست ہوتے ہوئے بھی انگریزی سامراج کی جگہ پر جاپان کے بڑھتے ہوئے سامراج کے آجانے کو زیادہ مہلک سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستان کی جنتا کو جاپانی بموں کا شکار نہیں بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بین الاقوامی حالات کے بدل جانے کی وجہ سے اپنے اصول میں تبدیلی کر لی تھی۔ وہ اپنے دیش اور سوشلزم کی حفاظت کے لیے جنگ میں مدد دینے کی صلاح دینے لگے تھے۔ حکومت نے زیادہ تر کمیونسٹوں کو جیل سے رہا کر دیا تھا۔ اس وجہ سے انگریزوں سے نفرت کرنے والے، انگریزوں پر مصیبت سے خوش ہونے والے عوام کمیونسٹوں سے نفرت کرنے لگے۔

بھوشن منورما کی کوٹھی پر نہ آیا تھا۔ منورما نے دل میں سوچا۔ جیل سے رہا ہونے والے شخص سے خلوص اور ہمدردی کے اظہار کے لیے بھوشن سے اس کا ملنے کے لیے جانا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس بات پر بھوشن یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ اُس کے پیچھے پڑی ہے۔ وہ جس وقت پارٹی کے آفس میں پہنچی، بھوشن اپنے ساتھیوں کے سامنے پارٹی کے نئے رویّے کی صفائی دے رہا تھا۔ اُسے منورما سے بات کرنے کی فرصت نہ تھی۔ مسکرا کر پوچھ لیا۔ "آپ کیسی ہیں؟ جگدیش بھائی کا کیا حال ہے؟ سوما کا کیا حال ہے؟ آج میں بمبئی جا رہا ہوں۔ واپس آکر کوٹھی پر آؤں گا۔"

بھوشن نے اپنا وعدہ چودہ مہینے بعد پورا کیا۔ آتے ہی اُس نے مبارک باد دی۔ "میں نے اخبار میں تمہارے دو تین مضمون دیکھے ہیں۔ تمہارے قلم میں زور ہے۔ لیکن تمہارے خیالات الجھے ہوئے ہیں۔ تم پارٹی پیپر باقاعدہ نہیں پڑھتی ہو نا! رائے کی ڈیموکریٹک پارٹی کی لائن اور ہماری لائن میں جو فرق ہے، وہ تمہارے مضمون میں واضح نہیں ہوتا۔ ہم چرچل ٹولی کے سوشلسٹ بن جانے کا یقین نہیں کرتے۔ کمیونسٹ یہ یقین نہیں رکھتا کہ حالات خود انقلاب پیدا کر دیں گے۔ کبھی نہیں۔ عوام کی تنظیم اور

جدوجہد لازمی چیزیں ہیں۔ فاشزم کا سامنا کرنا ہے اور اپنے لیے قومی خود اختیاری کے حقوق بھی حاصل کرنے ہیں۔ ہمارا کام دوہرا ہے۔"

منورما بھوشن سے ڈھائی سال بعد ملنے کے وقت پارٹی کا وعظ سننے کی اُمید نہ رکھتی تھی۔ اور بھوشن نے اس کے مضمون کی اہمیت پر بھی چوٹ کر دی تھی، جو ایک طرح سے ناشکری بھی تھی۔ جب وہ پارٹی آفس میں بھوشن سے ملنے گئی تھی تو بھوشن ساتھیوں کو نیا فلسفہ سمجھا رہا تھا۔ منورما تھوڑا بہت جو سن سکی اسی کی بنیاد پر کمیونسٹوں کو گالیوں سے بچانے کے لیے اُس نے یہ مضامین لکھے تھے اور اب بھوشن ہی کہہ رہا تھا کہ یہ مضمون غلط تھا۔

منورما نے اپنا رومال انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے ہونٹ دبا کر کہا۔ "میں نے تمہاری پارٹی کے حکم سے نہیں لکھا۔ مجھے جو ٹھیک معلوم ہوا لکھا ہے۔ اس سے بہت سے کانگریسی بھی ناخوش ہیں۔ تمہاری پارٹی بھی ناخوش ہو سکتی ہے۔ میں چائے منگاتی ہوں۔"

بھوشن نے منورما کا جواب ان سنا کر کے پوچھ لیا۔ "ہاں اس کا، سوما کا کیا حال ہے۔ اور دھن سنگھ کی کچھ خبر ملی ؟"

منورما نے سوچ کر جواب دیا۔ "ٹھہرو بلاتی ہوں۔" وہ پل بھر کے لیے اندر جا کر لوٹ آئی۔ بھوشن بات کرنے لگا۔ "اس سال تم لوگ پہاڑ نہیں گئے ؟ بمبئی میں یہ مہینے بہت خراب ہوتے ہیں۔ دھرم شالہ کی بہت یاد آتی تھی۔"

دو تین منٹ بعد ایک خوب صورت شریف عورت سلائیوں پر کچھ بُنتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ نوجوان عورت کلف لگی سفید ساڑھی پہنے تھی۔ عورت کا انداز ایسا تھا کہ جیسے با اختیار ہو، کوئی جھجک بھی نہیں تھی۔ عورت کو نمسکار کر کے بھوشن اپنے ہاتھ کے اخبار کو دیکھنے لگا۔

"سنو،" منورما نے کہا۔ "پہچانا نہیں، کامریڈ بھوشن ہیں۔"

بھوشن نے اُس کی طرف نظر اُٹھائی۔ عورت بہت زیادہ حیرت زدہ اور پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے بھوشن کو نمستے کر دی۔

نمستے کا جواب دے کر بھوشن نے منورما کی طرف دیکھا۔ منورما مسکرا دی۔ "آپ نے بھی نہیں پہچانا ؟"

"سوما ؟" بھوشن نے حیرت سے پوچھا۔

سوما کا چہرہ جھک گیا۔ وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ پھر بھوشن کچھ لمحوں کے لیے حیرت میں چُپ رہ گیا۔ پھر

اُس نے پوچھا "دھن سنگھ کہاں ہے ؟"

منورما نے مختصر طور پر دھن سنگھ کے فرار ہونے کی کہانی سنا دی۔

بھوشن کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ "یاد ہے ایک دن اس عورت کی زندگی اُس آدمی کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اب یہ دوسری دنیا میں ہے۔ شاید تمہیں یاد ہوگا۔ میں نے کہا تھا۔ صرف محبت زندگی کو مکمل نہیں بناتی۔"

منورما کو یاد تھا۔ آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ تیز ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے کپڑے اُڑ رہے تھے۔ درختوں کے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ کی وجہ سے کچھ سُن پانا مشکل تھا۔ پھر بھی دل چھد گیا تھا۔ سُن کر وہ تھکاوٹ اور بے بسی سے چٹان پر بیٹھ گئی تھی۔ منورما کو یاد آگیا۔ اپنی وہ بے بسی اور بھوشن کا اپنے کام کی اہمیت کا غرور۔ منورما چپ رہ گئی۔

بھوشن نے خیال ظاہر کیا۔ "ہوسکتا ہے دھن سنگھ کبھی واپس نہ آئے۔ جان کا ڈر بُری چیز ہوتی ہے۔ یا اُسے کوئی دوسری عورت مل گئی ہو جو اُس کی زندگی میں زیادہ مددگار ہو۔"

منورما نے ایک تیکھی چوٹ محسوس کرکے ہونٹ دبا لیے۔

بھوشن کہتا گیا۔ "اگر دھن سنگھ آج لوٹ آئے تو شاید یہ اُسے برداشت بھی نہ کرسکے۔ اُس سے اسے غصہ آنے لگے۔ یہ کرتی کیا ہے ؟" بھوشن جس نتیجے پر پہنچنے کے لیے یہ بحث کر رہا تھا، وہ منورما کو اچھا نہ لگا۔

"ٹھیک ہے۔ اپنا نباہ کر رہی ہے۔" منورما نے ٹال دیا۔

بھوشن اس کی ناپسندیدگی کو نہ سمجھ سکا اور بولا۔ "ایک عمر میں آکر عورت کو کسی سے بیاہ کرکے نباہ کرلینا ممکن نہیں رہتا۔ شادی نہ کرنی ہو تو اپنی زندگی گزارنے کے لیے عورت کو بھی کچھ کام کرنا ہی پڑے گا۔ فی الحال دو ہی کام ہیں عورتوں کے لیے ہمارے سماج میں، استانی بن جائے یا ڈاکٹر یا پھر اُسے نرسنگ کی ٹریننگ دلوا دو تاکہ اپنے پاؤں کھڑی ہو جائے پھر چاہے گی تو بیاہ بھی کرلے گی۔"

دھرم شالہ میں بھوشن نے عام محبت کا جو اُپدیش دیا تھا، اُس کی بات شروع ہو جانے پر منورما نے سمجھا کہ سوما کا نام لے کر یہ سب اُپدیش اُسے دیا جا رہا تھا۔ اُس نے بھوشن کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "کیوں فکر کرتے ہو، تجربہ خود راہ دکھا دیتا ہے۔"

بھوشن نے سگریٹ سُلگا لیا۔ "میں تو عام بات کر رہا ہوں۔"

منورما کو اور بھی کھل گیا۔ "تو تمہارے گلے تو کوئی پڑ نہیں رہا ہے۔" اُس کے منھ سے نکل گیا۔

بھوشن چپ رہ گیا۔ جھینپ مٹانے کے لیے مسکرانے کی کوشش میں سگریٹ کے دو کش لگا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی تین ہفتے یہاں ہوں۔ پھر ملوں گا۔" بھوشن کے جاتے وقت نمستے کے جواب میں منورما مسکرا دینے کا اخلاق بھی نہ نباہ سکی۔ اُس نے صرف ہاتھ جوڑ دیے۔

منورما کا دل بہت اُداس ہو گیا تھا۔ وہ نہ کوئی کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ سکی اور نہ اُس نے بات چیت کرنے کے لیے سوما کو ہی پکار لیا۔ سوما سے کیا بات کرتی؟ وہ سوما کو لے کر ہی کہی گئی بات پر سوچ رہی تھی۔ کیا یہ واقعی بھیّا سے محبت کرتی ہے؟ پہلے منورما نے سوچا تھا۔ بھیّا سوما سے پریم کرتے ہیں۔ بھابی سے بھیّا کی شادی اسے سماجی ظلم ہی معلوم ہوئی تھی۔ لیکن ادھر چار مہینے سے بھیّا کی مسز باسو سے دل چسپی دیکھ کر منورما کا دل غمگین ہو گیا تھا۔ وہ اِس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ بھیّا محبت کو کھیل سمجھتے ہیں۔ منورما نے بھائی کی اِس کمزوری کی ذمّہ داری بھائی کی جانب داری کی وجہ سے ماں باپ پر ڈال دی تھی۔ اُن لوگوں نے جگدیش کا بیاہ مائتری سے نہ ہونے دے کر اِس معاملے میں اُسے بے حس بنا دیا تھا۔

لیکن سوما؟ —— سوما دھن سنگھ سے تو پریم کرتی ہی تھی۔ اب کیا بھیّا سے بھی سچ مچ اُسی طرح پریم کرنے لگی؟ ...... کیا یہ ممکن ہے؟ کیا دل اِس طرح بدل سکتا ہے؟ یا سوما کو پناہ اور مہربانیوں کی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے؟ سوما اپنے آپ کو حوالہ کر کے پناہ کی قیمت چکا رہی ہے۔ یا محبت کی قیمت میں وہ اپنے آپ کو دے رہی ہے؟"

منورما کے خیال میں یکایک بات آئی۔ ساری عورتیں پناہ کی قیمت، محبت کی قیمت اپنے بدن سے چکاتی ہیں۔ بے غرض محبت تو وہی ہے جو قیمت میں پناہ نہ مانگے۔ محبت کی قیمت میں زندگی بھر کی پناہ مل گئی یا کچھ روپے! محبت کرنے کا حق وہی ہے جو پناہ اور سہارا نہ مانگے۔ جو اپنے پاؤں پر کھڑا رہے۔ بھوشن اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی بات ٹھیک ہی کہتے تھے۔ منورما اپنے بارے میں سوچنے لگی۔ بائیس سال کی عمر میں ایم اے پاس کر کے بھی وہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکی ہے۔ اصولی طور پر جو بات سوما کے لیے ٹھیک تھی وہی بات اس کے لیے بھی تھی۔

منورما نے طے کر لیا تھا، صرف پناہ کے لیے بیاہ نہیں کرے گی۔ سوما اُس کے سامنے تھی۔ جانے یا انجانے میں سوما اور کیا کر رہی تھی۔ لیکن سوما اسے ظلم کی شکل میں تو برداشت نہیں

گر رہی تھی۔ قانونی اور سماجی حق چاہے اسے نہ تھا، لیکن بھابی کے مقابلے میں بھیا کے لیے سوما کہیں زیادہ تسلّی کا سبب تھی۔ منورما کے دل میں سوما کے لیے عزّت ختم ہو چکی تھی۔ صرف ڈر رہ گیا تھا۔ وہ خود ہی سوچنے لگی۔ سماج چاہے جو کہے لیکن سماج کے پاس سوما کی حالت کا علاج کیا ہے؟ کیا کوئی سوما کا دوست بھی نہیں ہو سکتا؟ بھیا کا اور اُس کا تعلق کیا تھا۔ لیکن سوما بھیا کے ٹکڑوں پر تھی۔ اگر اتنی بات نہ ہوتی تو سوما سماج کو منھ توڑ جواب دے سکتی تھی۔

شام کے وقت منورما نے سوما کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ بھوشن سے اچانک ملنے پر سوما کو اپنی پچھلی زندگی کی یاد سے گہری جذباتی ٹھیس لگی تھی۔ دونوں ہی اُداس تھیں۔ سوما اب جھجک کر ذرا پیچھے نہیں بیٹھتی تھی اور نہ چپ رہ کر باتیں سنتی رہتی تھی۔ اپنی سمجھ کے مطابق باتوں کا جواب دیتی تھی۔

منورما نے کہا — ”دھن سنگھ کا کیا پتہ ہے، اب آئے نہ آئے۔ کون جانتا ہے زندگی اسے کہاں لے جائے۔“

سوما نے گہری سانس لی۔ منورما بولتی گئی — ”لیکن لمبی عمر کاٹنے کے لیے کچھ سامان تو آدمی کے پاس ہونا ہی چاہیے۔“

منورما نے بتایا کہ وہ خود اپنی زندگی میں خود کفیل ہونا چاہتی ہے۔ پتا جی اس میں رکاوٹ ڈالنے جا رہے تھے لیکن وہ طے کر چکی ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گی۔ اُس نے سوما کو صلاح دی۔ ”تم نرس کا کام کیوں نہ سیکھ لو؟“ جانتی ہو ایک لڑکی ودیا کول نرس کا کام کر رہی ہے۔ مہینے میں ڈھائی تین سو کما لیتی ہے۔“

سوما نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے بہن جی۔ لیکن عورت مزدوری کر کے پیٹ بھرے تو اس کی کیا زندگی ہے۔ عورت تو گھر سنبھالتی ہی بھلی لگتی ہے۔“

منورما چپ رہ گئی۔ وہ کیسے کہہ دیتی کہ اس گھر کو سنبھالنے کا حق تم کو نہیں ہے۔ یہی بات سوما نے منورما کے نوکری کرنے کی مخالفت میں کہی تھی۔ اب سوما اس کے لیے اور اپنے لیے ایک ہی اصول اور بات سمجھنے لگی تھی۔ اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی بات سوما کے دل سے دور ہو گئی تھی۔ منورما کیا کہتی؟

منورما کا جھکاؤ لکھنے کی طرف تھا۔ اُس نے کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں اور مضامین بھی۔ قلم کار بننا اس کا آدرش تھا۔ جس سے تخلیق، معاش اور سکون کی ساری امیدیں وابستہ ہو سکتی تھیں

بیرسٹر جگدیش نے منورما کی مصنف بن کر زندگی گزارنے کی بات سنی تو ہنس کر کہہ دیا تھا" اگر تم اِس ملک میں لکھ کر روٹی کما سکو گی تو روی ٹھاکر بن جاؤ گی ۔" منورما کا اِس طرح سے مذاق اُڑانے سے جوش ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

بھوشن کی بات نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ کیا وہ اتنی ناسمجھ تھی کہ عوام کی مخالفت کی پروا نہ کر کے جس کی بات کی حمایت کے لیے لکھے وہی اس کو دھکا پہنچائے۔! اس سے اچھا تھا نہ لکھنا۔ اور وہ اِن لوگوں کی طرف سے کیوں لکھے؟ ایسی ناانصافی کے احساس سے منورما کے دل نے ہتھیار ڈال دیے۔ سوچا مصنف بننے کا خیال چھوڑ کر اپنی زندگی گزارنے کے لیے پڑھائی کا کام کر لے۔ اس نے کسی سے رائے لیے بغیر ہی دو مقامی مہیلا کالجوں میں نوکری کے لیے درخواست بھیج دی تھی۔

چندے سے چلنے والے کسی کالج کے لیے بھی لالہ جوالا سہائے کی لڑکی کا اُس سے تعلق ہو سکنا اُس ادارے کے لیے مبارک تھا۔ منورما کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر پڑھانے کی نوکری مل گئی۔

جگدیش نے مخالفت کی۔" تمھیں پڑھانے کا شوق ہے یا وقت نہیں کٹتا تو بغیر تنخواہ کے کام کر لو۔ تمھارا نوکری کرنا کبھی لالہ جی کو برداشت نہ ہوگا۔"

منورما نے جواب دیا" یہ آپ کا طبقاتی پندار ہے۔ پڑھا کر روٹی کمانا تو شرم کا کام نہیں ہے۔"

بیرسٹر نے اقرار کے انداز میں کہا۔" طبقہ ہے تو اس کا اثر بھی ہے۔ اِس مہیلا کالج میں تم سال میں اٹھارہ سو روپے تنخواہ پاؤ گی۔ لالہ جی اُسے پانچ ہزار روپے سالانہ امداد دیتے ہیں۔ یہ مذاق نہیں تو کیا ہے؟ تم اپنے پتا کی خودداری پر حملہ کر کے اپنی خودداری قائم کرنا چاہتی ہو۔"

جگدیش نے منورما کے نوکری کر لینے کی خبر لالہ جی کو دے دی تھی۔ لالہ جی اور ماں جی کا بھی مخالفت کا خط آ گیا۔ منورما نے دانت پیس لیے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن اُس نے آنسوؤں کو گرنے نہ دیا۔

میجر باسو اور مسز باسو مسوری گئے ہوئے تھے۔ ملٹری کے ایک ٹھیکے کے سلسلے میں جگدیش کو میجر باسو سے ملنا ضروری تھا۔ جگدیش نے منورما سے کہا۔" دسہرے کی چھٹیاں ہیں۔ اس سال ہم لوگ پہاڑ نہیں گئے۔ ایک ہفتے کے لیے مسوری چلی چلو۔"

منورما کے لیے لاہور میں چپ بیٹھے رہنے کے علاوہ مشغولیت کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سوما

سے ویسے بھی وہ کیا بات کرتی۔ اور اب سوما گھر بھر کو سنبھالنے کی ذمہ داری لے کر اُلجھی رہتی تھی۔ بات کرنے کا موقع اسے کم تھا۔ اور عادت بھی نہیں تھی۔ بھابی کے چاروں طرف نرسوں اور لیڈی ڈاکٹروں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ ایک نئے آدمی کے آنے کی تیاری کی خوشی کے مقابلے میں تکلیف اور فکر زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔

منورما کو سہیلیوں سے کوئی زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ اب اُس کو اُن سے ملنے میں جھجک معلوم ہونے لگی تھی۔ اُس کی ساری ہم جولیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اب منورما سے کچھ بزرگی کے انداز میں بات کرتی تھیں، اور منورما کا اب تک بیاہ نہ ہونے پر دُکھ کا اظہار کرتی تھیں۔ جیسے منورما کسی امتحان میں کامیاب نہ ہو سکی ہو۔ لاہور سے کچھ دنوں کے لیے باہر جانے کی تجویز اُسے بہت اچھی لگی۔

حیدرجی ستلی والا سے بیرسٹر جگدیش کا تعارف ولایت سے لوٹتے وقت بمبئی میں ہوا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد ستلی والا شیئر (SHARES) کے کاروبار کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے لاہور آیا تھا اور بیرسٹر کا مہمان رہا تھا۔ بمبئی واپس جا کر اُس نے بیرسٹر اور منورما کو شکریے کا خط لکھا تھا۔ جگدیش کی ستلی والا سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔ منورما بھی ستلی والا کو بہت شریف اور بھلا آدمی سمجھتی تھی۔ درمیان میں کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مسوری میں یکایک ایک دوسرے کو ایک ہی ہوٹل میں پا کر تینوں خوش ہو گئے تھے۔

میجر اور مسز باسو سوائے ہوٹل میں تھے۔ جگدیش اور منورما بھی وہیں ٹھہر گئے تھے۔ اسی ہوٹل میں حیدرجی ستلی والا بھی ٹھہرا تھا۔ میجر باسو کا وقت عام طور پر انگریز افسروں کے ساتھ کٹتا تھا۔ جگدیش کا وقت مسز باسو کے ساتھ۔ منورما کو ستلی والا کا ساتھ ملتا تھا۔ صرف تفریح اور آرام کے لیے آنے والوں کی طرح ستلی والا کے لیے ہر وقت تفریح کا نہ تھا۔ وہ مسوری آنے والے امیر لوگوں میں شیئر کی دلالی کا کاروبار کرنے آیا تھا۔ شیئر خرید سکنے والے امیر آدمیوں کو کھانے کی دعوت دینا اور ان کی دعوت قبول کرنا ستلی والا کے کاروبار کا ایک حصّہ تھا۔ منورما ستلی والا کی مصروفیت اور محنت کے لیے اپنے دل میں قدر محسوس کرتی تھی۔ ستلی والا منورما کے ساتھ گھومنے اور کھانے کے وقت ساتھ دینے کا موقع نکال لیا کرتا تھا۔

جگدیش ستلی والا سے محبت سے باتیں کرتا تھا۔ اور اس کے سامنے ہی منورما سے اُبھرتی ہوئی سوشلزم اور کمیونزم کا مذاق اُڑانے میں بھی نہ چوکتا تھا۔ ستلی والا کمیونزم اور سوشلزم کی پیچیدہ زبان کو نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ سوشلزم کے رجحان سے ہمدردی ظاہر کرتا تھا۔ وہ اپنی ہی مثال دے کر کہتا۔ "میں سرمایہ کے استحصال اور ظلم سے کیسے انکار کر سکتا ہوں؟ میں خود ہی سرمایہ اکٹھا کر کے سرمایہ داروں کو دے رہا ہوں۔ سرمایہ داروں کے اس منافع میں میرا حصّہ یا محنتانہ کتنا ہے! سرمایہ کی سب سے بڑی دشمن خود سرمایہ داری ہے۔ دولت بٹورنے اور اختیار بڑھانے کی نیّت ہی سرمایہ داروں کی تعداد کو کم کرتی جا رہی ہے۔ بڑے سرمایہ داروں کے مقابلے میں چھوٹا سرمایہ دار لٹتا جا رہا ہے۔ سرمایہ داری کے مخالفوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔"

ستلی والا منورما کی آسانی اور پسند کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کی موجودگی میں عادت کے مطابق اگر سگریٹ منھ میں لگا لیتا تو اُسے سلگائے بغیر رکھ لیتا۔ منورما نے کئی بار کہا۔ "تمباکو کا دھواں سونگھنے کی مجھے کافی عادت ہے۔ اس سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آپ پیجیے۔"

ستلی والا کہہ دیتا۔ "زیادہ نہیں تو آپ کے لیے مجھے اتنا تو کرنا چاہیے کہ جو چیز ضروری نہیں ہے اُسے آپ کے خیال سے رہنے دوں۔"

ایک بار ستلی والا سگریٹ ہونٹوں سے لگانے کے بعد اسے کیس میں رکھ رہا تھا کہ منورما نے خود دیا سلائی جلا دی۔ "اچھا میں کہتی ہوں۔ آپ پیجیے۔ میرے کہنے سے ہی سہی۔"

جگدیش ستلی والا کی شرافت، نیکی، طور طریقے اور اُس کی سبھی باتوں کی تعریف کرتا تھا۔ منورما دل کے اندر جگدیش کی رائے کے بارے میں شک کر رہی تھی۔ مسوری سے چلنے کے ایک دن پہلے جگدیش نے اُس سے صاف صاف پوچھا۔ "ستلی والا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے مجھ سے صاف تو نہیں کہا لیکن کچھ اشارہ ضرور کیا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بات بہت مناسب ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ پتاجی اور ماں جی ذات پات اور دھرم سنسکار کی مخالفت ضرور کریں گے لیکن تمہارے مستقبل سے کھیلا نہیں جا سکتا۔ تم سنجیدگی سے سوچنا۔"

منورما نے اُس وقت تو انکار میں سر ہلا دیا تھا۔ لیکن سوچا بھی۔ بھوشن اور ستلی والا دو دنیاؤں کے آدمی تھے۔ ستلی والا بہت شریف، مہذّب اور خوش وضع تھا۔ لیکن بھوشن میں عام آدمیوں کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ اس مقابلے سے وہ اُداس ہو جاتی تھی۔ جگدیش اور منورما لاہور لوٹ گئے۔ ستلی والا کو ابھی مسوری میں ایک ہفتہ اور رہنا تھا۔ منورما اور ستلی والا بغیر کسی معنی خیز بات چیت

کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

منورما صبح ہی مسوری سے آئی تھی۔ شام کے وقت باہر کے کمرے میں بیٹھی اپنا ایک سوئٹر ٹھیک کر رہی تھی کہ برآمدے میں آہٹ سن کر اُس نے نظر اُٹھائی۔ بھوشن تھا، اور اس کے ساتھ ہی سُکھدا، مہیلا کالج کی لیکچرر کھدر کی ساڑی پہنے۔ منورما نے پچھلی ملاقات کے وقت بھوشن کے ساتھ اپنے سلوک کو دھو ڈالنے کے خیال سے انھیں زیادہ اخلاق کے ساتھ بٹھایا۔ بھوشن گمبھیر تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم میری بات کا غلط مطلب نہ سمجھو گی۔" بھوشن بیٹھتے ہوئے بولا۔ سُکھدا کی موجودگی میں ایسی بات شروع ہوتے ہی منورما چونکی۔ بھوشن نے پوچھا۔ "تم کالج میں بغیر تنخواہ کے کام کرتی ہو؟"

منورما نے ہاں کہا۔

"تم نے کالج میں تنخواہ کے بغیر کام شروع کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دسہرے کی چھٹیاں شروع ہونے کے دن کالج کمیٹی نے سُکھدا کو ملازمت ختم کر دینے کے لیے ایک مہینے کا نوٹس دے دیا ہے۔ ان کا کام مفت ہو تو پھر وہ کسی کو تنخواہ کیوں دیں۔!"

منورما افسوس ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن بھوشن بولتا گیا۔ "تمہارا تو صرف شوق پورا ہو رہا ہے، اس بے چاری کی روزی جا رہی ہے۔ یہ وکائی (جنگ کے دنوں میں عورتوں کی ایک تنظیم) میں بھی نوکری نہیں کر سکتی کیوں کہ پولس رُ نتی ہے۔ اس کے دونوں بھائی پارٹی ممبر ہیں اور سارا وقت پارٹی کے لیے کام کرتے ہیں۔"

منورما نے سکھدا سے کہا۔ "آپ فکر نہ کیجئے۔ ایسا ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ میں آج ہی سکریٹری کو کام نہ کرنے کی اطلاع دے دوں گی۔ اور یہ بھی لکھ دوں گی کہ آپ کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کے طور پر کام چھوڑ رہی ہوں۔"

بھوشن نے سُکھدا سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

منورما نے ٹوکا۔ "واہ اتنی جلدی کیا ہے؟ بیٹھئے نا! اُس نے سُکھدا کی طرف دیکھا۔ "چائے منگا رہی ہوں۔"

بھوشن نے سُکھدا کی طرف سے جواب دیا۔" جانے دو انھیں ایک ضروری کام ہے۔" سُکھدا چلی گئی۔

بھوشن مطمئن اور خوش ہوکر بولا۔" تمھیں بغیر تنخواہ کے ہی کام کرنا ہے تو کوئی اور مفید کام کرو۔ ایف۔ اے کی لڑکیوں کو پڑھانے کا کام تو کوئی بھی بی اے پاس لڑکی یا عورت کرسکتی ہے۔ تم نے بہت مطالعہ کیا ہے۔ تم میں صلاحیت ہے۔"

"بتائیے کیا کروں؟" منورما نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تمہارے لیے لکھنے سے اچھا دوسرا کام نہیں ہے۔"

"کیا لکھوں؟ روز روز کیا لکھوں؟"

"صوبائی پارٹی ایک ہفتہ وار اخبار نکال رہی ہے۔ اس میں وقت دو۔" بھوشن نے اپنا پن جتاتے ہوئے کہا۔

"میں پارٹی لائن ٹھیک نہیں سمجھتی۔" منورما نے بے بسی کے ساتھ کہا۔

"بنیادی باتیں تو تم سمجھتی ہو۔" بھوشن نے سمجھایا۔" لیکن روز کے مسائل سے قریبی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے بہت سے پہلو تمہاری نظروں سے اوجھل رہ جاسکتے ہیں، چھوٹ سکتے ہیں۔ یا ان کے ہر پہلو تک نظر نہیں جاتی۔ چیزوں کے ایک دو گوشے بدل جائیں تو چیز ہی بدل جاتی ہے۔ اینٹ، پتھر اور سیمنٹ سے مینار بھی بن سکتا ہے اور کنواں بھی۔ تعلق قائم رہے اور مسائل کو جانتی رہو تو وہ بات نہ رہے گی۔ اخبار میں کام مزید جاوید بھی ہیں۔"

"تیار ہوں۔ کب سے آؤں میں؟" منورما نے دل چسپی لیتے ہوئے کہا۔

"کل صبح نو بجے آؤ۔ اس ہفتے کا شمارہ تیار ہو رہا ہے بلکہ ہو بھی گیا ہے۔" بھوشن نے جواب دیا۔

منورما کالج چھوڑ کر پارٹی آفس میں جانے لگی۔ اُس کے گھر سے مکلوڈ روڈ کافی دور تھا اس لیے منورما گھر سے بھائی کے ساتھ گاڑی میں جاتی تھی۔ بیرسٹر کچہری میں یا اپنے کاروبار کے دفتر میں اُتر جاتا۔ اور ڈرائیور برکت منورما کو مکلوڈ روڈ پر لے جاتا۔ منورما عام طور پر گاڑی سے چوراہے پر ہی اُتر جاتی تھی۔ باقی چالیس پچاس قدم پیدل جاتی تھی۔ گاڑی وہ عام طور پر پارٹی آفس کے سامنے نہیں لے جاتی تھی۔ بھٹے حال نوجوانوں کے درمیان اِس کی چمک دار بڑی کار بے موقع اور جھجک کا سبب بن جاتی تھی۔

ایک ایک مضمون لکھنے کے لیے پیپر کمیٹی میں لمبی لمبی بحثیں ہوتی تھیں۔ کامریڈ جاوید پارٹی کے فیصلوں کے مطابق لکھتا تھا۔ اور منورما کو بھی ویسے ہی لکھنے کے لیے کہتا تھا۔ منورما اُس سے بحث کرنے لگتی۔ جاوید عام طور پر جواب دیتا۔" کامریڈ تم ابھی تک ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۰ء کی لائن پر سوچ رہی ہو۔ یہ ۱۹۴۴ء ہے۔" اس طرح کا لکھنا منورما کو لکھنے کا لطف اور اطمینان نہیں دیتا تھا۔ اس سے اس کے ادبی ذوق کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ یہ صرف حکم کو پورا کرنا تھا۔

پانچویں شمارے کے وقت اخبار کے صفحات بڑھانے کی تجویز پیش ہونے پر مالی مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ پارٹی کے اکاونٹنٹ نے شکایت کی کہ پچھلے مہینے اخبار کی تین ہزار کا پیاں ہفتہ وار چھاپنے میں ساڑھے پانچ سو روپے سے زیادہ خرچ ہو چکے تھے۔ اس نے حساب سامنے رکھ دیا۔" ایک سو تئیس روپے چھپائی، ایک سو بیس روپے بلاکوں کی اُجرت، دو سو پچاس روپے کاغذ اور اسی روپے ڈاک خرچ، پینتالیس روپے کامریڈ جاوید، جگ رام اور نرسنگھ کی مزدوری۔ کامریڈ منورما معاوضہ نہیں لیتیں۔ دو سو کاپی پرچار کے لیے مفت دی گئی ہیں ان کی قیمت نہیں آئی۔ بکری کا کل دو سو روپیہ ملا ہے۔ آپ خرچ اور بڑھانا چاہتے ہیں۔ کہاں سے پیسہ دوں؟ مجھے اخبار فنڈ ....۱ روپیہ دیا گیا ہے۔ اس حساب سے صرف ایک مہینہ اور اخبار نکلے گا۔" طے ہوا کہ قیمت نہ بڑھا کر اور فنڈ اکٹھا کیا جائے ضلعوں میں سالانہ خریداری کے لیے سرکلر بھیجے جائیں۔

جگ رام نے حساب میں ۴۵ روپے کے خرچ پر اعتراض کیا۔ جاوید، نرسنگھ اور اس کا خرچ اخبار کے نام کیوں ڈالا گیا تھا۔ وہ لوگ دوسرے فرنٹ پر بھی تو کام کر رہے تھے۔ منورما کو سب سے تیکھی یہی بات لگی۔ ایڈیٹر اور مینجر کی تنخواہ پندرہ پندرہ روپے ماہانہ۔ اس کے مہینے بھر کے کام کی مزدوری پندرہ روپے! اس کام کی مزدوری پندرہ روپے تھی، جو کام سماج اور ملک کی حالت بدلنے کے لیے کیا جارہا تھا۔ اس اخبار کے مخالف اخباروں میں ایسے کام کے لیے ڈیڑھ سو سے پندرہ سو تک مزدوری تھی، اور وہ لوگ اتنا وقت دے کر اتنی محنت سے کام نہیں کر سکتے۔ فخر سے اس کا سینہ پھول اُٹھا۔

منورما کو تیوہاروں پر بھائیوں سے کافی روپیہ ملتا تھا۔ ضرورت ہونے پر اور بھی مل جاتا تھا۔ وہ سب روپے خرچ کر دیتی تھی۔ پچھلے سال دل کی حالت گمبھیر رہنے کی وجہ سے اُس نے کوئی نیا کپڑا یا چیز نہیں خریدی تھی۔ پچھلی ہی چیزیں اتنی پڑی تھیں۔ کئی ساڑیاں تو اُس نے سوما کو دے دی تھیں۔ بہن تجھے پسند ہے، تو ہی پہن لے۔ مجھے اب یہ اچھی نہیں لگتیں۔ اس کے پاس دو سو

روپے تھے۔ یہ اُس نے اخبار فنڈ میں دے دیے۔

منورما نے ایک خط اپنی میز پر کھُلا پڑا پایا۔ خط بھائی کے نام تھا۔ لیکن اُس کی میز پر رکھا جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی پڑھ لے۔ خط سُتلی والا کا تھا۔ بہت محتاط زبان میں دوست کی بہن سے شادی کی تجویز تھی۔ خط پڑھ کر منورما کے دل کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ آنکھیں بند کرکے پلنگ پر لیٹ گئی۔ تصور میں ستلی والا اور بھائی سے سُنے ہوئے بمبئی کے حالات اور سینما میں دیکھی ہوئی بمبئی کی تصویریں گھومنے لگیں۔ بھائی سے اُس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ بات ہر لمحہ دل اور دماغ میں موجود رہتی۔ منورما پارٹی کے اخبار میں کام کرنے جاتی اور سوچتی رہتی۔ اس کام کا ویسی زندگی سے کیا میل ہوگا؟ لیکن پارٹی کے اخبار کا کام زندگی بھر کا مستقل کام نہیں ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ بیرسٹر بھیا روایتوں اور سماجی پابندیوں کو نہیں مانتے، لیکن پتاجی، ماتاجی اور دونوں دوسرے بھائی کیا اسے قبول کریں گے؟ اس کے لیے زندگی میں جو بھی راستہ دکھائی دیتا ہے اُس پر تالا لگ جاتا ہے۔

بیرسٹر سہائے کی تیسری اولاد کی پیدائش کے وقت ماں جی دھرم شالہ سے نہ آسکیں۔ کلکتہ اور کراچی سے دونوں بھابیاں بھی نہ آسکیں۔ جنگ کی وجہ سے کاروبار کی حالت کچھ ایسی تھی کہ کسی کا بھی اپنے کاروبار کی گدی سے ایک دن کے لیے بھی ہلنا ہزاروں لاکھوں پر پانی پھر جانا تھا۔ لیکن لڑکے کے نام رکھنے کے دن سب لوگ آگئے تھے۔ سب سے پہلے ماں جی آئی تھیں۔

ماں جی کے گھر لوٹنے پر سوما نے بھی ان کے پاؤں چھوئے۔ ماں جی نے اُسے اشیرواد (دُعا) تو دے دیا۔ لیکن دبے لہجے میں منورما سے پوچھ لیا۔ "یہ کون ہے منّو؟ دھن سنگھ کی بہو سوما کہاں ہے؟" لاہور سے بہو اور منّو کے خط میں بار بار سوما کی تعریف پڑھ کر انھوں نے دل میں کئی باتیں سوچی تھیں۔ لاہور پہنچ کر اسے انعام دینے کا خیال تھا۔

منورما ہنس پڑی۔ "واہ ماں جی پہچانا نہیں! سوما ہی تو ہے۔" گھر میں سوما کا اختیار اور اس کی حکومت دیکھ کر ماں جی کی سفید بالوں سے ڈھکی کھوپڑی میں بے چینی پیدا ہوئی۔ لیکن چپ رہ گئیں۔ تیسرے دن اور بھی لوگ آپہنچے۔ کوٹھی بھر گئی۔ سوما کو دیکھ کر سب پوچھتے تھے۔ یہ کون ہے! جواب پاکر حیرت ظاہر کرتے تھے۔ نوکرانی یا مالکن!

سوما بھی دقت محسوس کر رہی تھی اور ممکن طور پر سمٹی رہتی تھی۔ لیکن پُرانی سوما کیسے بن جاتی!

جگدیش سے بات کرنے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ پل بھر کے لیے اُس سے ملی تو کہا۔" لوگ مجھے سہہ نہیں رہے ہیں۔ کچھ دنوں کے لیے مجھے کہیں بھیج دو۔"

جگدیش نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ "اونہہ۔ ڈیمڈ (بھاڑ میں جائیں)!"

جگدیش نے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں اپنی بھابیوں، پتنی اور بہن کو تحفہ دینے کے لیے ساڑیاں خریدنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ کام منورما کو سونپ دیا تھا۔ منورما بھابیوں سے خاص طور پر بڑی بھابی کے مزاج سے ڈرتی تھی۔ اس خیال سے کہ اس پر خود غرضی اور جانب داری کا الزام نہ لگے، اُس نے سب کے لیے ایک دام کی، ایک رنگ کی، ایک ہی کنارے کی ساڑیاں خریدلی تھیں۔ دل میں سوچا تھا۔ سب ایک ہی ساڑیاں پہنیں گی تو اچھا بھی لگے گا۔ اور سب ایک جیسی معلوم ہوں گی۔

ساڑیاں سب سے پہلے بڑی بھابی (مسز کرشن سہائے) کے سامنے رکھی گئیں۔ منورما اور مسز جگدیش بھی موجود تھیں۔ ایک سی سب ساڑیاں بڑی بھابی کو اچھی نہ لگیں۔ وہ بولیں۔" تم لوگ اپنی خواہش پوری کرو۔ ہم نے تو بہت اوڑھ پہن لیا۔ اب کیا ہے اس عمر میں۔" پھر ساڑیوں کے رنگ اور کنارے دیکھتے دیکھتے ساڑیوں کو گن لیا۔ "یہ تو پانچ ساڑیاں ہیں!" انھوں نے پوچھا۔

"سوما کے لیے بھی ہوگی نا۔" مسز جگدیش نے دھیرے سے کہہ دیا۔

بڑی بہو کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ غصے سے دم پھول گیا۔ نزدیک کھڑی اپنی چھوٹی لڑکی کو حکم دیا۔ "جگدیش کو بلادو۔"

بیرسٹر نے آکے پوچھا۔" کیا ہے بھابی؟"

مسز کرشن سہائے نے پانچوں ساڑیاں اُٹھاکر اُس پر پھینک دیں۔" میں کیا تمھاری نوکرانی ہوں؟ تم میرے لیے اور اپنی نوکرانی کے لیے ایک سی ساڑی لائے ہو؟ تمھاری یہ مجال؟"

بڑی بہو غصے میں مناسب غیر مناسب بھول کر بولتی گئیں۔" کمانے کے نام پر ایک پیسہ کمانے کی ہمت نہیں۔ دوسروں کی کمائی پر گلچھرّے اُڑائیں اور انھیں کی بے عزّتی کریں۔"

جگدیش کا بھی خون کھول گیا۔ بڑی بھابی پہلے بھی کئی بار ایسی بدتمیزی کر چکی تھیں اور جگدیش کو چپ چاپ سہنی پڑی تھی۔ لیکن اب حالت دوسری تھی۔ اُس نے بھابی کی طرف غصّہ بھری نگاہوں سے دیکھ کر تیکھے انداز سے کہا۔" زبان سنبھال کر بولیے! کون ہے مجھے کھلانے والا۔ اپنے گھر میں جیسا چاہوں گا، دوں گا، لوں گا۔ کسی کا نوکر نہیں۔

کوٹھی میں کہرام مچ گیا۔ ماں جی اور منجھلی بہو بھاگی ہوئی آئیں۔ بھلی عورتیں ہنگامے میں

ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر، چلّا چلّا کر بولنے لگیں۔ نوکر دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر سُننے لگے۔ صرف سوما نہیں آئی۔ وہ جھگڑا شروع ہوتے ہی جا کر اپنی کوٹھری میں چھپ گئی تھی۔

موقع دیکھ کر نوکروں کی زبانیں بھی کھلنے لگیں۔ ان کے بھی بیان لیے جانے لگے۔ اس وقت جو نہ کہا اور نہ سمجھا گیا وہی غنیمت۔ بڑی بہو کی آواز بار بار کڑک اُٹھتی تھی۔ "اسی بے عزّتی کے لیے ہمیں بلایا گیا ہے۔ بڑے علم والے بنتے ہیں۔"

ماں جی کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ "ہائے میں وہاں دور تھی، کیا جانتی تھی کہ سب ہو رہا ہے۔"

چھوٹی بہو کے بھاری بھرکم اور حرکت نہ کرنے والے جسم کے گلے سے باریک آواز سنائی دے جاتی تھی۔ "ہائے میں سیدھی سادی کیا جانتی تھی کہ میری ہی جڑوں پر کلہاڑیاں چل رہی ہیں۔"

منورما نے اپنے علم کے زور سے ایک دو بار سمجھانے کی کوشش کی۔ اور ساڑیاں خریدنے کی ذمّہ داری اپنے اوپر لے لی۔ بڑی بہو نے اُسے پھٹکار دیا۔ "بننے کو ادھیڑ عمر تک کنواری بنتی ہے۔ لیکن دنیا کے سب کاموں میں دخل ہے۔ شرم نہیں آتی؟ بھائی کی دوتی (پردہ) بنی ہے۔ ایک دوسرے کے کاموں پر پردہ ڈالو...... جو چاہو کرو۔ ہماری مٹی کیوں خراب کرتی ہو!"

منورما پڑوس کی کوٹھی میں ایک سہیلی کے پاس جا بیٹھی۔ دو گھنٹے بعد جنگ سرد نہ پڑتی دیکھ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کتاب پڑھنے لگی۔ جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا۔ کرشن سہائے لالہ جی کے پاس پہنچے اور جگدیش سہائے کو بلوایا۔ ادھم سنگھ انھیں بلانے پہنچا تو دیکھا کہ بیرسٹر گاڑی میں کوٹھی سے باہر جا رہے تھے۔

جگدیش نے کوٹھی سے باہر جا کر سوچا۔ کہاں جائیں۔ کلب؟ ایسی دماغی حالت میں ٹھیک سے بات چیت کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ مال روڈ پر چلا گیا۔ اور ایک خالی بار میں بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر رکھے وہسکی سوڈے کے گلاس میں بلبلے پڑ رہے تھے۔ ویسے ہی بلبلے اُس کے دل میں اُٹھ رہے تھے۔ کیسے جاہلوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اچھی بھلی ساڑی اُن کی نظروں میں اس لیے گر گئی ہے کہ نوکرانی کے لیے بھی اسی کے ساتھ کی ساڑی لی گئی ہے۔ واہ رے غرور!

دماغی اُلجھن میں جگدیش نے ڈبل پگ کا آرڈر دیا تھا۔ غصے سے گلا سوکھنا محسوس ہونے کی وجہ سے گلاس کو سوڈے سے بھی پورا بھر لیا تھا۔ تین چار گھونٹوں میں ہی گلاس آدھا ہو گیا اور ماتھا کچھ گمگما اُٹھا۔ جگدیش کو خیال میں بڑی بھابی کھڑی دکھائی دینے لگیں۔ کوٹھی میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب کسی قسم کا

خطرہ نہ ہونے کی وجہ سے خیال ہی میں کہنے لگا۔ 'نوکرانی! کیا تمہاری نوکرانی؟ ..... نوکرانی کے مقابلے میں اپنی تمیز دیکھو۔ آئینہ لے کر نوکرانی کے مقابلے میں اپنی شکل دیکھو۔ تمہارے پاس ایسی کون بہتر چیز ہے؟ تمہارے ماں باپ نے تمہارے لیے ایک مرد پھنسا دیا ہے۔ نہیں تو کوئی تمھیں برتن دھونے کو بھی نہیں رکھتا۔ پیسے کا غرور؟ جیسے اور کوئی پیسہ کمانا نہیں جانتا۔ جب تک خیال نہیں کیا تھا، نہیں کیا۔ اب دیکھیں گے ..... یہ میرا گھر ہے۔ یہاں تم فیصلہ اور حکم دینے والی کون ہو؟ منہ لگتا ہے، اپنے آدمی کے منہ لگو۔ تمہارا لحاظ ہوگا اُسے۔ مقابلہ کرنے چلی ہو سوما سے؟ کہاں گوبر کا تودا کہاں ہاتھی دانت کا کھلونا! ..... بڑی ستی بنتی ہے! ..... ارے تمہیں پوچھتا ہی کون ہے ...... واہ رے طبقے کا غرور!'

جگدیش کو یاد آگیا۔ منورما کے نوکری کرنے کی بات پر کتنا جھگڑا ہوا تھا۔ اُس وقت اُس نے طبقے کے خیال کی تائید کی تھی۔ سوچنے لگا۔ کتنا ظلم ہے ان لوگوں کا مجھ پر! مجھے اپنے خیالوں کی مخالفت میں کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ سماجی چوری سے اکٹھے کیے ہوئے روپے کا اتنا غرور ہے۔ غریب ان سے دبتے ہیں، لیکن میں کیوں دبوں! جو کچھ یہ کرتے ہیں میں بھی کر کے دکھا سکتا ہوں۔ بلکہ ان سے زیادہ۔ اِن کے پاس دماغ تو ہے نہیں۔'

جگدیش نے باقی آدھا گلاس ختم کر کے گھڑی دیکھی۔ سات بج رہے تھے۔ اس جگہ اکیلے اور بیٹھے رہنا اچھا نہ لگا۔ وہ نہر کی طرف سے ماڈل ٹاؤن ہوتے ہوئے ٹھنڈی ہوا میں دس میل کا چکر لگا کر پھر دوسری بار ریستوران بلبیریو، میں جا بیٹھا اور وھسکی کے ایک پگ کے لیے آرڈر دے دیا۔ اسے گھر جانے کی نہ خواہش تھی نہ ہمت۔ کھانا وہیں کھالیا۔ کھانے کے بعد بلبیریو میں ناچ شروع ہو گیا تھا۔ اُس رات مڈنائٹ (آدھی رات سے بعد تک کا ناچ) تھا۔

جگدیش نے ولایت میں ناچ سیکھا تھا۔ ناچ میں دلچسپی بھی لیتا تھا۔ لیکن اِس وقت وہ ایک کنارے بیٹھا رہا۔ اُس کی نگاہیں ناچ کی طرف تھیں۔ لیکن دل اپنے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ آرکسٹرا پر ناچ کی گت بج رہی تھی۔ ناچ کے وقت ہال میں روشنی ہو جاتی تھی۔ ایک ناچ ختم ہونے سے دوسرا ناچ شروع ہونے سے پہلے دو منٹ سفید روشنی رہتی۔ زیادہ لوگ ناچ کی پوشاک میں تھے۔ مرد کالے سوٹ پہنے تھے اور عورتیں رنگ برنگی پوشاکوں میں تھیں۔ میمیں ایسے گاؤن پہنے تھیں کہ کندھے سے نیچے دور تک جسم دکھائی دیتا تھا۔ ہندوستانی عورتیں ساڑیاں اور اونچی کاٹ کے بلاؤز۔ ان کی پیٹھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بانہیں، کندھے اور چھاتی دونوں پستانوں کے ملنے کی جگہ تک

کھلے ہوئے تھے۔ ہندوستانی عورتوں کے اُونچے بلاؤز سے پیٹ جھلک جاتا تھا اور یورپین عورتوں کے اسکرٹ بغلوں میں کھُلے ہونے کی وجہ سے پنڈلیاں نظر آ جاتی تھیں۔ ان میں سے کسی کی چمڑی کا اصل رنگ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سب پاؤڈر سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان کے ہونٹ بھویں سب نقلی، ولایت سے آئی بوتلوں کی چیزوں سے رنگی ہوئی تھیں۔ ایسا نظارہ جگدیش کو عام طور سے ناچ کے لیے تیار کر دیتا تھا لیکن اِس وقت اُس کا دل نہ چاہا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ سوما اِن سب سے کتنی اچھی ہے۔ کاش اسے یہاں لاکر ان لوگوں کو دکھاتا۔

جگدیش کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر مسز کرٹو نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" مسز باٹلی نے بھی اسے ناچنے کی دعوت دی۔ لیکن جگدیش نے ڈریس اور طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی معذرت کر لی۔ اُس نے سگار سلگا لیا اور ایک پگ وسکی اور منگا کر سامنے رکھ لیا۔ وہ اپنی اُلجھن اور جھنجلاہٹ سے چھٹکارا نہیں پا رہا تھا۔ کس مصیبت کے ساتھ اس کا بیاہ کر دیا گیا تھا۔ ویسی عورت کو ساتھ لے کر بھلی سوسائٹی میں نہیں جا سکتا تھا۔ عورت ہے یا بھینس؟ سوما ہوتی تو وہ اچھی سے اچھی محفل میں رانی معلوم ہوتی! ...... نہ جانے یہ لوگ کتنے دن ٹھہریں گے اور اُسے کتنا پریشان کریں گے۔ میں ان لوگوں کی کیا پروا کرتا ہوں؟ لیکن اُسے گھر واپس جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی دس ہی بجے تھے۔

جگدیش کو نشے کے بوجھ سے لیٹنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ نشے کی حالت میں سوما اُس کے بدن کو ممتا سے سنبھال کر سکھ پہنچاتی تھی۔ اس کی کمی کھٹک رہی تھی۔ لیکن کوٹھی جانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ وہ بہت غمگین ہو گیا۔ "میں بے وقوفوں اور برُے سنسکاروں کو ماننے والوں میں پھنس گیا ہوں ...... سوما اِن لوگوں کے مظالم سے پِس جائے گی ...... پورا سماج پس رہا ہے ...... ! بہ ظاہر آزاد ہو کر بھی میں پس رہا ہوں ...... اس حالت کی غیر موزونیت اور کھوکھلا پن کو سمجھتا ہوں۔ لیکن کمزور اور بے اثر ہوں۔ میرے سمجھنے سے کیا فائدہ؟ ..... عمل کے بغیر اصول جھوٹ اور فضول ہے۔" "میں صرف سوچنے والا ہوں۔ عملی انسان نہیں ہوں۔ نہیں تو سماج کو بدل دیتا ..... کتنا کمزور اور نکمّا ہوں۔ دکھ یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں"!

جگدیش رات کے دو بجے ناچ ختم ہونے کے بعد کوٹھی پر پہنچا۔ پھاٹک پر بیٹھے چوکیدار کے علاوہ سب لوگ سو گئے تھے۔ سنّاٹا تھا۔ سوما کے کمرے تک جانے کی ہمّت اُسے نہیں ہوئی۔ منھ لپیٹ کر کر بستر میں لیٹ گیا۔ صبح سوما نے پیالی میں چمچہ کھٹکھٹا کر اُسے نہیں جگایا۔ ادھم سنگھ اپنے دن لوٹتے جان کر خود ہی چائے بنا لایا تھا۔ جگدیش نے اُسے حجامت کے لیے گرم پانی لانے کو کہہ دیا۔ دوسری

کوئی بات نہ کی۔ وہ صبح ہی کپڑے پہن کر گھر سے نکل گیا۔

سوما اپنی کوٹھری میں دبکی ہوئی رات بھر کوٹھی میں مچے کہرام کی گونج سنتی اور روتی رہی۔ وہ کیا کر سکتی تھی؟ صاحب کے سوا اُس کا اور کون تھا۔ صاحب سے بغیر پوچھے اور بات کیے وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن صاحب سے ملتی یا بات کرتی تو کیسے؟ سوچ رہی تھی صاحب ہوں گے کہاں؟ اُٹھ کر کچھ پتہ لگائے لیکن کوٹھری سے نکلے کیسے؟

آدھی رات میں جھگڑے کی گونج کم ہوئی تو سوما کو ڈرائنگ روم کے کلاک سے بارہ بجنے کی ٹن ٹن سنائی دی۔ ایک کا گھنٹہ بھی سنائی دیا۔ لیکن لوگوں کے دھیمے دھیمے بات کرنے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ صاحب باہر گئے ہوں گے تو بھی لوٹ آئے ہوں گے۔ اُنھوں نے مجھے بلایا نہ خبر دی۔ وہ صاحب کے پاس جانے کی ہمت کیسے کرتی؟ کوئی دیکھ لیتا۔

سوما کی رات آنکھوں پر آنچل رکھے بیت گئی۔ دن چڑھ آیا۔ دھوپ خوب نکل آئی تھی۔ لیکن سوما کو اپنی کوٹھری سے نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سب کچھ وہی تھا۔ وہی کوٹھی، وہی لوگ لیکن چند گھنٹوں میں کتنا بدل گیا تھا۔ جگدیش کے کچہری یا دفتر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ اس سے مل نہیں سکی تھی۔

نوکر بسنتا سوما کے کمرے میں آیا اور روکھے ڈھنگ سے بولا۔ "ماں جی نے کہا ہے۔ اپنے کپڑے لے لو اور موٹر میں چلی جاؤ۔ موٹر باہر کھڑی ہے۔"

سوما نے رو رو کر سوجی ہوئی، آنسوؤں سے بھری آنکھیں اُٹھا کر بسنتا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کہاں چلی جاؤں؟"

"میں کیا جانوں؟" بسنتا چلا گیا۔

سوما پھوٹ پھوٹ کر رو اُٹھی۔ ہائے کہاں چلی جاؤں؟ کیا اسی لیے مجھے پہاڑ سے لائے تھے۔ کہاں چلی جاؤں؟ میرا اپنا کیا ہے جو لے لوں؟ بٹوے پر نظر پڑی۔ اس میں گھر کے لگ بھگ تین سو روپے تھے۔ وہ بھی اُس کے نہ تھے..... صاحب کو بلواؤں، لیکن کیسے؟ صاحب تو کچہری چلے گئے ہوں گے؟ اُنھوں نے ایک بار بھی میری خبر نہ لی۔

بسنتا پھر آیا۔ "جلدی کرنے کو کہہ رہی ہیں۔"

سوما نے دبی ہوئی آواز میں التجا کی۔ "بھائی ذرا صاحب کو بُلا دو۔"

"صاحب کبھی کا گیا۔" بسنتا ٹھہرا نہیں۔

باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز بار بار سنائی دے رہی تھی کہ وہ جلدی کرے۔ بڑی بہو کی کڑک سنائی دی۔ "گیا گئی نہیں ابھی ؟"

دائی جیواں آئی اور بولی۔ "جلدی کرو۔ بڑی بی بی غصہ ہو رہی ہیں۔"

سوما ڈری۔ بڑی بہو نے بانہہ پکڑ کر نکلوا دیا تو کیا ہوگا؟ چار دن میں انھیں بہت کچھ سمجھ آ گئی تھی۔ رونا ضبط کر کے ہونٹوں کو دبائے بیٹھی تھی، اُٹھ کھڑی ہوئی اور موٹر کی طرف چل دی۔

برکت نے سوما کو ڈیوڑھی میں آتے دیکھ کر اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ پیچھے بڑھا کر پیچھے کی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ قاعدے کے مطابق گاڑی سے اُترا نہیں۔ سوما بیٹھ گئی تو اُس نے ویسے ہی لاپرواہی سے دروازہ بند کر لیا۔ موٹر چل پڑی۔

موٹر بنگلے سے کچھ ہی قدم آگے گئی تھی، سوما نے روہانسی آواز میں پکارا۔ "بھائی!"

برکت نے گھوم کر دیکھا۔ اُس کے ماتھے پر بل تھے۔ "کیا ہے ؟"

سوما کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ "کہاں لے جا رہے ہو ؟"

"اسٹیشن۔"

"کہاں جانے کے لیے ؟"

"جہاں جا ہو۔" گاڑی آہستہ کر کے برکت نے جواب دیا۔ "ماں جی نے پچاس روپے دیے ہیں۔ جہاں کا ٹکٹ کہو، خرید دوں۔ باقی روپے تمہارے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔" برکت گاڑی تیز کر رہا تھا۔

"سنو بھائی! سوما نے ہچکی لے کر پکارا۔

"کیا ؟" برکت نے گھوم کر دیکھا۔

"ذرا صاحب کے دفتر میں لے چلو۔"

برکت کی آواز سے روکھا پن دور ہو گیا۔ اُس نے بے بسی سے کہا۔ "ماں جی کا حکم تو ہے کہ اسٹیشن پر چھوڑ آؤ۔ تم اچھی مصیبت کر رہی ہو۔"

"ہاتھ جوڑتے ہیں۔"

"تمہیں دفتر لے جاؤں اور کہیں صاحب مجھے ہی کچّا کھا جائیں ؟"

"میری خاطر ایک بار۔" سوما گڑگڑائی۔ "تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔"

برکت نے اگلے موڑ سے گاڑی گھما دی اور ایک مکان کے سامنے گاڑی روک کر بولا۔

"میں جا کر صاحب کو خبر دیتا ہوں۔"

برکت نے واپس آکر کہا۔ "صاحب دفتر میں نہیں ہیں۔ اجلاس پر گئے ہیں۔"

"ہائے دو منٹ ٹھہر جاؤ!"

"بیٹھا تو ہے حرام زادہ! کہتا ہے۔ کہہ دو نہیں ہیں۔" برکت جھلّایا۔

سوما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گاڑی تیزی سے اسٹیشن کی طرف چل دی۔ اسٹیشن کے نزدیک جاکر پھر پوچھا۔ "ہاں، کہاں کا ٹکٹ لوں؟"

سوما روتی رہی۔ بولی نہیں۔ برکت نے گاڑی روک دی اور پوچھا۔ "بولو گی بھی کچھ کہ روتی رہو گی؟"

"کہیں کا نہیں۔" سوما نے چہرہ ڈھانکے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر گاڑی میں رہو گی؟ کہاں پہنچا دوں۔ کوئی جگہ ہے؟"

"کوئی نہیں۔" سوما آنچل میں منہ ڈھانکے رہی۔

"آخر مجھے تو گاڑی کوٹھی پر پہنچانا ہے۔"

"مجھے کہیں ندی پر یا جنگل میں پہنچا دو۔" سوما نے جواب دیا۔

"وہاں کیا کرو گی؟"

"مروں گی۔"

برکت نے پل بھر سوچا۔ گاڑی چلا کر ایک طرف موڑ دی۔ ایک سونی جگہ پر رُک کر سوما کو پکارا۔ "سنو!"

"ہوں۔" سوما ہچکیاں لے رہی تھی۔

"میرے ساتھ چلو گی؟"

سوما نے پل بھر سوچا۔ اور سر جھکا کر حامی بھر دی۔

برکت نے سوال کیا۔ "جہاں کہوں گا؟"

سوما نے گردن کے اشارے سے منظور کر لیا۔

"تو پھر مرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دنیا میں بہت جگہ اور بہت موقع ہے۔ سنو۔ کچھ روپیہ لائی ہو؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟ تمہارے پاس ہی تو روپیہ رہتا تھا۔"

سوما نے آنچل سے منہ ڈھانکے ہی جواب دیا۔ "روپیہ میرا نہیں تھا۔ اُن کا روپیہ نہیں لوں گی۔"

"مانتے ہیں تمھیں!" برکت نے احترام کے انداز میں کہا۔ "ہو پانی دار۔ اچھا تمھیں کچھ دیر کے لیے ایک جگہ ٹھہرا دوں۔" برکت گاڑی کو دلی دروازے کی طرف شہر کے اندر لے گیا اور ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑی اور بولا "تم یہاں ٹھہرو۔ میں دو گھنٹے میں لوٹ کر آتا ہوں۔ گاڑی کو کھٹی پر پہنچا کر اور روپیہ لے کر آتا ہوں۔ بے ایمان کہیں میرے نام گاڑی چوری کا وارنٹ نہ کرا دیں۔"

"آؤ گے تو کتنی دیر میں؟" سومانے سہمی آواز میں پوچھا۔

برکت نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ "یہ غریب کا قول ہے امیروں کی بات نہیں جس میں خطرے اور نقصان کا خیال ہو۔ جب کہہ دیا تو آئیں گے ہر حالت میں 'بہ شرطِ زندگی'، خدا حافظ۔"

گھریلو زندگی کا سراب

بیرسٹر جگدیش اور منورما نے بڑی بھابیوں کی توہین کرنے کی سازش کر کے، اُن کے اور نوکرانی سوما کے لیے ایک جیسی ساڑیاں خرید لی تھیں۔ اِس واقعہ کے نتیجے کے طور پر جو کہرام مچا وہ صرف سوما کو گھر سے باہر نکلوا کر ختم نہیں ہوا۔ بیویوں کی رنجش سے بھائیوں کے دل پھٹ گئے۔ باپ کے رہتے ہی بٹوارے کی بات ہونے لگی اور اِس سوال کو لے کر جھگڑے ہونے لگے۔ منورما کا منہ کھلتے ہی بڑی اور چھوٹی بھابیاں برس پڑتیں، گھر کی بیٹی کی عزّت کا خیال بھی اُن کی زبانوں کو قابو میں نہ رکھ سکتا۔ اس کی عمر اتنی زیادہ ہو جانے کا احساس، اس کے اکیلے گھومنے کا طعنہ، جانے کہاں کہاں لمبے لمبے خط کا الزام۔ بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی دونوں سر ہلا ہلا کر، ہاتھ پھیلا پھیلا کر بار بار کہتیں۔ "کسی عزّت دار گھر میں ایسی عمر کی کنواری لڑکی نہیں دیکھی۔"

منورما کے لیے ایسے ماحول میں، گھر میں رہنا ناممکن تھا۔ اخبار کے کام کے لیے پارٹی کے دفتر میں چلی جاتی تو یہ اُس کی آوارہ گردی اور بدکرداری کا ثبوت بن جاتا۔ منورما نے دو بار جواب دینے کی بھول کی لیکن لفظی جنگوں میں ایسی ہاری کہ گھنٹوں روتی رہی۔ اُسے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی بھی ہمت نہ رہی اور وہ اخبار کے کام کے لیے پارٹی آفس بھی نہ جا سکی۔

منورما کو سوچ سوچ کر ایک ہی راہ نظر آئی۔ اُس نے ستلی والا کو تار دے دیا۔

"تجویز منظور ہے، شادی دو ہفتے کے اندر ہو جائے۔"

منورما نے ایک خط میں ساری باتوں کی تفصیل لکھ کر بھائی کو دے دیا۔ وہ کوٹھی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اتنی بے چین ہو گئی تھی کہ اُس نے بھائی کو لکھ دیا کہ اب ایک دن بھی اُس کے لیے گھر میں رہنا ممکن نہ تھا۔ سول میرج کا انتظام پہلے سے کر لیا جائے تاکہ ستلی والا اُسے لے کر فوراً بمبئی جا سکے۔

جگدیش گھر کی حالت سے فکرمند اور جھلّایا ہوا تھا۔ اُس نے منورما سے بات کی۔ "تم نے

تار دے کر بہت جلدی کی۔ پہلے پتاجی اور دوسرے لوگوں سے رائے لی ہوتی۔"

منورما نے سر جھکا کر آنسو بھرے گلے سے جواب دیا۔" آپ ان لوگوں کو کہہ دیجیے میرے لیے اِس گھر میں جگہ نہیں رہی ہے۔ رائے کا سوال ہی کیا ہے۔ عدالت کو سات دن پہلے اطلاع دینا ضروری ہے۔ وہ آپ دے دیجیے۔ آپ سے نہ ہو تو میں خود کرلوں گی۔"

گھر میں ایک بار اور کہرام مچ گیا۔ لالہ جی کی حالت ویسی ہو گئی، جیسی میگھ ناتھ کے وار سے لکشمن جی کی ہو گئی تھی۔ ماں جی الگ بلک رہی تھیں۔ اُنھیں دلاسا دینے والا کوئی نہیں تھا۔

ماں جی کے دل میں تین بھائیوں کی اکیلی بہن کے بیاہ کے جانے کیا کیا ارمان تھے۔ وہ برسوں سے کتنے گہنے اور دوسری چیزیں سمیٹ سمیٹ کر رکھتی جا رہی تھیں کہ منّو کے جہیز میں کام آئیں گی۔ منّو بیاہ کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور اُس نے اب یہ گل کھلا دیا۔ انھوں نے چھاتی اور کوکھ پیٹ لی۔ وہ اپنی کوکھ کو گالیاں دینے لگیں۔

منجھلی بھابی نے پہلے کبھی نہ ہونے والے ظلم سے جھلّا کر دونوں انگلیاں دونوں گالوں پر رکھ کر کہا۔" ہائے میں مر گئی۔ ظلم دیکھو! یہاں تین بچے ہو گئے، اب بھی مردوں سے بات کرتے کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ ہمارا بیاہ ہوا تھا تو ڈولی پر چڑھ جانے تک معلوم نہ ہوا تھا کہ کہاں جا رہی ہوں۔ آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو تار دے کر شادی کرتی ہیں۔ لالہ جوالا سہائے بے بس تھے۔ اس کو لڑکی کے بیاہ کا موقع سمجھتے یا لڑکی کے بھاگ جانے کا کلنک؟ ایسی حالت میں کیسے دعوت دیتے، کیسے منھ دکھاتے! لڑکی ایک غیر مذہب کے پارسی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

رات میں بڑی بہو اور منجھلی بہو نے مشورہ کیا۔ دونوں بڑے بھائیوں نے بھی آپس بات چیت کی۔ بات کو بڑھا کر چھی چھی تھو تھو کرنے سے فائدہ نہیں تھا۔ پوچھے بغیر رائے دینے کا کیا مطلب ہوتا۔ لڑکیوں کی شادیاں جیسے ہوتی ہیں، اگر منورما کا بیاہ اُسی طرح ہوتا تو لالہ جی پچاس ساٹھ ہزار دیتے ہی۔ بیس، پچیس ہزار اوپر سے بھی خرچ ہوتا۔ بھائیوں کو بھی پانچ پانچ چھ چھ ہزار دینا ہی پڑتا۔ ماں جی تو فریر روڈ کی کوٹھی منّو کو جہیز میں دینے کا فیصلہ کیے ہوئے تھیں۔ اِس لیے اِس کوٹھی کا کرایہ الگ ہی رکھتی تھیں۔ یہ گھر کی دولت میں سے ہی تو جاتا۔ اب لڑکی اپنی خواہش سے جو اچھا لگا کر رہی تھی۔ کوئی بچہ تو ہے نہیں، بالغ ہے۔ یوں ہی سوٹ کیس لے کر چل دے۔ اُس سے تو یہی اچھا ہے۔

دوسرے دن منجھلی بہو نے اعلان کر دیا۔ 'بیاہ کیا ہو رہا ہے، بیاہ تو ہو ہی چکا ہے۔ بس لوگوں سے کہہ دینا باقی ہے۔ مرد کوٹھی میں آ کر اس کے ساتھ رہ گیا ہے۔ مسوری میں ساتھ سیریں ہوتی رہیں۔ یہاں تو یہ چلن تھا کہ چھاج چھلنی کو ڈھکے اور چھلنی چھاج کا پردہ کرے۔ ہم لوگ تو پردیس میں بیٹھ کر کما کما کر بھیجنے کے لیے ہیں۔ بھیا نے گھر میں ڈال رکھی تھی۔ بہن نے بھی ٹھہرا رکھا تھا۔ ہم لوگ نہ آتے تو چلتا ہی رہتا۔ بیاہ تو ہو چکا ہے۔'

طے ہو گیا کہ ایسے رشتہ داروں اور جاننے والوں کو دعوت دینے سے کیا فائدہ جو آ کر برا بھلا کہیں گے۔ منورما کے تار کے جواب میں ستلی والا نے تاریخ لکھ بھیجی تھی۔ صرف دو ہفتوں کا وقت درمیان میں تھا۔ بھائیوں، بھابیوں کی خواہش تھی کہ وہ اس موقع سے پہلے ہی چلے جائیں۔ سب لوگ پوچھیں گے لڑکی کو کیا دیا گیا لیکن جائداد اور کاروبار کے بٹوارے کا سوال بھی تھا۔ اسے نظر انداز کر دینا ان لوگوں کے لیے ممکن نہ تھا۔

مسٹر ستلی والا مقررہ تاریخ پر اپنے دو دوستوں کے ساتھ آ گیا۔ مجسٹریٹ کو کوٹھی پر بلا لیا گیا۔ پندرہ منٹ اور پندرہ روپے میں لکھ پتی کی بیٹی کا بیاہ ہو گیا۔ ایک معزز ہندو کے لیے اس سے بڑی بے عزتی کیا ہو سکتی تھی۔

منورما کی رخصتی کے وقت بھابیوں اور بھائیوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ جہیز کچھ نہیں تھا۔ صرف منورما کے لیے سامان کے آٹھ بکس تھے۔ بکسوں کو اسٹیشن پر بھیج کر بک کرا دیا گیا۔ پانچ بکسوں میں منورما کے کپڑے اور تین میں اس کی کتابیں تھیں۔

چلتے وقت پتا جی نے گیارہ ہزار کا ایک چیک اور بھائیوں کے گیارہ گیارہ سو کے چیک اسے تھما دیے۔ یہی جہیز تھا۔ منورما نے چیکوں کو دیکھے بغیر انھیں لے کر بٹوے میں ڈال لیا۔ وہ چپ چاپ اور اداس تھی لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اندر جا کر ماں جی سے ملی۔ اور بھوپی، دیپا اور ننھے بچے کمل کو چوم لیا۔ بھابیوں، بھائیوں کی آنسو بھری آنکھوں سے اس نے آنکھیں ملائیں۔

ستلی والا بمبئی میل کے چھوٹنے تک اپنے نئے رشتہ داروں کے ساتھ پلیٹ فارم پر ہی کھڑا رہا۔ وہ عجز و انکسار کا مجسمہ تھا۔ اس نے اتنے ذی عزت گھرانے سے اپنا رشتہ ہونے کے لیے بار بار احسان مندی کا اظہار کیا۔ ان کی لڑکی کے لیے عزت و احترام کا یقین دلایا۔ ہر رشتہ دار کو بمبئی آنے کی دعوت دی۔ اس کا گورا رنگ، سڈول جسم اور انکسار کو دیکھ کر

سب کو اطمینان تھا۔ لڑکی کو بر بڑا نہیں ملا۔

منورما گاڑی کے اندر چپ بیٹھی تھی۔ گاڑی کے چلنے پر اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو نمستے کہا۔

ستلی والا کے دونوں دوستوں نے دولہا دلہن کی آسانی کے خیال سے فرسٹ کلاس کے دوسرے ڈبے میں اپنی جگہیں ریزرو کرائی تھیں۔ لیکن دوسرے مسافروں کے لیے اتنا اخلاق دکھانا ممکن نہ تھا۔

رات کے دس بجے تھے۔ گاڑی لاہور اسٹیشن کی سرحد کے پار ہوتے ہی اوپر کی برتھ کے دونوں مسافر سونے کی تیاری کرنے لگے۔ ستلی والا نے منورما کے نزدیک بیٹھ کر محبت سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر اُس کے آرام اور ضرورت کی بات پوچھی۔

مرد کے بے جھجک انداز میں چھونے سے منورما کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اُس نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔ پریم سے بیاکل ستلی والا اُس کے قدموں کے لیے ہتھیلیاں بچھائے تھا۔ منورما کا بستر ٹھیک کرنے میں، بکس سے رات کے کپڑے نکالنے میں مدد دے رہا تھا۔ ستلی والا کا ہاتھ بار بار چھو جانے سے منورما کے جسم میں میٹھی سنسنی پیدا ہو جاتی تھی۔ اُس کے سانس کی گرمی کندھوں اور گردن پر محسوس ہونے سے منورما کے جسم میں بجلی سی دوڑ جاتی۔ ستلی والا نے آگے بڑھ کر اُس کے لیے غسل خانے کا دروازہ کھول دیا۔

منورما کے پاس رات میں پہن کر سونے کے لیے انگریزی ڈھنگ کے کُرتے پاجامے اور گاؤن تھے لیکن وہ انھیں کبھی پہنتی نہ تھی۔ کبھی شروع میں شوق کیا تھا۔ ستلی والا کے ساتھ پہلے سفر میں ان کپڑوں کو پہننے لگی تو خیال آیا۔ اِن کپڑوں میں کیسی لگوں گی؟ غسل خانے کے شیشے میں ان کپڑوں میں اُسے اپنا جسم بہت پیارا لگا۔ اُس نے کنگھی سے بال ٹھیک کیے اور چہرے پر پاؤڈر کا ہاتھ بھی پھیر لیا۔ اب خوب صورت نظر آنا یقینی تھا۔ وہ غسل خانے سے نکلی تو جھجک سے گردن جھک گئی۔ ستلی والا اپنے بستر پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ منورما بستر پر لیٹ گئی۔ ستلی والا نے مسکرا کر پوچھ لیا۔ "اب روشنی کی ضرورت ہے؟"

منورما نے سر ہلا دیا۔ روشنی بجھ گئی۔

منورما کو اپنے ماتھے پر ستلی والا کے ہاتھ کی گرمی اور ہونٹوں پر اُس کے ہونٹ محسوس ہوئے اور کان میں آواز آئی "گڈ نائٹ۔"

بے خوفی اور اختیار کے ساتھ بوسہ! منورما کے اچھوتے کنوارے ہونٹوں پر تراشیدہ مونچھوں کی سنسنی پیدا کر دینے والی چبھن۔ اف کتنی تیکھی اور میٹھی سنسنی! منورما کی باہیں اُٹھنے کے لیے تڑپ کر رہ گئیں۔ پیٹھ بل کھا کر رہ گئی۔

گاڑی میں اندھیرا تھا۔ صرف غسل خانے کے دروازے پر اندر کی روشنی سے چمکتا ہوا سفید سفید گول دھبہ دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے سفر کی اِس چھوٹی سی دنیا کی رات کے لیے کھلونے کا چاند بنا دیا گیا ہو۔ منورما آنکھیں بند کیے اپنے بستر پر پڑی تھی۔ فرسٹ کلاس کے برتھ کے اسپرنگ اسے گاڑی کی چال کے ساتھ جھلا جھلا کر کہہ رہے تھے۔ "سوجا، سوجا، راج کماری سوجا۔"

گاڑی کی تیز چال درت تال سے کہہ رہی تھی۔ 'سوجا سوجا، سوجا سوجا، سوجا سوجا۔'

منورما سو نہیں رہی تھی۔ سونا چاہتی بھی نہ تھی، لیکن نہ جانے وہ کب سو گئی۔

منورما کی نیند کھلی۔ تیزی سے چلتے ہوئے بستر میں نیند ٹوٹنے کا تجربہ... شادی شدہ زندگی کی پہلی صبح۔ اس نے سنلی والا کے برتھ کی طرف شرم بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ گورے گورے ماتھے پر نرم لٹیں لہرا رہی تھیں۔ کتنا خوب صورت دکھائی دے رہا تھا وہ۔ وہ اُس کا تھا۔ منورما نے گہرے سکون کی انگڑائی کا سکھ محسوس کیا۔ اوپر کے مسافر گہری نیند میں سوئے تھے۔ منورما نے سوچا۔ دوسرے لوگوں کے اُٹھنے سے پہلے کپڑے بدل لے۔ وہ پھرتی سے اُچھل کر بستر سے اُٹھی۔ ضروری سامان اور کپڑے لے کر غسل خانے میں چلی گئی۔ کیا پہنے۔ یہ طے کرنے میں کافی دیر لگی۔ بالوں کو جلدی سے سنوارنے میں بھی کافی وقت لگا۔

منورما تیار ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ سنلی والا کی آنکھیں کھلیں۔ اُس کی گڈ مارننگ کی مسکراہٹ کتنی میٹھی تھی۔ منورما چاہتی تھی پتی کے لیے ضروری سامان نکالنے میں مدد دے۔ لیکن اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ پتی کے بکس میں کیا کہاں رکھا تھا۔ اس نے ایسا کام کبھی کیا نہ تھا۔ کسی بیمار کے سوا اس نے کسی کی خدمت کبھی نہیں کی تھی۔

ریل گاڑی میں دوسری جنگ کے وقت کی بھیڑ تھی۔ فرسٹ کلاس میں بھی سوناپن اور تنہائی کا ملنا ممکن نہ تھا۔ منورما چاہتی تھی۔ ان دونوں کے سوا گاڑی میں اور کوئی نہ ہوتا۔ یہ لمبا سفر کب ختم ہوگا؟ کب بمبئی پہنچیں گے؟

سنلی والا اُس کے نزدیک بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ "تم سے ملنے کے پہلے ہی موقع پر دل نے کہہ دیا تھا، بیاہ میرا ہوگا تو تمھیں سے۔"

گُستلی والا منورما کو لاہور کی پہلی ملاقات کی باتیں یاد دلانے لگا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ "تمہارے خاندان کے لوگوں کو پُرانی روایتوں اور سنسکار میں عقیدہ اور اُس کی عادت ہونے کی وجہ سے ابھی ہمارے بیاہ سے اطمینان نہیں ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ اُن کا سلوک بدل جائے گا اور وہ لوگ ہماری مدد کرسکیں گے۔"

بات چیت انگریزی میں ہو رہی تھی۔ منورما نے جواب دیا۔ "اس بات کو جانے دیجیے۔" اور اپنا بٹوہ کھول کر قلم اور چار دن چک نکال لیے۔ چکوں کو پیچھے۔ حیدر جی ستلی والا کو ادا کیا جائے، لکھ کر اپنے دستخط کر دیے۔

منورما نے چاروں چک گُستلی والا کے ہاتھ میں دے دیے۔ گُستلی والا نے مسکرا کر کہا۔ "اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"سب کچھ تمہارا ہی ہے۔" منورما نے جواب دیا۔

گُستلی والا نے منورما کو بتایا کہ اس کے خاندان کے لوگ بھڑوچ میں ہیں۔ بمبئی میں کاروبار کے سلسلے میں وہ اکیلا ہی رہتا ہے۔ گھر میں کام کاج کے لیے ایک نوکر ہے۔ اُس نے سمجھایا۔ بمبئی نئی روشنی کا شہر ہے۔ وہاں عام لوگ تنگ جگہ میں گزارا کرتے ہیں۔ بمبئی میں منورما کی لاہور کی کوٹھی کی طرح آٹھ دس کمرے لے کر رہنا ممکن نہیں۔ وہ مالا بار ہل پر ایک چھوٹے سے بنگلے کی اوپر کی منزل میں رہتا تھا۔ اُس کے پاس تین کمرے تھے۔ اتنے ہی کا سو روپے دیتا تھا۔

منورما کو تین کمرے کم نہیں معلوم ہوئے۔ چھوٹی جگہ کو سجا کر اور سنبھال کر رکھ سکے گی۔ خاندان کے دوسرے لوگ نہیں ہیں تو کیا؟ وہ دونوں اپنے پریم نواس میں اپنی خواہش کے مطابق بے جھجک اور آزاد رہ سکیں گے۔

ستلی والا منورما کو اپنے فلیٹ میں پہنچا کر خود تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا گیا۔ برآمدے سے لامحدود سمندر گہرائیوں سے جھل مِل کر رہا تھا۔ بادلوں کے سرخی مائل ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے اور ان کے اندر دہا ہوا آگ کی گیند جیسا تیزی سے چکراتا ہوا سورج سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ فلیٹ کے کمرے میں گلابی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے نئے گھر میں پہلی رات آ رہی تھی۔ باورچی خانے میں باورچی اُس کے حکم کے مطابق کھانا پکا رہا تھا۔ وہ تینوں کمروں کو اچھی طرح سجا چکی تھی۔ ہر ایک کمرے میں کئی کئی بار

ہوا آئی تھی۔ سونے کے کمرے کو سجانے میں اس کا سارا بدن شرم سے لہک لہک اٹھتا تھا۔ کمرے میں دو بڑے بڑے پلنگ تھے۔

صبح اُٹھتے وقت منورما بے خوابی کی تھکن، جھلاہٹ بھرا جمود اور گہری اُداسی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے اس کی پاک دامنی پر بلا وجہ ہی داغ لگ گیا ہو۔ ستلی والا نے شرماتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ "کچھ دنوں سے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں دوا استعمال کروں گا۔"

منورما کو ستلی والا کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کے خیالات بار بار بدلتے رہے اور اُٹھ کر بال سنوار لینے کی بھی خواہش نہیں ہوئی۔

ستلی والا کا برتاؤ انکساری اور مسکینی کا تھا۔ منورما اچھا برتاؤ نہ کر سکنے پر شرم اور تکلیف میں سوچتی، ایسی کیا بات ہے، بار بار وہ بات دہرانے کی کیا ضرورت ہے؟ اُس نے سوچا۔ گھر کے کام میں جی لگائے۔ لیکن کرنے کے لیے کیا تھا؟ نوکر سب کچھ کرتا تھا۔ کر ہی رہا تھا۔ وہ کوئی اخبار یا کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔

ستلی والا صبح ناشتہ کر کے چلا جاتا تھا۔ ڈیڑھ بجے کھانا کھانے کو آتا۔ کبھی نہیں بھی آپاتا۔ منورما کا دل پڑھنے میں نہ لگتا۔ دن میں سونے کی عادت نہ تھی۔ ستلی والا شام کے وقت اپنے کام سے واپس آکر چائے پینے کے بعد منورما کو گاڑی پر گھمانے لے جاتا۔ کرکٹ کلب میں یا سینما یا ڈانس میں بھی لے جاتا تھا۔ کبھی کھانا بھی باہر ہی ہو جاتا۔ وہ آدھی رات تک واپس آتے۔

منورما کے پاس پڑھنے کے لیے وقت بہت تھا۔ لیکن اُس کا جی نہ لگتا تھا۔ نئی جگہ میں جان پہچان نہ ہونے کی وجہ سے کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔ ستلی والا نے اُسے رائے دی۔ "شاپنگ کر آیا کرو۔" منورما سوچتی، ضرورت کس چیز کی ہے؟ اُسے وقت کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ سوچتی۔ کنوارپن کی زندگی میں کون سی کمی تھی جو اب پوری ہو رہی ہے؟ ستلی والا نے اس سے بیاہ کی تجویز کیوں رکھی؟ دوسری لڑکیاں بیاہ کے بعد کیسی ہنس مکھ، بھری بھری اور گدگدائی سی معلوم ہوتی ہیں ــــ جیسے کوئی راز ان کے ہونٹوں پر آکر کھُل جانا چاہتا ہو۔ لیکن وہ صرف ٹھگی جانے کی چبھن محسوس کر رہی تھی۔ کنواری ہونے سے وہ قابلِ رحم کیوں تھی۔ کیوں .... کیسے .....؟ منورما نے سوچا۔ پتی کے کاموں میں کچھ حصّہ لے۔

ستلی والا نے ہنس کر سمجھایا۔ "میرا کام ایسا ہے کہ میں ہی کر سکتا ہوں۔ کسی روپے والے کو یہ سمجھانا کہ فلاں کام میں پونجی لگا دو، دوسرے کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔ آدمی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کا

طور طریقہ دیکھنا ہوتا ہے۔ کل جس آدمی کو کلب میں ساتھ لے گیا تھا۔ اُس آدمی کو میں ایک فلم میں دو لاکھ روپے لگانے پر آمادہ کر رہا ہوں۔ اب تک میں دوسروں کی فلمیں بیچتا رہا ہوں۔ اب میں خود فلم بنا کر بیچنا چاہتا ہوں۔ پونجی ان لوگوں کی ہوگی اور عقل میری ....،،

ستلی والا محسوس کر رہا تھا، ریل میں سفر کرتے وقت منورما اس کے قریب سمٹ آنے کے لیے بے قرار تھی۔ لیکن اب اُس میں بے حسی آ گئی تھی۔ وجہ وہ سمجھتا تھا۔ پنجاب کی آب و ہوا اور مختلف آب و ہوا میں پلی ہوئی لڑکی اُس کے مقابلے میں کہیں زیادہ صحت مند تھی۔ وہ جوانی کی بھرپور اور محفوظ طاقت لے کر گرہستی میں داخل ہوئی تھی۔ ستلی والا گرہستی بسائے بغیر گرہستی کی لذتیں اُٹھانے کی کوشش میں جسمانی طور سے بے حس ہو کر صرف ہوس اور شوق کے لیے رہ گیا تھا۔ بیاہ بڑھاپے کی بڑھتی چلی آتی شام کے لیے گھر بسانے کا منصوبہ تھا۔

ستلی والا منورما کو ہر قسم کی صحبت میں لے جانا چاہتا تھا۔ نوجوانوں اور نوجوان لڑکیوں سے ملاتا تھا۔ وہ منورما کا دل بہلانے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ لیکن منورما جیسے ماحول کی عادی تھی وہ اسے نہیں ملتا تھا۔ پارٹیوں اور کلبوں، شہروں اور گھوڑ دوڑ کی باتیں ہوتی تھیں۔ عورتوں کی مجلسوں میں جن لوگوں اور جن مسئلوں کا ذکر چھڑتا تھا، انھیں بھی نہیں جانتی تھی۔

ستلی والا اپنی پہلی رات کی کمزوری کی وجہ سے منورما کے سامنے شرمندگی محسوس کرتا رہتا تھا۔ منورما کو بہلانے کی کوششوں کا کوئی قابل اطمینان نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ بیاہ کے بعد تیسرا ہفتہ بیت رہا تھا۔ شام کے وقت وہ منورما کو سینما لے گیا۔ اس کے بعد ناچ میں لے گیا۔ اُس شام ستلی والا مسرور اور سراپا اخلاق بنا ہوا تھا۔ گھر آ کر منورما کپڑے بدل کر سو جانا چاہتی تھی۔

منورما کو اپنے پلنگ پر لیٹ جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر سُتلی والا ہچکچاتے ہوئے بولا "اُس دن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اُس بات کو بھول جاؤ۔" وہ اُس کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ منورما کے دل کو چوٹ لگی۔ وہ برآمدے میں آ بیٹھی۔

سُتلی والا نے اپنی توہین محسوس کی لیکن اُس نے منورما کو سمجھانا چاہا۔ منورما رونے لگی۔ اُسے سمجھانے میں ناکام ہو کر سُتلی والا چپ چاپ لیٹ گیا۔ منورما کا برتاؤ اُسے ناقابلِ برداشت توہین معلوم ہوئی۔ کچھ کڑوی بات کہہ بیٹھا۔ دماغ میں پتنی کے توہین آمیز سلوک کی جلن اور جسم میں دوا سے پیدا شدہ جوش اُسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے کافی دیر کے بعد سو سکا۔ صبح اُٹھ کر منورما سے بولا نہیں۔ سات ہی بجے تیار ہو کر نوکر کو بلایا اور کہہ دیا "میم صاحب سے بول دینا، ہمیں

ضروری کام ہے۔ ناشتہ دفتر میں کریں گے۔ شام کو آئیں گے۔"

منورما بہت سست اور اُداس تھی۔ بیاہ کر کے اُس نے کیا پایا .... ؟ کتنی بڑی بھول۔ کتنا بڑا دھوکا ..... اُس نے صرف چائے پی لی۔ کھایا کچھ نہیں۔ نہا دھو کر کپڑے بدلنے کا بھی خیال نہ آیا۔ گھر میں بیٹھے رہنا بھی بُرا معلوم ہو رہا تھا۔ گھر ایسا پنجرا معلوم ہوتا تھا جو اسے دبوچ رہا ہو۔ اُٹھی۔ کپڑے بدلے اور سڑک پر جا کر سمندر کی طرف چلی گئی۔ مالا بار ہل پر امیر لوگوں کے بنگلوں اور کوٹھیوں سے امیر لوگوں کے بچے اسکول جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ خوب صاف ستھرے اور خوش۔ انھیں دیکھ کر خیال آیا۔ یہ ہے گرہست زندگی۔ مگر میں نے جس گرہستی میں قدم رکھا ہے وہ صرف دھوکا ہے۔

منورما سمندر کے کنارے کینڈی بیچ پر پہنچ گئی۔ کچھ بوڑھے سمندر کے کنارے جاڑے کی دھوپ میں پچھم سے آتی صحت بخش ہوا کا لطف لے رہے تھے۔ وہ بھی سمندر کے کنارے بیٹھ گئی، اور سوچنے لگی۔ کیا کرے ؟ گرہست زندگی کی خوشی تو اس کے لیے تھی نہیں۔ بے کار ہی اُلجھن میں پھنس گئی۔ کالج میں پڑھانے کا کام کر لیتی تو اچھا تھا۔ لاہور میں اخبار میں کچھ دن کام کیا تھا۔ کتنا اچھا معلوم ہوا تھا۔ پندرہ روپے ماہوار کا کام۔ بھوشن بات روکھی کرتے ہیں، لیکن اُن کے دل میں لوگوں کے لیے عزّت اور بھروسے کا جذبہ ہے۔ ان کے ساتھ دھول اور دھوپ میں پیدل گھومنے اور لڑائی جھگڑے میں بھی توہین اور بُرائی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ نزدیک آتے آتے ہم لوگ اِس لیے دور ہٹ گئے کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دینا چاہتے تھے۔

منورما دھوپ میں جھلملاتے نیلے سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی سوچ رہی تھی۔ بھوشن کو اپنی محنت، عمل اور قوتِ برداشت کا غرور ہے۔ وہ ایک مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے سمجھا میں صرف پیسہ چاہتی ہوں۔ کوٹھی، کپڑے اور موٹریں! ان کے پاس یہ چیزیں ہوتیں تو کیا انھیں میں اُلجھ جاتے ؟ دوسروں کو ایسا کیوں سمجھتے ہیں ؟ انھوں نے مجھے کتنے دھکّے دیے۔ کتنی بار میری توہین کی۔ اُس دن دھرم شالہ میں سوما کی بات لے کر..... لیکن ان کے روکھے پن میں، دھکار دینے میں بھی ایمان داری تھی۔ بھوشن کا گیہواں روکھا سا چہرہ، دُبلا سخت جسم منورما کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اور ستلی والا کا نُور اگورا ملائم چہرہ پلپلا سا دکھائی دینے لگا۔ اپنے جسم سے اُسے ایسی نفرت معلوم ہوئی کہ تھوک دینے کو جی چاہا۔ سوچا۔ انھیں مجھ پر یقین ہی نہیں تھا کبھی انھیں دکھا دوں گی کہ میں اِن چیزوں کو لات مار سکتی ہوں۔

منورما کو یاد آیا۔ بھوشن بمبئی میں ہی تو ہے۔ پیپلز وار PEOPLE'S WAR اور لوک یدھ

یہیں تو چھپتے ہیں۔ کھیت واڑی مین روڈ! اسے یاد آیا۔ دونوں اخباروں کا چندہ اسی پتے پر بھیجا تھا۔ لاہور کے اخبار میں کام کرتے وقت اس دفتر سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ یاد آیا کُشّلی والا شام کو آنے کے لیے کہہ گیا تھا۔ جب بھی آئے۔ منورما نے سوچا۔ یہاں بیٹھ کر اپنا ماتم کرنے میں کیا رکھا ہے؟ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کی راہ نہیں جانتی تھی۔ سوچا ٹیکسی والے تو سارے راستے جانتے ہیں۔ شاہراہ پر آتے ہی ایک خالی ٹیکسی دکھائی دی۔ ٹیکسی اشارہ پاتے ہی نزدیک آگئی۔ گاڑی میں منورما نے بیٹھ کر کہا۔ "کھیت واڑی مین روڈ۔"

منورما نے سوچا۔ اگر اس وقت بھوشن دفتر میں نہ ہوا تو بھی کیا۔ وہ دفتر میں کام کرنے والے کئی آدمیوں کو جانتی تھی۔ وہ نام عام طور پر اخباروں میں چھپتے رہتے تھے۔ خیر جگہ تو دیکھ آئے!

ٹیکسی والے نے مالابارہل سے بالکل دوسری طرح کی جگہ اور بازار میں آکر کہا۔ "یہ کھیت واڑی ہے۔ کہاں جائیے گا!" منورما نے آس پاس کی ہر چیز کو انجان دیکھ کر کہا۔ "رام بھون، کمیونسٹ پارٹی۔"

"لال باوٹا؟" مراٹھا ٹیکسی والے نے پوچھا اور کچھ آگے بڑھ کر ایک بڑے سفید مکان کے سامنے فٹ پاتھ کے ساتھ ٹیکسی کھڑی کردی۔ مکان کی ڈیوڑھی میں چکر والا چوڑا زینہ تھا۔ زینے کے نزدیک ایک نوجوان اسٹول پر بیٹھا تھا۔ لوگ آجا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ منورما نے نوجوان سے پوچھا۔ "آفس کدھر ہے؟"

"آپ کس کو ملیں گی؟" نوجوان نے پوچھا۔

"کامریڈ بھوشن سے۔"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"اخبار میں"۔

"کس اخبار میں، کس ڈیپارٹ میں ہیں....؟" نوجوان نے ڈوری سے لٹکے کاغذوں سے ایک پرزہ پھاڑ کر منورما کو دے دیا۔ "لکھ دیجیے۔"

منورما کو حیرت ہوئی۔ کیا اتنا بڑا دفتر ہے کہ بھوشن کو بھی سب لوگ نہیں جانتے؟ وہ نہیں جانتی تھی کہ بھوشن کیا خاص کام کرتا تھا۔ کچھ سوچ کر اُس نے پرزے پر انگریزی میں لکھا۔ "لاہور کے کامریڈ بھوشن کو ملنا چاہتی ہوں۔ منورما۔"

اسٹول پر بیٹھے نوجوان نے نزدیک ہی کاغذ کے بنڈل باندھتے دوسرے نوجوان کو پکار کر مراٹھی میں کچھ سمجھایا۔ منورما اپنا بٹوا باہوں میں دبائے انتظار میں کھڑی رہی۔

نوجوان نے اسٹول سے اُٹھ کر کچھ جھجکتے ہوئے منورما سے کہا۔ "آپ یہاں بیٹھئے، اُوپر آدمی بھیجا ہے۔"
"شکریہ! آپ بیٹھئے، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔" منورما نے جواب دیا۔ اوپر سے کئی آدمی آئے اور کئی اوپر چلے گئے۔ نوجوان نے صرف دو کو ٹوکا۔ آنے جانے والے عام طور پر کامریڈ لوگ ہی تھے۔ لیکن لاہور کے کامریڈوں کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرے۔ منورما انتظار میں سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی کہ پہچانی ہوئی آواز کان میں آئی۔ "ہلو کامریڈ!" بھوشن کی آواز تھی۔ بھوشن مسکراتا ہوا زینے سے اُتر رہا تھا۔ قلم اب بھی اُس کی انگلیوں میں تھا۔ "کب آئیں؟" بھوشن نے حیرت سے پوچھا۔

منورما نے مُسکرانے کی کوشش کی۔

"تم فون کر دیتیں۔ کب آئیں؟ کیسے آئیں؟ گھر کے اور لوگ بھی آئے ہیں؟ جگدیش ہیں؟ بھوشن نے پوچھا۔

"آپ کیسے ہیں؟" منورما نے مسکرا کر پوچھا۔

بھوشن کچھ تھکا ہوا اور کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ منورما نے رشک محسوس کیا۔ اسے کام کرنے کا کتنا موقع ہے۔

"آؤ اوپر آؤ۔" بھوشن منورما کو اپنے ساتھ اوپر لے گیا۔ ایک منزل، دوسری منزل، تیسری منزل۔ زینے سے سب کمروں میں، میزوں پر کام کرتے آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ ٹائپ رائٹر کھٹ کھٹا رہے تھے۔

بھوشن نے کہا۔ "آؤ ہمارے کمرے میں چلو۔" پھر سوچ کر بولا۔ "اچھا کامن روم میں آؤ۔"

اچھا بڑا کمرہ۔ دیوار پر، سفید کپڑے پر بنا ہوا ہنسیا ہتھوڑے کا لال نشان۔ مارکس اور لینن کی تصویریں۔ ایک کونے میں خوب بڑا ریڈیو آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اُس کے پاس بیٹھا ایک آدمی قلم اور کاغذ لیے نوٹ لے رہا تھا۔ دوسری طرف بیٹھا نوجوان اخبار دیکھ رہا تھا۔ بھوشن اور منورما کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا۔ بھوشن نے منورما کو ایک آرام کرسی پر بٹھا دیا اور اپنا سوال دُہرایا۔ "کب آئیں؟"

"مہینہ ہو رہا ہے۔"

"ہیں! ملیں نہیں؟"

"ملنے ہی تو آئی ہوں۔"

"ایک مہینہ بعد۔ فون بھی نہیں کیا۔ بہت مصروف تھیں؟ کہاں ٹھہری ہو؟"

"مالا بار ہل۔"

"پتہ بتاؤ۔ میں آؤں گا۔"

"نیپیئر روڈ پر لقمان جی اسٹریٹ۔ ۱۵ نمبر کی بلڈنگ میں، اُوپر کا فلیٹ۔"

"یہ نہیں بتایا کیسے آئیں؟"

"یہاں کیا بہت سے دفتر ہیں؟" منورما نے بات بدلی۔"آپ کا پانا تو مشکل ہوگیا تھا۔"

"ہاں آؤ تمہیں دکھاؤں۔" بھوشن خوشی سے بولا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسی وقت ایک لڑکی ایک فائل ہاتھ میں لیے آئی۔ وہ فائل اُس نے بھوشن کی پیٹھ پر پھینک دی۔"یہ لو۔" لڑکی نے انگریزی میں کہا۔"خود تو گپ لڑا رہے ہو۔ جانتے ہو۔ کل رات آٹھ بجے مشین پر بیٹھی تھی، اب اٹھی ہوں۔ ایک ساتھ ۱۷۶ صفحے! دو دن پہلے دے دیتے تو کیا تھا؟

بھوشن نے اسے جواب دیا۔"تم سچ مچ بھوتنی ہو! جانتی ہو مجھے لکھنے میں چار دن اور راتیں لگی تھیں۔ ابھی ایک بجے مجھے یہ رپورٹ پی۔ بی کو دینا ہے۔"

منورما اس نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سانولا رنگ، چہرے پر تھکاوٹ کا روکھا پن، بڑی بڑی آنکھوں میں بے خوابی کے لال ڈورے۔ گھنگھریالے روکھے بال اُلجھے ہوئے۔ اُسے فکر نہیں تھی کہ اُس کا آنچل کہاں گر رہا تھا۔ لڑکی نے منورما کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

بھوشن نے تعارف کرایا۔"یہ ہماری لاہور کی کامریڈ منورما ہیں۔ یہ مدراس سمندر کنارے کی مچھلی پارو۔"

پارو نے بند مٹھی اُٹھا کر منورما کی طرف دیکھ کر خوشی سے مسکرا دیا۔ منورما نے بھی لال سلام سے جواب دیا۔

بھوشن نے کہا۔"پارو۔ دیکھا ہمارے پنجاب کی لڑکیاں کتنی خوب صورت ہوتی ہیں۔؟"

"ہوں۔" منورما نے پارو کی طرف دیکھ کر بھوشن سے سوال کیا۔"پندرہ گھنٹے لگاتار ٹائپ کر لیتی ہیں؟"

"پندرہ بس! وہ کریں گی تیس گھنٹے تک۔" بھوشن نے جواب دیا۔

"میں بہتّر گھنٹے کروں گی۔ جانتے ہو میں استا خنو وائٹ ہوں۔ اچھا کامریڈ! پارو نے مسکرا کر منورما سے کہا۔"آپ دور سے آئی ہیں۔ اپنے ہم وطن دوست سے بات کیجیے۔" وہ چلی گئی۔

بھوشن منورما کو برآمدے میں لاکر دکھانے لگا۔ یہ 'پیپلز وار' کے کمرے ہیں۔ یہ مراٹھی 'لوک یدھ'، وہ "قومی جنگ" گجراتی 'لوک یدھ'، کا کمرہ نیچے ہے۔ آرگنائزیشن کے دفتر اوپر ہیں۔ ہمارا ریسرچ بیورو بھی اوپر ہے۔ وہ فوٹو ڈیپارٹمنٹ ہے۔ وہ کمرہ سکریٹری کا ہے۔ اِدھر دوسرے کامریڈوں کے کمرے ہیں جن کا یہاں سدا رہنا ضروری ہے۔ جو لوگ شادی شدہ ہیں اور جن کی پتنیاں بھی کام کرتی ہیں، انھیں ایک ایک کمرہ دیا گیا ہے۔ باقی لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ نزدیک ہی "ریڈ فلیگ ہال" میں رہتے ہیں۔ کچھ ساتھی اندھیری میں رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ انتظام کرلیا ہے۔"

پکار سُنائی دی۔ "کامریڈ بھوشن! تمہیں کامریڈ بی۔ ٹی بُلا رہے ہیں۔"

بھوشن نے معذرت کی۔ "ذرا بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ آج پی۔ بی کی میٹنگ میں یہ رپورٹ پیش ہوگی۔ شاید اسی لیے بلایا ہے۔ میں اسے دے کر آتا ہوں۔ تم اخبار دیکھو۔ ابھی آتا ہوں۔"

ریڈیو کے پاس بیٹھا ہوا آدمی اپنے کاغذ سمیٹ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بھوشن نے اُس سے پوچھا۔ "کوئی خاص خبر؟"

"چلتا ہے کچھ خاص نہیں۔"

منورما اخبار اُلٹنے پلٹنے لگی۔ پارٹی آفس کا ماحول اُسے جان دار اور مطمئن معلوم ہو رہا تھا۔ بغیر کپڑا بچھی میزوں پر کام کرتے لوگ اپنی خواہش سے، خوشی اور تن دہی سے کام کرتے جان پڑتے تھے۔ بھوشن کو گئے دس منٹ ہو گئے تھے۔ پھر گھڑی دیکھی۔ پندرہ منٹ ہو گئے۔ منورما اپنے دل سے اُٹھتی گہری سانس کو دبا کر سوچ رہی تھی۔ اگر لاہور کے اخبار میں کام کرتے کرتے یہاں آجاتی؟ یہاں لوگ کتنے خوش ہیں۔ پارو کتنی مطمئن اور پُرجوش ہے۔ دوسرے کمروں میں کام کرتی لڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ خیال آیا۔ اگر بھوشن نے اِس کا ساتھ دیا ہوتا!........ لیکن یہ بات وہ منھ سے کیسے کہتی؟

منورما نے پھر گھڑی دیکھی۔ بیس منٹ ہو گئے تھے۔ اُس نے سوچا۔ اِن لوگوں کو فرصت کہاں۔ بس چلوں...... آجائیں تو کہہ کر جاؤں...... یہاں آکر کچھ کام کرنے لگوں ...... شام کے وقت واپس چلی جایا کروں گی۔ ہم لوگ کتنے الگ الگ معلوم ہوں گے۔

شام سُتلی والا کے ساتھ کلب، پارٹی، ہوٹل، شراب، برج، ریس کی بات چیت، جگ مگ

ساڑیاں اور سخت میک اپ۔ یہاں دن گزارنے کے بعد ویسی شام کیسی لگے گی۔ کیسا میل ہوگا۔ سُتلی والا شکایت کرے گا۔ مگر اُس کا اور میرا میل ہے کیا..... میل کی بات سوچ کر اُس کے دل میں نفرت بھر گئی۔

بھوشن چالیس منٹ کے بعد آیا۔ اور بہت معافی مانگنے لگا۔ ہندوستان بھر کے یونٹس کی رپورٹ ہے.....،،

بھوشن نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔" بارہ پینتالیس۔ تمہارے کھانے کا کیا ہوگا؟ آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ ہمارے کمپوں میں جتنے کم خرچ پر جیسا اچھا کھانا ملتا ہے، بمبئی میں کہیں نہیں ملے گا۔ تم کھا کر دیکھو۔ پنجابی کھانے سے مختلف ہے، لیکن تمہیں اچھا لگے گا۔ ٹھہرو میں مائی کو کہہ دوں۔ نہیں تو وہ ڈانٹے گی۔ ایک منٹ!،،

بھوشن پھر چلا گیا۔ منورما پھر مارکس کی داڑھی کی طرف نظر کیے اپنی بات سوچنے لگی۔ بھوشن لوٹ آیا۔"دس منٹ میں گھنٹی بجے گی۔،، اُس نے جوش کے ساتھ کہا۔" اگر کامریڈ جوشی کھانے کے لیے آئے تو تم سے تعارف ہوسکے گا۔ لیکن وہ کمرے سے شاید ہی نکلیں۔ ان کے لیے کھانا وہیں بھیج دیا جاتا ہے۔ باقی سب لوگ ڈائننگ ہال میں آتے ہیں۔،،

گھنٹی بجی۔ بھوشن منورما کو ڈائننگ ہال میں لے گیا۔ بڑا سا کمرہ۔ لال فرش پر ٹاٹ کی پٹیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف المونیم کی طشتریاں، کٹورے، مگ اور گلاس ٹھٹھیرے کی دوکان کی طرح سجے ہوئے تھے۔ سب لوگ ایک ایک طشتری، کٹورا اور گلاس یا مگ لے کر بیٹھتے جا رہے تھے۔ آپس میں بات چیت، ہنسی مذاق کا شور تھا۔ جیسے آدھی چھٹی میں طالب علم آزاد ہو رہے ہوں۔ سب جگہیں بھر گئیں۔ ابھی بہت سے لوگ باقی تھے۔ مائی (ادھیڑ عمر کی عورت) مینیجر کی طرح کھڑی تھی۔ مائی نے کہا۔" اب باقی ساتھی دوسری بار! تیس چالیس جوانوں میں چھ سات جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ لیکن کوئی ہچکچاہٹ یا پریشانی نہیں تھی۔

بھوشن اور منورما جوشی کے انتظار میں جگہ پانے سے رہ گئے تھے۔ پارو جلدی جلدی آئی اور بھوشن کو دیکھ کر بولی۔" ساتھی مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔،، بھوشن نے کہہ دیا۔" یو مسڈ دی بس (گاڑی نکل گئی) اب اندر جاؤ گی تو مائی مارے گی۔،،

پارو نے کمرے جھانکا اور منہ بنا کر جواب دیا۔" تمہیں بھی تو جگہ نہیں ملی؟،،

" تو پھر ایک ہی ساتھ چلیں گے۔،،

"تمہارے ساتھ تو کبھی نہیں۔ چاہے دس بار جھگڑنا پڑے۔"

"مجھے ابھی جلدی نہیں ہے۔ دیکھا جائے گا۔" بھوشن نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھ لینا۔" پارو نے انگوٹھا دکھا دیا۔

مذاق سے منورما کا مرجھایا دل بھی مسکرا اُٹھا۔

پارو نے منورما کو مخاطب کرکے بھوشن کی طرف اشارہ کیا۔ "کامریڈ! یہ آدمی بہت پریشان کرتا ہے۔ ایک تو اس کی لکھاوٹ ایسی ہے کہ پوچھو نہیں۔ پھر کانگرس، کانفرنس، کمیٹی، کمپنی کی جگہ صرف 'ک' لکھ دے گا۔ ٹائپ کریں کہ اس کے معنی نکالیں۔ رپورٹ لکھتا ہے کہ مہابھارت لکھتا ہے۔ ایک غلطی ہو جائے تو سب کا سب دوبارہ ٹائپ کراتا ہے۔ جوشی کا بولنا اور اس کا لکھنا ایک جیسا۔ یہ لوگ تو اشارے کرتے ہیں۔ ارے جوشی آ رہے ہیں۔"

بھوشن اور منورما نے گھوم کر دیکھا۔ چھوٹا سا قد۔ کھدّر کے ڈھیلے ڈھالے خاکی نیکر قمیض پہنے اور موٹے شیشے کے چشمے میں چمکتی آنکھیں۔ چہرے پر دو دن کا شیو۔ منورما کو اپنی اُداسی میں بھی اس شخص کو دیکھنے کی تڑپ تھی، جو ملک بھر کی پارٹی کی روح بنا ہوا تھا۔

بھوشن کو دیکھ کر جوشی نے کچھ کہا۔ منورما سمجھ نہیں پائی۔

بھوشن نے جواب دیا۔ "میں نے سب پورا کر کے دے دیا ہے۔"

بھوشن نے منورما کا تعارف کرایا۔ "یہ کامریڈ منورما ہیں۔ ہمارے لاہور کے اخبار میں انھوں نے کافی کام کیا ہے۔"

"اب کیوں نہیں کرتیں؟" جوشی نے مسکرا کر پوچھا۔

"بمبئی کب آئیں؟" جوشی اس کی طرف مخاطب ہوا۔

"لگ بھگ مہینہ ہوا۔" منورما نے جواب دیا۔

"یہاں آپ کیا کرتی ہیں؟" جوشی نے پھر سوال دُہرایا۔

"پتی کے ساتھ آئی ہوں۔" ہونٹ دبا کر مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیا؟" بھوشن کی آنکھیں تعجب سے چمک اٹھیں۔ "کب؟"

"مہینہ بھر ہوا۔" منورما نے جوشی کو جواب دیا۔

"تم تو نئی دلہن نظر نہیں آتیں۔" جوشی منورما کی پیٹھ پر بزرگ کی طرح ہاتھ رکھ کر ہنس دیا۔

"تم نے خبر نہیں دی۔" بھوشن نے شکایت کی۔

منورما مسکرانے کی کوشش میں ناکام رہی۔
جوشی نے پھر ہنس کر کہا۔ "تم نہیں جانتیں۔ پارٹی ممبروں کے بیاہ میں بھی دخل رکھتی ہے۔"

"یہ ممبر نہیں تھی۔ لیکن ممبر کے برابر ہی تھی۔" بھوشن نے صفائی دی۔
"اوہ۔" جوشی نے معذرت چاہی۔ "تو اب بمبئی میں آپ ہمارے ساتھ کام کریں گی؟ وقت پر ممبر بھی بن جائیں گی۔ کس سے شادی ہوئی آپ کی؟"
"ایچ۔ بی۔ ستلی والا۔"
"پارسی جنٹلمین۔ کون ستلی والا۔" جوشی نے بھوشن کی طرف دیکھا۔
"میں نہیں جانتا۔"

کھانے کے لیے جوشی نے منورما کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اور اُس سے لاہور کے بارے میں، لاہور کے ساتھیوں کے بارے میں اُس کی ذاتی رائے پوچھتا رہا۔ منورما کے خاندان کے لوگوں کے بارے میں بھی سوالات کیے۔ اپنے گھر کی بات چھوڑ کر دوسری بات کرنے میں منورما کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ جوشی خود اس کے اور اُس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھنے لگتا تو منورما کا ہاتھ کھانے پر رُک جاتا۔

جوشی بولا۔ "یہ کھانا تمھیں اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پنجابی ہونا۔؟"
منورما کے انکار کرنے پر بھی اُس کے سامنے دہی رکھ دیا گیا۔ کھانا بُرا نہ لگنے پر بھی وہ کھا نہیں پا رہی تھی۔ اور چھوڑ دینا مناسب نہ تھا۔ کسی طرح اُس نے نگل لیا۔
"ہم لوگ اپنے کھانے کے برتن خود دھوتے ہیں۔" جوشی نے اپنے برتن اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن مہمانوں کے لیے یہ قاعدہ نہیں ہے۔ لاؤ تمہارے برتن میں دھو دوں گا۔"
منورما شرما گئی۔ "نہیں۔ نہیں۔" اُس نے مخالفت کی۔

بھوشن نے اس کے ہاتھ سے برتن لینے کی کوشش کی۔ وہ سخت پریشانی اور ہچکچاہٹ میں برتن کو پیٹھ پیچھے کر رہی تھی۔ اُس کے پیچھے سے پاردنے برتن چھین لیے۔ اُس کے کہنے پر بھی پارد نے برتن نہیں دیے۔ جواب دیا۔ "ایک دن تمہارے گھر کھانا کھانے آؤں گی۔ تب تمہاری باری ہوگی۔"

کھانے کے بعد بھوشن منورما کو پھر کامن روم میں لے گیا۔ وہی ایک کمرہ تھا جہاں دوسرے

کے کام میں رُکاوٹ ڈالے بغیر اُسے بٹھایا جا سکتا تھا۔ منورما سوچ رہی تھی کہ اب وہ چلے۔

بھوشن نے کہا "پی۔ بی کے سامنے مجھے رپورٹ پیش کرنی ہے۔ دو گھنٹے لگیں گے۔"

"اچھا میں چلوں!" منورما بولی۔

"ضروری کام ہے؟"

"کچھ بھی نہیں،" منورما نے اُداسی سے جواب دیا۔

بھوشن نے کہا۔ "اگر ٹھہرو تو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ آج مجھے تین چار گھنٹے کی فرصت ہے۔ سنو، شادی کی مٹھائی نہیں کھلاؤگی؟"

منورما کا دل کہہ رہا تھا۔ اپنی موت کی مٹھائی۔ لیکن بھوشن کہتا گیا "تم نے ہماری لائبریری نہیں دیکھی۔ دو گھنٹے وہاں بیت گئے، تم جان بھی نہیں سکوگی۔ تم وہاں بیٹھو، پھر ساتھ چلیں گے۔"

بھوشن نے لائبریری کی لائبریرین مسز آپٹے سے منورما کا تعارف کرا دیا۔

مسز آپٹے نے پوچھا۔ "آپ کتابوں کی فہرست دیکھیں گی یا کوئی خاص کتاب کسی موضوع پر چاہیں تو میں نکال دوں!"

منورما فہرست کا رجسٹر لے کر اُلٹنے پلٹنے لگی۔ لیکن سوچتی جا رہی تھی اپنی ہی بات۔ شادی کی مٹھائی۔ اپنی موت کا جلسہ۔ مر کر بھی زندہ رہ جانا اور کیا ہوگا؟ یہاں بیٹھی ہوں۔ لیکن ستلی والا کی بیٹی ہونے کا سماجی پنجرا یہاں بھی مجھے باندھے ہوئے ہے۔ ہم میں کیا چیز ایک سی ہے؟ اُس کا دل نفرت سے بھر گیا۔

منورما سوچ رہی تھی۔ بھوشن جس اخلاق سے آج ملا ہے۔ ویسے تو کالج میں بات کرتا تھا..... کیسے پھٹ گیا تھا..... "میری قسمت تھی۔ نہیں تو میں آج وہاں ہوتی؟ پارو اُس کی دوست ہے۔ اسے پارو پر بھروسہ ہے۔ مجھ پر نہ تھا۔ فضول کہتا ہے ہمارے پنجاب کی لڑکیاں کتنی خوب صورت ہوتی ہیں۔ اُس کی نظر میں تو پارو ہی خوب صورت ہے۔ یہ جو کچھ کر رہی ہے کیا میں نہیں کر سکتی؟۔ میرا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔ میں تیس گھنٹے کام کر سکتی ہوں۔ کبھی مجھے موقع دیا؟ چوں کہ میں دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئی ہوں، اس لیے تم نے مجھے اپنا دشمن سمجھ لیا؟..... پندرہ ہزار ہی تھا، تو بھی اس سے تم تو پندرہ سال کاٹ سکتے تھے۔ اور وہاں وسکی، کلب، ریس کورس اور پیٹرول میں برس بھی نہیں لگے گا۔ یہ روپیہ برباد ہی ہوگا۔ ہونے دو! کنوئیں میں گر چکی

ہوں۔ اِس سے اب بچاؤ نہیں ہے۔ شادی کی مٹھائی۔ اگر اِس شادی کے معنی جانتے!"

تین گھنٹے پورے ہو چکے تھے۔ منورما سوچنے لگی۔ بھوشن کو ابھی شاید فرصت نہ ہو۔ وہ چلے۔ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ لکڑی کے بنچ پر بغیر کسی سہارے کے بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ کسی اخبار رسالے میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ مسز آپٹے سے کہہ کر چلی جائے۔ لیکن مسز آپٹے چشمے کے گول گول شیشے رجسٹر سے اُوپر اُٹھاتی ہی نہیں تھی۔ پھر گھنٹی بجی۔ لوگوں کے ہنسنے بولنے کی دھیمی دھیمی آوازیں آنے لگیں۔ مسز آپٹے بغیر کچھ کہے اُٹھ کر چلی گئی۔

"آپ ہی کامریڈ منورما ہیں؟" کسی نے پکارا۔

منورما نے گھوم کر دیکھا۔ "جی۔"

ایک موٹا آدمی پنجابی میں بولا۔ "آپ کے لیے چائے لایا ہوں۔" اس نے المونیم کا مگ سامنے رکھ دیا۔ "بھوشن کو کچھ دیر لگے گی۔ بس آدھ گھنٹہ۔ لاہور میں آپ کا مکان کس جگہ ہے؟ میں لاہور کئی بار گیا ہوں۔ آپ وہاں ہمارے اخبار میں کام کرتی تھیں؟ بمبئی میں کسی پنجابی کو دیکھنے سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ سنیے۔ یہاں کا پانی اچھا نہیں ہے۔ کھانے کو بھی کچھ نہیں ملتا۔ دودھ بارہ آنے سیر، وہ بھی پانی، بالکل پانی۔ ہمارے یہاں کا تو پانی بھی دودھ ہے۔ یہاں کا دودھ بھی پانی۔ بھوشن بھی سدا بیمار رہتا ہے۔ دیکھتی ہو یہاں ہاتھ ہاتھ بھر کے آدمی ہیں لیکن دماغ اچھا ہے اِن لوگوں کا۔"

پنجابی ساتھی، خوشی سے چمکتی آنکھوں سے کتنی ہی باتیں ایک ہی سانس میں پنجابی میں کہہ گیا۔ "اچھا اب چلوں۔ پھر ملیں گے ہی۔ میں یہاں اُردو اڈیشن میں کام کر رہا ہوں۔"

بھوشن آدھے گھنٹے میں آگیا۔ "کیا بتاؤں دیر ہوگئی۔ رپورٹ میں کئی باتیں رہ گئی تھیں۔ لیکن بی۔ٹی کو جانتی ہو وہ مزدور تحریک کی جنم پتری لیے بیٹھا ہے۔ اچھا، اب چلیں۔ یہاں سے بس میں میرین ڈرائیو چلیں۔ وہاں سے گھومتے ہوئے مالابار ہل چلے جائیں گے۔ تم تو پیدل خوب چل لیتی ہو۔ دھرم شالہ میں چلتی تھیں۔" بھوشن ہنس دیا۔ منورما اقرار کے طور پر چپ رہی۔

بس بھری تھی۔ وہ بھوشن کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سڑک پہچانی ہوئی تھی۔ ستلی والا کے ساتھ کئی بار کار میں اِدھر سے گزری تھی۔ بھوشن بار بار پوچھ رہا تھا۔ اچھا سناؤ۔ یہ سب کیسے ہوا؟ سب بتاؤ۔ بیرسٹر کا کیا حال ہے؟ ہاں وہ سوما! دھن سنگھ واپس آیا؟

منورما نے صرف آخری بات کا جواب دیا۔ "دھن سنگھ نہیں لوٹا۔" اور کہہ دیا کہ بس کی کھڑکھڑاہٹ

ہیں وہ کچھ سُن نہیں پا رہی ہے۔

"تمہیں بس میں بیٹھنے کی عادت نہیں ہے نا، یہاں ہو جائے گی۔" بھوشن نے کہا۔

پیدل چلتے وقت منورما نے سوما کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ مختصر طور سے سُنا دیا۔ بھوشن نے ہمدردی کے ساتھ مسکرا کر کہا۔ "اِس عورت کی زندگی بھی ایک مسئلہ ہے۔" پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "ہماری سماجی اُلجھنوں کی یہ ایک مثال ہے۔ شاید برکت اسے لے گیا ہوگا۔ لیکن اس کا کیا کرے گا؟ برکت کے لیے وہ بہت بوجھل ہوگی۔ ایک بار اونچے اُٹھ جانے کے بعد پھر نیچے کیسے بیٹھ سکے گی؟ وہ دوسری طرف گر سکتی ہے۔ لیکن پہلی راہ پر واپس نہیں آسکتی۔ ہو سکتا ہے یہیں بمبئی میں ہی ہو! بھاگنے والی کے لیے دو ہی جگہ ہے۔ بمبئی یا کلکتہ۔" بھوشن نے کہا اور پھر منورما سے پوچھا۔

"گھر کا ماحول تمہارے رہنے کے لائق نہیں رہا تھا؟"

"ہاں۔"

"ایسی حالت میں تم نے شادی کر لی؟"

منورما چپ رہی۔

"مسٹر سلی والا سے جان پہچان کہاں ہوئی؟ ..... لاہور میں رہتے تھے؟"

منورما نے سر ہلا دیا۔

"بھلا آدمی ہے۔ تم مطمئن ہو نا؟"

منورما سر جھکائے چُپ رہی۔

"تم بلا وجہ ہی ہچکچا رہی ہو۔ اِس میں شرم کی کیا بات ہے؟"

منورما سر جھکائے چپ رہی۔ بھوشن لاہور کے دوسرے لوگوں کے بارے میں پُوچھنے لگا اور منورما جواب دیتی گئی۔

بھوشن نے پوچھا۔ "تھک گئی ہو تو بس میں چلیں؟"

"نہیں۔" منورما نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

دونوں پیدل چلتے 'تین بتی' پہنچ گئے۔ منورما نے اوپر باغ میں چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہینگنگ گارڈن میں جا کر دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ سیاہی مائل نیلے سمندر پر پچھم کی طرف غروب آفتاب کے لال بادلوں کا لال سایہ پھیلا ہوا تھا۔ پیچھے کی پہاڑی سے نیچے بمبئی شہر کھلونوں کی بڑی بھاری دوکان کی طرح پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہینگنگ گارڈن

لگ بھگ خالی ہو چکا تھا۔

بھوشن نے پوچھا۔ "تم نے اپنی شادی اور اپنے پتی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا!... کیسے نبھ رہی ہے ؟"

منورما کے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے آنچل سے منھ ڈھانپ لیا۔

بھوشن بھونچکا رہ گیا۔ "مجھے بہت دُکھ ہے منّو!" اُس نے انگریزی میں کہا۔ "رہنے دو۔ میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔"

منورما کو اور بھی زور سے رونا آگیا۔ بھوشن نے تین سال بعد منّو کہہ کر اُسے پکارا تھا۔ وہ اسے مِس سرولا منورما جی پکارنے لگا تھا جو منورما کو بالکل پسند نہیں تھا۔

"گارڈن بند ہونے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب چلیں۔" بھوشن نے اُس کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا۔

منورما نے آنسو پونچھ لیے اور آنسو سے بھیگے رومال کو چھپا لیا۔ واپسی کے وقت اُس نے ہچکچاہٹ سے پوچھا۔ "تمہیں بُرا تو نہیں لگا؟"

"کیا؟"

"مجھے رونا آگیا۔" منورما نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"وہ میری غلطی تھی۔ چلو تمہارے مکان پر پہنچا دوں۔ مجھے بھی لوٹنا ہے۔"

"یار وہ راہ دیکھتی ہوگی۔" منورما نے چڑانے کے لیے کہا۔

"وہ چڑیل اپنے عاشق وینکٹ کو خط لکھ رہی ہوگی۔ دو بار ان کے بیاہ کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے لیکن وینکٹ کو چھٹی ہی نہیں ملتی۔ وہ ٹراونکور میں پھنسا ہوا ہے۔"

"کیا؟" منورما نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کمیونسٹ بھی شادی کرتے ہیں؟"

"کیوں؟" ویسے ہی بھوشن نے جواب دیا۔ "کمیونسٹ آدمی نہیں ہیں؟"

"اچھا یہ کیا پارٹی کا نیا طریقہ ہے۔"

بھوشن ہنس دیا۔ "تم مذاق کر رہی ہو۔ لیکن کمیونسٹوں کے لیے "انقلاب" کانگریسی سوراج کی جدوجہد کا ایک یا دو برس کا کام نہیں ہے کہ سوراج کے بعد ہی بیاہ کا عہد کریں۔ یا سوراج نہ ہونے تک نمک نہ کھائیں۔ جوتا نہ پہنیں۔ جدوجہد اور انقلاب کو زندگی بھر نباہنے کے لیے جہاں تک ممکن ہو زندگی کو سادہ، صحت مند اور فطری بنائے رکھنا ضروری ہے۔"

"یہ کب سے سمجھ میں آگیا؟" منورما کا لہجہ روکھا تھا۔
"سب کچھ سمجھ بوجھ کے تو کوئی پیدا نہیں ہوتا۔ مکمل عقل رکھنے والے تو بھگوان ہی ہیں۔
اور اُن سے کمیونسٹوں کی جان پہچان نہیں ہے۔" بھوشن نے طنز کا جواب ویسے ہی لہجے میں دیا۔
وہ تین بجے پر واپس آکر نیپیر روڈ پر گھوم گئے اور نیپیر روڈ سے رحمت اللہ روڈ کی طرف۔
منورما سوچ رہی تھی۔ دستلی والا آگیا ہوگا، شاید کھانے کے انتظار میں وسکی پی رہا ہو۔ کیا کہہ کر
تعارف کرائیں گے؟
بیرے نے برآمدے میں آکر کرسیاں لگادی تھیں۔ منورما نے پوچھا۔ "صاحب نہیں آیا؟"
بیرے سے انکار سن کر اس نے اطمینان محسوس کیا۔
بھوشن برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ "بہت خوب صورت جگہ ہے۔ کتنا اچھا نظارہ ہے۔
تمھیں بہت چلنا پڑا۔ تھک گئی ہوگی۔"
"نہیں تو۔ کھانا منگاؤں۔ کھالو۔"
کھالیں۔ لیکن کمیون میں مائی کو خبر نہیں دی ہے۔ وہ ڈانٹے گی۔ چلو ڈانٹ کھالیں گے۔
وہ تو ڈانٹتی ہی رہتی ہے۔" بھوشن ہنس دیا۔
منورما نے بیرے کو پکار کر کہا۔ "کھانا لگاؤ۔ صاحب بھی کھائیں گے۔
بیرے نے آہستہ سے پوچھا۔ "ڈرنک؟"
منورما نے سوالیہ نظروں سے بھوشن کی طرف دیکھا۔
نہیں نہیں۔ مجھے نہیں چاہیے۔ تم لیتی ہو تو لے لو۔" بھوشن نے جواب دیا۔
"پاگل ہو!" منورما ہنس دی۔" وہ لیتے ہیں۔"
کھانے کے بعد منورما نے پوچھا۔ "آپ کو پہنچا آؤں؟"
"کیا؟" بھوشن نے حیرت سے پوچھا۔" اتنی دور۔؟"
"تو یہاں کیا کروں گی! بیرا ایک ٹیکسی بلاؤ۔"
منورما بھوشن کو سندھر سٹ روڈ پہنچا کر ٹیکسی میں واپس آئی۔ دس بج رہے تھے۔ دستلی والا
اب بھی نہیں لوٹا تھا۔ وہ کپڑے بدل کر بستر میں لیٹ گئی۔ خوب چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے
سے دل کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ اُسے جھپکی آگئی۔ آہٹ سے اُس کی نیند ٹوٹی۔
دستلی والا ہونٹوں سے سیٹی بجا کر کوئی تان گنگنا رہا تھا۔ منورما آنکھیں بند کیے چپ لیٹی رہی۔

پتی کے کپڑے بدلنے کی آہٹ آئی اور پھر وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ باہر برآمدے سے کلاک کے دو بجانے کی آواز سنائی دی۔

دوسرے دن منورما صبح سویرے نہا دھو چکی تھی۔ ستلی والا تب بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ منورما کی خواہش ہوئی ایک پیالی چائے پی لے۔ پھر سوچا ایک ساتھ رہتے ہیں تو ایک دوسرے سے کترانے اور گھبرانے سے کیسے چلے گا؟ سینکڑوں لوگوں کی، زیادہ تر لوگوں کی زندگی ایسے ہی روتے جھگڑتے گزرتی ہے۔ ہماری بھی گزر جائے گی۔ وہ چائے کے لیے شوہر کا انتظار کرتی رہی۔ ستلی والا غسل خانے سے باہر نکلا تو منورما نے پوچھا" ناشتہ کر کے باہر جاؤ گے نا؟"

"بہت اچھا۔"

ستلی والا اور منورما آپس میں انگریزی میں ہی بات کرتے تھے۔ ناشتے کے وقت ستلی والا نے کہا" مجھے افسوس ہے مجھے بالکل خیال نہیں رہا کہ تمہیں خرچ کے لیے ضرورت ہو گی۔ گھر کا سامان ہے۔ آنے جانے میں ٹیکسی کا کرایہ ہوتا ہے۔ چاہو تو گاڑی تم رکھ لیا کرو۔ میں تو خود ہی گاڑی چلاتا ہوں۔ چاہو تو ڈرائیور رکھ لو۔"

"کیا ضرورت ہے۔ مجھے کہاں جانا ہوتا ہے۔ ٹیکسی ہر وقت مل سکتی ہے۔" منورما نے جواب دیا۔

"یہ رکھ لو۔" ستلی والا نے بٹوے سے نکال کر ڈیڑھ سو روپے منورما کی طرف بڑھائے۔

منورما نے انکار کیا "ابھی تو میرے پاس ہے۔"

"پھر بھی ہاتھ میں کچھ رہنا اچھا ہوتا ہے۔" اُس نے آدھے نوٹ منورما کے سامنے رکھ دیئے اور بولا" میں سخت جدوجہد کا سامنا کر رہا ہوں۔ سرمایہ داری کی جدوجہد کا۔ فلمی صنعت کے یہ بڑے بڑے جمے جمائے ٹھیکہ دار نئے اُٹھتے لوگوں کو اپنے ہاتھی جیسے پاؤں کے نیچے روند ڈالنا چاہتے ہیں۔ میری پچھلی فلم' رین بسیرا' کا بازار خراب کرنے میں ان لوگوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان لوگوں کی فلموں کی ایجنٹی کرتا رہوں۔ ان کے لیے بڑے بڑے منافعے کما کر دوں۔ لیکن میرے پاس روپیہ لگانے والے سرمایہ دار ہیں۔ گاہک ہیں اور آرٹسٹ ہیں۔ میں روپے میں سے ایک آنہ کیوں لوں؟ میں محنت کرتا ہوں۔ کم سے کم چار آنے لوں گا۔"

منورما نے جواب دیا۔" رین بسیرا فلم میں نے دیکھی نہیں، کیسی ہے؟"

ستلی والے نے خوش ہو کر بتایا۔ بہت کامیاب فلم ہے۔ ہٹ پکچر ہے۔ تم ضرور دیکھو۔ بمبئی سے تو اب چلی گئی ہے۔ یہاں تین مہینے چلی تھی۔ اس میں مدھو کا گھریلو ناچ ہے۔ نوکلی، ہیئر جنگ

نور احمد نے کام کیا ہے۔ تین ڈانس اور تین گانے۔ ناٹ بیڈ۔"

"لیکن ہماری فلموں میں کلائم اور بدذوقی زیادہ ہوتی ہے۔" سہمتے ہوئے منورما بولی۔ اس کی بات کاٹ کر گمبھیر ہو کر ستلی والا نے سمجھایا۔ "کتابی آرٹ کے خیال سے بزنس نہیں چل سکتا۔ یہ تو بزنس کا آرٹ ہے۔"

"اصلی آرٹ کو لوگ پسند نہیں کریں گے کیا؟" منورما نے پوچھا۔

"کر بھی سکتے ہیں اور نہ بھی کریں۔ میں دوسرے چار لاکھ بازی پر کیسے لگا دوں؟ میں تو چالو سکّہ چلاؤں گا۔ انجانے مال کا سٹّہ کون کرے۔ دو چار جانے ہوئے ایکٹر۔ دو چار پھڑکتے ہوئے گانے۔ جو چیز پسند ہو چکی ہے انھیں کا بینا میل۔ بس!"

"میں کچھ مدد کر سکتی ہوں؟" منورما نے دل سے پوچھا۔

"ضرور۔ وقت آنے پر بتا دوں گا۔ تمہارا طور طریقہ اور تمہاری عادتیں دوسری ہیں۔ پھر بھی بہت مدد کر سکتی ہو۔ موقع پر کہوں گا۔ تم جانتی ہو، میں مکمل مساوات، آزادی اور مسلسل تعاون میں یقین رکھتا ہوں۔ کسی طرح کی بھی زور زبردستی میں نہیں۔ آج شام کلب چلو گی؟ چلنا ہو تو مجھے فون کر دینا۔"

ستلی والا اپنے کام پر چلا گیا۔ منورما پھر اُداس ہو گئی۔ اُسے کیموں کی یاد آ رہی تھی۔ وہاں کام کرنے کا موقع ملے تو خوب محنت سے کام کرے۔ بار بار دل میں آتا کہ بھوشن کو فون کرے۔ اُسے کیمون میں کوئی کام مل سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن ہچکچاہٹ سے کر نہ پائی۔

منورما تین دن دل کو مارے رہی۔ تیسرے دن اُس نے دوپہر بعد پارٹی آفس میں بھوشن کو فون کر دیا۔ "میں ملنا چاہتی ہوں۔ تمھیں شام کو فرصت ہوگی؟"

"چھ بجے کے بعد فرصت ہوگی۔" بھوشن نے جواب دیا۔ "سات بجے تک پہنچ سکوں گا۔"

منورما نے کہا وہ چھ بجے فون کرے گی۔ اگر بھوشن کو فرصت ہوگئی تو وہ ٹیکسی لے کر بھوشن کو پارٹی آفس سے لے لے گی۔

منورما پارٹی کے دفتر کے سامنے پہنچی تو بھوشن دروازے پر انتظار کر رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سوال کیا۔ "کس طرف؟"

بھوشن نے جواب کے لیے منورما کی طرف دیکھا۔

"میں کچھ ضروری صلاح لینا چاہتی ہوں۔ کسی ایسی جگہ چلو جہاں چل کر بات کر سکیں۔" منورما نے کہا۔

بال کیشور سڑک پر ایک ایرانی ریستوران کے نزدیک موٹر ٹیکسی رکوادی۔ مالا بار ہل کے اوپر جاتی ہوئی سڑک کی طرف اشارہ کر کے بھوشن نے کہا "ادھر چلیں۔" کچھ دور درختوں کے گھرے سائے میں جاکر دونوں چنبیلی کے سائے کے نیچے بنچ پر بیٹھ گئے۔

"میں کچھ کام کرنا چاہتی ہوں چاہے اخبار میں کام مل جائے یا اور دوسرا کام۔" منورما نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے پارٹی کا کام؟ بھوشن نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"مشکل ہے۔ پارٹی ممبر اور وہ بھی اپنے صوبہ یا ضلع سے خاص سفارش سے بھیجے گئے ممبر کے سوا کمیون میں جگہ نہیں مل سکے گی۔"

"میں رہنے کے لیے نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ کام کرنے کے لیے ہی وہ بات کہہ رہا ہوں۔"

"آپ کو میرے لیے کچھ کرنا ہی ہوگا۔" اپنی انگلی پر رومال لپیٹتے ہوئے منورما نے کہا۔ "میری شادی کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا... میں کھائی میں گرنے کے ڈر سے بھاگی تھی۔ کنوئیں میں گر پڑی۔"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"کیا بتاؤں؟ میں اس آدمی کو جانتی کتنا تھی۔ میرے بھائی کا دوست ہے۔ ایک بار ہمارے یہاں ٹھہرا تھا۔ پھر مسوری میں ہم لوگ ایک ہی ہوٹل میں تھے۔ ملنے ملانے اور طور طریقے میں بہت بھلا ہے، بات بھی اچھی کرتا ہے۔ اُس نے بھائی کو خط لکھ کر شادی کی تجویز پیش کی تھی۔ اس وقت گھر کی حالت اتنی پریشان کن تھی کہ کہیں بھی بھاگ جانے کے لیے بے چین تھی۔ میری قسمت پھوٹی تھی۔ میں نے تار دلوا دیا کہ منظور ہے۔ خود ہی پندرہ دن کے اندر سول میرج کا انتظام کر لیا۔ لیکن اب دیکھتی ہوں ہم لوگوں میں کوئی میل نہیں ہے۔ اس گھر میں ممکن نہیں۔ اگر دن بھر کے لیے ہی اطمینان کا کوئی کام مل جائے تو سمجھ لوں گی کہ رات ہوٹل میں کاٹ رہی ہوں۔"

"میری بات کا بُرا تو نہیں مانو گی؟"

"ایسا شک کیوں ہے؟"

"صرف ناقابل برداشت حالات سے بچنے کے لیے، دل بہلانے کے لیے پارٹی کا کام کرنا چاہتی ہو نا؟"

"کیوں لاہور میں پارٹی کا کام نہیں کر رہی تھی؟ آپ میرے خیالات تو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"لیکن تم پارٹی ممبر نہیں بنیں۔"
"آپ نے نہیں بنایا....... آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔"
"کیا کہہ رہی ہو؟" بھوشن کی آواز پگھل گئی۔
"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اب پرانی بات نہ اٹھاؤ۔ نہیں تو یہ سب کیوں ہوتا؟" منورما بھوشن کی طرف سے آنکھیں بچائے کہتی جا رہی تھی۔ "تب کہتے تھے۔ میرے لیے زندگی میں جدوجہد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اُس دن کہہ رہے تھے۔ کمیونسٹ سادہ، صحت مند زندگی حاصل کر کے ساری زندگی جدوجہد کر سکتا ہے۔ سمجھ آگئی ہے نا!"
"میں نے کچھ اور بھی تو کہا تھا۔"
"کیا؟"
"کہ کوئی شخص بھی سمجھا سمجھایا پیدا نہیں ہوتا۔"
منورما رو پڑی۔
"منورما کیا کر رہی ہو؟" بھوشن نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔
"بس میرے لیے پارٹی آفس میں کام کا انتظام کر دو۔"
"فوراً کیسے ہو سکے گا؟ میرے چاہنے پر بھی بہت جلد نہیں ہو سکے گا۔"
"کیوں نہیں ہو سکے گا۔ تم جوشی سے کہو۔ میں بھی کہوں گی۔ سب لوگ جانتے ہیں میں لاہور میں پارٹی کا کام کرتی تھی۔ وہاں سے پوچھ لیں۔"
"جوشی قاعدے کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟"
"تو پھر میں مر جاؤں۔ آخر کس کے لیے اپنے آپ کو گھلاتی رہوں۔ عذاب سہتی جاؤں؟"
"ہو جائے گا۔ لیکن پہلے ممبئی پارٹی میں تین چار مہینے کام کرو تاکہ لوگ تمہیں جان جائیں۔"
"میں تو اُن لوگوں کو جانتی نہیں۔"
"وہاں میں کہہ دوں گا لیکن سشیلی والا کو کوئی اعتراض ہوا تو؟"
"ہوا کرے۔ میں کیا کروں؟ میں اُس سے چوری کیوں کروں؟ اپنے آپ کو یوں مارنے سے اچھا ہے، میں اِس پہاڑ سے کود پڑوں۔ سمندر میں پھاند جاؤں۔ میں خود اپنے آپ سے نفرت کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں جن سے خیالات کا میل ہو۔"
"خیر وہ ہو جائے گا۔ اسی خیال سے منگلم اور پاروا اپنی ریاست کے حق اور اختیار پر لات مار کر

پارٹی میں کام کر رہے ہیں۔ اسی سوال پر سکینہ کی شوہر سے علاحدگی ہوگئی۔ انسان کے انصاف کا شعور سارے اصولوں سے بڑا ہے۔ لیکن تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو۔"

"میں بے انصافی کر رہی ہوں ؟"

"تم نے کہا۔ مجھے تم پر بھروسہ نہیں تھا۔"

منورما نے تردید کے انداز میں جواب دیا۔ "۱۹۳۸ء میں تمہارا کیا سلوک تھا؟ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں کیسا رہا؟ تم مجھے دشمن طبقے میں سمجھنے لگے۔" منورما نے بھوشن کی طرف دیکھے بغیر اپنی چپل کے نیچے پڑے پتھر کو دبا کر بولی۔ "کیا کوئی شخص طبقے سے الگ نہیں ہوسکتا؟ کیا سوما....."

"سوما بیرسٹر کا کھلونا ہی تو بنی اور کیا ہوا؟ میں ایسی بے وقوفی نہیں کرسکتا تھا۔ اس حالت میں تمہارا طبقہ تمہیں ٹھکرا دیتا یا مجھے خرید لینے کی کوشش کرتا۔ یا ہم دونوں انفرادی طور پر حالات کے خلاف لڑنے کے مذاق میں شہید بن جاتے۔"

"آپ پھر وہی بات کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں مجھے اس طبقے سے نفرت ہے۔ اس سے بچنا چاہتی ہوں۔ میں کیا کچھ نہیں برداشت کر رہی ہوں۔" منورما جھنجھلا اُٹھی۔

"بھوشن ہنس دیا۔" وہ بچپن کا الھڑپن تھا۔ جو خوب صورت کھلونا دیکھا، اسی کے لیے مچل گئے۔"

"وہاٹ ڈو یو مین! آپ نے مجھے کھلونا ہی سمجھا تھا؟" منورما نے تلخی سے سوال کیا۔

"نہیں بھئی۔ اُس وقت میں خود ہی ہوائی قلعوں اور خیالوں کی دُنیا میں تھا۔ زندگی نے بتادیا کہ میری زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ ہم دو مختلف طبقوں کے فرد تھے۔ لوگوں میں امیروں کی لڑکیوں سے پریم کرنے کی خواہش عام طور پر ہوتی ہے۔ اسے وہ شخصی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔"

"وہ الزام اب بھی باقی ہے؟" منورما نے مایوسی کے انداز میں پوچھا۔ "اب تو میں امیر نہیں ہوں۔"

"الزام کی وجہ کو مٹانا ہو تو اس کے لیے انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ دور کر دینا چاہیے۔" بھوشن نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

صبح کے ناشتے کے وقت منورما نے ستلی والا سے کہا۔ میری خواہش ہے، کسی عوامی کام میں حصّہ لوں۔ لاہور میں بھی کچھ نہ کچھ کیا ہی کرتی تھی۔"

ستلی والا نے اتفاق کیا۔" میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ تم سے کہوں۔ سوچ رہا تھا کہ بمبئی کی سوسائٹی میں تمہارا تعارف ہو جائے۔ سماج میں حیثیت پیدا کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ کاروبار اور تجارت میں بھی فرد اور خاندان کی سماجی اور عوامی حیثیت کا بہت اثر پڑتا ہے۔ ایک جانے مانے آدمی کی بات کی قیمت ہوتی ہے۔ جان پہچان کے لیے کبھی کلب بھی چلا کرو۔ کوئی سبھا وغیرہ ہوگی تو اس کے لیے بھی دعوت نامہ منگوانے کا خیال رکھوں گا۔"

منورما اس ہفتے دوبارہ کلب گئی۔ ستلی والا نے اسے غریب بچوں کے لیے دودھ کا انتظام کرنے کے لیے معزز عورتوں کی کمیٹی کا ممبر بنا دیا۔ اس کمیٹی میں بھی چلی جاتی۔ مگر بھوشن نے اس کا تعارف چرنی روڈ اسٹیشن کے نزدیک گرگام میں ایس۔ یو (سوویٹ دوستوں کی انجمن) سے کرا دیا تھا۔ اور وہ پابندی سے انجمن اور اس کے اخبار میں کام کرنے کے لیے وہاں جانے لگی تھی۔

انجمن کے پندرہ روزہ رسالے کی اشاعت کی تاریخ نزدیک ہونے کی وجہ سے دفتر میں کام بہت تھا۔ منورما دوپہر کے کھانے کے لیے گھر واپس نہیں گئی تھی۔ شام کے وقت انجمن کی صدر کامریڈ نینتا سے صرف ایک گھنٹہ کی چھٹی لے کر وہ گھر آئی تھی۔ بھوشن نے آنے کے لیے کہا تھا اور منورما بھوک سے بے چین ہو گئی تھی۔ اس کے پہنچتے ہی بھوشن آ گیا۔ اور بیرے نے خبر دی۔" صاحب کئی بار فون کر چکے ہیں اور کہا ہے کہ میم صاحب آئیں تو دفتر میں فون کرلیں۔"

منورما نے فون پر ستلی والا سے بات کی۔ ستلی والا نے کہا۔" خوش قسمتی ہے کہ تم لوٹ آئیں۔ میں مصیبت میں پڑ جاتا۔ آج میں نے ایکٹرس مدھو اور سیٹھ بدانیا کو چائے کے لیے تاج میں دعوت دے رکھی ہے۔ میں ان لوگوں سے تمہارا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ ابھی پینتالیس منٹ ہیں۔ تم ٹیکسی سے یہاں آ جاؤ۔"

بھوشن نے دیکھا، فون کا چونگا کان پر رکھے منورما کے چہرے پر فکر کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔ سر کھجلاتے ہوئے بولی۔" میں آتی تو ضرور لیکن ایک بہت ضروری کام کے لیے کچھ آدمیوں سے وعدہ کر چکی ہوں۔ اگر میں وہاں نہیں پہنچی تو بہت خراب بات ہوگی۔ میں انھیں کیا جواب دوں گی۔ مجھے بہت افسوس ہے۔"

ستلی والا نے اصرار کیا۔" مجھے تمہارے اپائنٹمنٹ کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ میں ان سے کہہ چکا ہوں کہ تم آؤ گی۔ سوچو میری کیا پوزیشن ہوگی؟ اس کا دوسری باتوں پر بھی گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔" منورما نے لاجواب ہو کر فون رکھ دیا۔ بھوشن چائے کا پیالہ ہونٹوں کے سامنے تھامے گھبرایا سا

دیکھ رہا تھا۔

منورما نے روہانسی آواز میں کہا۔ "بتاؤ کیا کروں ؟ کسی طرح نہیں مانتا۔ اِس پارٹی میں میری کیا ضرورت ہے ؟ ایکٹرس مدھو اور سیٹھ بدا ینیا کو میں جانتی بھی نہیں۔ یہ بالکل ناقابلِ برداشت ہے۔ کامریڈ نیتا کیا کہے گی ؟"

"نیتا خوش ہو کر تعریف تو نہیں کرے گی۔ لیکن تم کر بھی کیا سکتی ہو ؟ وہ پتی کے اختیار کا فائدہ اُٹھا رہا ہے۔"

منورما غصّہ ہو گئی تھی۔ وہ کپڑے بدلنے کے لیے دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔ بھوشن کی بات سُن کر وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "دل کیوں دُکھاتے ہو ؟ توہین کیوں کرتے ہو ؟" اُس نے آنچل سے منھ ڈھک لیا۔

"توہین کیسی ؟" بھوشن نے بھنویں اُوپر اُٹھا کر پوچھا۔

منورما جواب دیے بغیر اُٹھ گئی اور آنکھیں پونچھتی اندر چلی گئی۔ بھوشن ٹھنڈی چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔

منورما باہر آئی۔ وہ بہت سادی لیکن قیمتی سفید ساڑی اور گہرے لال رنگ کا بلاوز پہنے تھی۔ پہننے کے انداز سے بے دلی اور بے پروائی ظاہر تھی۔ سر کے بال بھی بے ترتیب تھے۔ چہرے سے آنسوؤں کے دور کرنے کے لیے اُس نے منھ دھو کر پاؤڈر اور آنکھوں میں سرمہ لگا لیا تھا۔ دیکھ کر بھوشن مسکرا دیا۔

"کیوں ؟" منورما نے پوچھا۔

"ہم لوگوں کے یہاں آتی ہو تو سنت بن کر !"

"تو ؟"

"اب اپسرا بن کر جا رہی ہو۔ پیسے کی عزّت ہے نا ؟"

"تم لوگوں کے یہاں ایسے جاؤں تو آنکھ اُٹھانا مشکل ہو جائے گا.... کیوں، کیا بہت ولگر (بھڑکیلی) لگ رہی ہوں ؟"

"کیا کہہ رہی ہو، ویری چارمنگ !"

"پاگل ہو رہے ہو..... ٹیکسی تک میرے ساتھ چلو۔"

ٹیکسی میں بیٹھ کر منورما نے کہا۔ "فورٹ تک ساتھ چلو۔ وہاں سے ٹیکسی میں تم کمیون چلے جانا۔

یہ لو۔" اس نے دس روپے کا نوٹ بھوشن کی قمیض میں ٹھونس دیا اور جھجکتی ہوئی بولی۔ "سچ کہو۔ میں جھنجھلاہٹ میں تھی۔ بے تکی تو نہیں لگ رہی ہوں ان کپڑوں میں ؟"

"میں اس سے اچھی پوشاک کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بچ کے رہنا سیٹھ لوگوں سے !"

"دھت !" اور پھر کہا۔ "تم نہیں جانتے۔ بلی (قربانی) کے لیے جانور کو سجا کر لے جاتے ہیں۔"

"جانور کو قربانی کے لیے جاتے دیکھیں تو بچا لینا چاہیے۔"

"جو ایسا کرے گا، اس پر سماج کا دھرم، قانون، طور طریقہ، رسم رواج، غرض سب کچھ ٹوٹ پڑے گا۔"

تاج محل ہوٹل میں چائے پیتے اور باتیں کرتے ساڑھے چھ بج گئے۔ چائے کے وقت ستلی والا مدھو اور بدانیا کو اپنی نئی فلم کی اسکیم سمجھاتا رہا۔ کمپنی میں ایکٹرس مدھو، ایکٹر شیر جنگ اور نورل کی پتی رکھنا چاہتا تھا۔ ستلی والا کی تجویز تھی، بدانیا دو لاکھ روپے لگائے۔ مدھو پچاس ہزار کا۔ شیر جنگ اور نورل کے پچیس پچیس ہزار کے حصے ہوں۔ مدھو نقد نہ دے کر پہلی فلم میں کام کرنے کے کنٹریکٹ کر کے رقم گھٹا دے۔ شیر جنگ اور نورل بھی یہی کریں۔ اس طرح کمپنی کی پونجی اپنے آپ چار لاکھ ہو جائے گی۔ ستلی والا منیجنگ ڈائرکٹر کا کام کرے گا۔ اس کے کام کا حصہ پچاس ہزار ہوگا۔ چائے کے کچھ دیر کے بعد سیٹھ بدانیا اور ستلی والا نے اتنی گمبھیر بات چیت کرنے کی تھکن دور کرنے کے لیے وھسکی لی۔ منورما اور مدھو کے لیے شیمپین لگائی گئی۔ سیٹھ جی، ستلی والا اور مدھو کے بہت اصرار کرنے پر منورما نے دو گھونٹ پیئے اور بُرا نہ معلوم ہونے پر بھی زیادہ نہ پی۔

سیٹھ جی نے تجویز کی۔ "ڈنر ایک ساتھ ہو۔"

مدھو نے گھبرا کر کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری تو آٹھ بجے سے شوٹنگ ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"ہم آپ کو اسٹڈیو پہنچا دیتے ہیں۔" ستلی والا نے یقین دلایا۔

"بھئی ہم اکیلے رہ جائیں گے۔" سیٹھ جی نے گھبراہٹ ظاہر کی۔

"سیٹھ جی یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟" ستلی والا نے منورما کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم سیٹھ جی کے ساتھ ٹھہرو۔ ہم مدھو کو چھوڑ کر آتے ہیں۔" ستلی والا منورما کے جواب کا انتظار کیے بغیر جیب سے کار کی کنجی نکال کر انگلی پر گھماتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تو پھر ڈنر کہاں ہو ؟" سیٹھ جی نے ستلی والا کو مخاطب کیا۔ "ہمارا خیال ہے۔ ہمارے یہاں میرین ڈرائیو پر کیسا رہے گا ؟" انھوں نے منورما کی طرف دیکھا۔ "آپ ہماری جگہ بھی دیکھ لیں گی۔" سیٹھ جی نے ستلی والا کی طرف دیکھا۔ "آپ وہیں آئیے۔"

"بہت ٹھیک فرمایا سیٹھ جی آپ نے۔" ستلی والا نے تائید کر دی۔

منورما سیٹھ جی کے ساتھ ان کی گاڑی میں میرین ڈرائیو پہنچی۔ تیسری منزل پر جانے کے لیے لفٹ تھی۔ سیٹھ جی کے مکان پر ایسا لگا کہ نوکر مالک کا انتظار نہیں کر رہے تھے۔ سیٹھ جی نے آتے ہی انھیں ضروری ہدایات دیں۔ منورما نے ڈرائنگ روم میں کاؤچ پر بیٹھتے ہی کہا۔" سیٹھانی جی سے نہیں ملائیں گے ؟"

"وہ لوگ یعنی بال بچے کالبا دیوی میں رہتے ہیں۔" جواب دے کر سیٹھ جی کاؤچ پر منورما کے نزدیک بیٹھ گئے۔

منورما سیٹھ جی کو جگہ دینے کے لیے دوسری طرف ہٹ گئی۔ اتنی بے تکلفی اچھی نہ لگی۔ اُس نے پوچھا۔" آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں ؟"

"اکیلے کیسے، آپ تو ہیں۔ آپ کے ساتھ بھیڑ لانے سے کیا فائدہ ؟" سیٹھ جی مسکرا دیئے۔

منورما چپ رہ گئی۔ کچھ بولی نہیں۔ کمرے سے باہر نکلی اور لفٹ پر پہنچ کر بٹن دیا اور نیچے اُتر گئی۔

سیٹھ جی دیکھتے رہ گئے۔

منورما اپنے مکان میں پہنچ کر دو گھنٹے تک برآمدے میں بیٹھی ستلی والا کا انتظار کرتی رہی۔ ستلی والا آیا تو آدھا منٹ تک ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کرنے میں چُپ رہے۔ منورما سے رہا نہ گیا۔" میں نہیں سمجھتی تھی کہ کوئی آدمی روپے کے لیے اتنا بھی گر سکتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا ؟" ستلی والا نے سخت لہجے میں پوچھا۔

منورما نے اس کی طرف گھور کر جواب دیا۔" مطلب نہیں سمجھتے۔ مجھے اس آدمی کے ساتھ بھیجنے کا کیا مقصد تھا ؟ وہاں اُس کی عورت بھی نہیں تھی۔ آپ جائے پر مجھے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ اپنی عورت کو کیوں نہیں لایا ؟"

"اکیلی سے کیا مطلب ہے ! تمہیں نہیں معلوم تھا کہ میں پانچ دس منٹ میں لوٹ رہا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ راستے میں پہیے سے ہوا نکل جائے گی !" ستلی والا نے اونچی آواز میں کہا۔" تم کیا پردے میں رہتی آئی ہو ؟ تم کیا دوسرے آدمیوں کے ساتھ کبھی نہیں اٹھی بیٹھیں ؟ تم سے ملنے کے لیے

یہاں آدمی نہیں آتے کیا؟ دن بھر تم اپنے دوستوں کے ساتھ رہتی ہو۔ آج میں نے ایک دوست کو دعوت دی تو اُس پر طوفان کھڑا کر رہی ہو۔ کیا کہا اس نے، بتاؤ؟ میں وہیں سے آرہا ہوں۔ ہمارے گھومنے اور لوگوں سے ملنے میں میں نے کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ تم میری کوئی بات برداشت نہیں کرسکتیں تو ساتھ رہنے کا فائدہ کیا ہے؟ اس کا لہجہ بہت تلخ اور سخت ہو گیا۔ "کیا یہ طریقہ تھا اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے بمبئی آنے کا؟"

منورما نے بہت کچھ کہنے کے لیے سوچ رکھا تھا۔ لیکن پتی کی آخری بات کے بعد اُس کے منھ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اُس نے برآمدے کے جنگلے پر سر رکھ دیا اور آنکھیں جھکا لیں۔ ستلی والا غصّے میں زینے سے اُتر کر چلا گیا۔ نیچے گاڑی کے چلنے کی آہٹ ہوئی اور گاڑی بنگلے سے باہر چلی گئی۔

منورما برآمدے میں بیٹھی رہی۔ رات کے دو بج گئے۔ وہ اُٹھی اور بغیر کپڑے بدلے اور کچھ اوڑھے بغیر آنکھیں موند کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اُسے معلوم نہ ہوا، ستلی والا کب لوٹا۔ صبح اُس کی آنکھ کھلی تو ستلی والا اپنے پلنگ پر گہری نیند سو رہا تھا۔

منورما نہا دھو کر باہر برآمدے میں بیٹھ کر اپنے بچاؤ کی راہ سوچنے لگی۔ ستلی والا اُٹھا اور اُس کی طرف دھیان نہ دے کر ناشتہ کیے بغیر نیچے اُتر کر چلا گیا۔ بیرے نے منورما کے لیے ناشتہ لگا دیا۔ رات اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے کچھ کھایا اور چائے پی لی۔ خیال آیا، میں یہاں کیوں کھاؤں پیوں؟ یہ تو کہتا ہے سب دوستوں سے ملنے کے لیے شادی کا سوانگ رچ کر بمبئی آئی تھی!

منورما سوچ رہی تھی۔ پتاجی اور بھائی سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ میں تو اپنی مرضی سے شادی کرکے آئی ہوں۔ تار دے کر شادی کی تھی۔ انھوں نے مجھے گھر سے نکال کر، میرے سر خود ہی شادی کر لینے کا الزام ڈال دیا ہے۔ اب یہ آدمی بھی اپنے کام کا نہ سمجھ کر گھر سے نکالنے کے لیے مجھ پر آوارگی کا الزام لگانے کی ترکیب کر رہا ہے۔ واہ رے سماج کے چکر! ..... مجھ سے چاہے جو غلطی ہوئی ہو۔ مگر یہاں سے نکلنا میرے لیے نجات ہی ہے ..... لیکن جاؤں بھی تو کہاں؟ کیمون میں بھی تو میرے لیے جگہ نہیں ہے۔ بے وقوفی سے ٹھوکر کھانے والوں کو وہ لوگ کیوں رکھیں گے؟ وہاں تو سمجھ دار اور عقل مند لوگوں کی ضرورت ہے۔

منورما کو یاد آگیا۔ کل شام اس کے الف۔ ایس۔ یو کے دفتر میں نہ واپس جا سکنے سے کام بڑھ گیا ہوگا۔ کامریڈ نیتا کیا کہے گی؟ نیتا کی گہری نیلی ساڑی، پریشان بکھرے، روکھے بال، کندھے سے

لٹکتا ہوا تھیلا، اور اُس کے لمبے سانولے چہرے پر ہر طرف گھومتی ہوئی آنکھیں منورما کو دکھائی دے گئیں۔ سرکس میں ہاتھیوں کو نچانے والے ہنٹر باز ماسٹر جیسا نیتا کا انداز، رتی بھر کی کمی پر بھی جس کا ہنٹر تڑاق سے بول اُٹھتا ہے!...... نیتا کیا کہے گی؟

منورما نے سوچا۔ گھر میں بیٹھ کر رونے کے سوا کیا کرے گی؟ کئی دن سے وہ گھر سے ادیرا تک پیدل ہی جا رہی تھی۔ ٹرام اور بس پر یا پیدل چلنے والے ساتھیوں کے یہاں ٹیکسی پر جانے میں اُسے عجیب جھجک معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بہت کمزوری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ٹیکسی پر گئی اور دفتر سے پچاس قدم پہلے ہی اُتر گئی۔ دفتر میں گھستے ہی نیتا دکھائی دی اور اُس کی بے مروّت سی خشک آواز سنائی دی: "اب دکھائی دیا ہے وہ عید کا چاند جس کے لیے ہیڈ آفس کے بہت ذمہ دار لوگوں کی بڑی بڑی سفارشیں اور تعریفیں سنی تھیں۔ آپ کی مہربانی سے اخبار چوبیس گھنٹے لیٹ ہو گیا۔"

نیتا کہتی گئی: "کل مدن پورہ میں میٹنگ کے بعد آٹھ بجے گھر پہنچ کر خیال آیا کہ بے چاری لڑکی اکیلی پروف دیکھ رہی ہو گی۔ مجھے ڈر لگا کہ راستے میں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ ٹیلیفون میں بھوشن کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ اپنے شہنشاہ خاوند کی پارٹی کی رونق بڑھانے گئی ہیں۔ خاوند کی پارٹی کی رونق میں کمی نہ رہے۔ ہزاروں عوام اخبار کا انتظار کرتے رہ جائیں! جب مجھ سے جواب مانگا جائے گا کہ اخبار کیوں لیٹ ہو گیا، میں عید کے اِن چاند کو دکھاؤں گی کہ مجھے اِن کی مدد سے کام کرنا تھا۔ من کی موج سے کام کرنے والوں سے یہ کام نہیں چلتا۔ لیڈی صاحبہ! یہ ڈیوٹی ہے۔ خود ہی قبول کی ہوئی ڈیوٹی کی ذمہ داری آپ نہیں سمجھتیں۔" نیتا بولتی ہی جا رہی تھی۔ غنیمت بات یہ تھی کہ ساتھ کام کرنے والے دوسرے لوگ چھٹی کا دن ہونے کا خیال کر کے دفتر نہیں آئے تھے۔ نیتا خود ہی پروف دیکھ رہی تھی۔

منورما اسکول کی بے رحم ماسٹرنی کے سامنے قصور وار لڑکی کی طرح کھڑی تھی۔ نیتا نے کاغذوں پر آنکھیں جھکا لیں۔ نیتا کاغذوں پر ایسے آنکھیں گڑائے رہی، جیسے سامنے کوئی نہ ہو۔ چند منٹ بعد اُس نے منورما کی طرف دیکھا: "لیڈی صاحبہ! کیا آپ کھڑی رہنے کے لیے آئی ہیں؟ شاید آپ منتظر ہیں کہ میں آپ سے بیٹھنے کی استدعا کروں، اور معافی مانگوں۔ یہ نہیں ہو گا۔ میں ڈسپلن پر چلتی ہوں۔"

منورما نے آنچل سے چہرہ چھپا لیا۔ اسے رونا آ رہا تھا۔ اور بدن کانپ رہا تھا۔ نیتا میز کی دوسری طرف کرسی سے اُٹھ کر منورما کے پاس آ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر پر تھے۔ جیسے ہاتھا پائی کے لیے تیار ہو۔ "تم بولتی کیوں نہیں جی۔ بات کیا ہے؟ کس نے تمھیں پریشان کیا ہے؟" وہ اب بھی اسی لہجے میں بات کر رہی تھی

"تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو؟"

نیتا منورما کو باہنہ سے پکڑ کر غسل خانے میں لے گئی۔ اُس کا بٹوا ایک طرف رکھا اور حکم دیا۔ "منھ دھو!"

منورما سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ نیتا خود ہی اس کا منھ دھونے کے لیے بڑھی۔

منورما نے کہا "ٹھہریئے" اور اپنا منھ دھونے لگی۔ منورما غسل خانے سے نکلی تو دیکھا کہ نیتا میز پر پروف دیکھ رہی تھی۔

"یہیں آجاؤ۔" نیتا کا لہجہ بدل گیا تھا۔ تھوڑے سے کاغذ اور رہ گئے ہیں انھیں ختم کر دیں۔ بڑی خوشامد سے پریس کھلوالیا ہے۔ ورنہ آج اتوار ہے۔ باقی سب پروف بھیج چکی ہوں۔"

نیتا نے چپراسی کی طرف دیکھا۔ "چھوکرا چائے لاؤ۔"

چائے آنے تک پروف ختم ہو چکے تھے۔ نیتا نے چپراسی کو حکم دیا۔ یہ پروف پریس میں لے جاؤ اور پوچھو کتنا ہو گیا؟"

منورما نے چائے کی پیالی کی طرف دیکھتے ہوئے بیتی رات کا سارا واقعہ نیتا کو سنا دیا۔

نیتا انگریزی میں گالی دے کر بولی: "وہ روپے کا کُتّا کون ہوتا ہے تم پر الزام لگانے والا۔"

منورما نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میرا خیال ہے، وہ میرے اور اپنے نقطۂ نظر میں یکسانیت نہ دیکھ کر مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔"

"پیچھا چھڑانے کا مطلب؟" نیتا غصّے سے بولی: "دیکھوں گی میں پیچھا چھڑانے والے کو! اُسے تمہارا گزارہ دینا ہوگا۔ تمہارے جہیز وغیرہ میں کچھ ملا ہوگا۔ وہ بھی واپس کرنا ہوگا۔ تمہارے پِتا کی مالی حالت کیسی ہے؟"

منورما نے بتایا۔ "جہیز کچھ نہیں ملا تھا۔ صرف پندرہ ہزار کے چک تھے۔ وہ خود اُس نے ستلی والا کو دے دیے تھے۔"

نیتا کو اور بھی غصّہ آگیا۔ "دیکھوں گی پیچھا چھڑانے والے کو! اُسے مینٹی نینس دینا ہوگا۔"

نیتا کے دل میں منورما کے لیے زیادہ ہمدردی اور محبت جاگ اُٹھی۔ منورما نے گھر کی حالت سے پریشان ہو کر ستلی والا سے شادی کر لینے کی اپنی غلطی بھی اُسے بتا دی۔

نیتا اُس کے ساتھ ہمدردی سے خفا ہو کر بولی: "تمہاری جیسی بُزدل لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ تمھیں چاہیے تھا کہ گھر والوں کی ناانصافی کا مقابلہ کرتیں۔ ایسے آدمی کے ساتھ رہنے کا

مطلب کیا ہے ؟ تمھیں طلاق لے لینی چاہیے۔ ایمان داری اور عزّت سے زندگی گزارنی چاہیے۔ تم میرے ساتھ یہاں اسی مکان میں رہو۔ دیکھوں گی تمھیں کون پریشان کرتا ہے ؟"

نیتا نے منورما کے سامنے ہی اُس کے دکھوں کی کہانی اپنے کامریڈ پتی واسیکر کو سنا دی اور خود ہی فیصلہ بھی دے دیا۔" اس کا پتی چاہتا ہے تو طلاق لے لینا ہی اس کے لیے باعزّت طریقہ ہے۔ مانتے ہو نا تم ؟"

واسیکر نے تردد کے ساتھ ہاتھ کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔" طلاق کے مقدمے میں ہمیشہ پریشانی ہوتی ہے۔ طلاق کے لیے وجہ کیا بتائے گی ۔ سیاسی یا اصول کے اختلاف کی وجہ سے طلاق نہیں ہو سکتا طلاق کے لیے تین وجہوں میں سے کوئی ایک چاہیے۔ یا تو شوہر کا دوسری عورت سے تعلق ہو، یا وہ نامرد ہو، یا بیوی کے ساتھ مار پیٹ کرتا ہو۔"

نیتا نے منورما کی طرف دیکھا۔

منورما نے آنکھیں جھکائے انگریزی میں جواب دیا۔" میرے خیال میں تو آخری بات چھوڑ کر سب کچھ ہے۔"

"کیا ؟" حیرت اور دکھ کے ساتھ نیتا نے لمبی سانس لی اور واسیکر کی طرف دیکھ کر بولی۔" ہے نا ظلم۔ ناقابل ظلم لڑکی پر۔ منورما تمھیں ہر حال میں اس بے عزّتی اور گندگی سے اپنا پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔"

محض کہہ دینے سے کام نہیں بنتا۔ عدالت میں سچ کو ثابت کرنا ہوگا۔ ثبوت اور گواہی چاہیے۔"

واسیکر نے پوچھا۔" منورما عدالت میں جا کر یہ سب کہو گی ؟"

"کیوں نہیں کہے گی ؟" نیتا نے زور سے میز پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔

منورما نے انکار میں سر ہلا دیا۔

نیتا کا غصّہ بڑھ گیا۔" تو تمھیں مصیبت سے کون بچا سکتا ہے۔ تم خود مصیبت کے گلے سے چمٹی رہو تو تمھیں کون بچا سکتا ہے۔"

نیتا کے غصے کی وجہ سے منورما کی غیر مطمئن زندگی کی بات پارٹی میں پھیل گئی۔ منورما اس بدنامی سے گھبرا کر سمٹی جا رہی تھی۔ نیتا کی نظر میں یہ گھبراہٹ سرمایہ دارانہ تہذیب کی خرابی تھی۔ وہ مسلسل زور دیے جا رہی تھی کہ منورما اس گندگی سے چھٹکارا حاصل کرے۔

بھوشن کی رائے تھی کہ منورما جلد بازی نہ کرے۔ ایسا موقع آ سکتا ہے کہ عدالت میں سر پھوڑے بغیر جھگڑے سے نجات مل جائے۔

"میں نہیں چاہتا۔" بھوشن نے کہا۔ "اخباروں میں موٹے حرفوں میں خبر چھپے کہ کمیونسٹ لڑکی نے نامرد شوہر کو طلاق دے دی! اور نیتا کے پاس کون ڈاکٹر ہے جو ضروری سرٹیفکیٹ دے دے گا؟"

سنتلی والا اور منورما میں بات چیت بند تھی۔ کھانے کا وقت دونوں کا الگ الگ ہو گیا تھا۔ سنتلی والا بیرے کو پندرہویں دن ایک لفافہ دے دیتا تھا۔ لفافے میں سو روپے ہوتے تھے۔ اسی طرح مہینے گزرتے گئے اور ایک برس بیت گیا۔ دوسرا بیت رہا تھا۔ منورما پارٹی کی ممبر بن گئی، لیکن کام اس کا نیتا کے ساتھ ہی رہا۔ نیتا کا ساتھ چھوڑ کر کسی دوسرے کام میں ہاتھ لگانے کی خواہش بھی اسے نہ تھی۔

پناہ کی قیمت

لاہور اسٹیشن پر سوما برقع پہنے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی، تو اُس نے آنکھیں پونچھ لیں۔ اُس نے طے کر لیا کہ اب نہیں روئے گی۔ برکت نے اسے سمجھا دیا کہ گاڑی میں روتی ہوئی جائے گی تو ساتھ کے مسافروں کو شک ہوگا اور کہیں پولس بیچ میں آ گئی تو دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔

سوما روتی تو اب کسے دکھا کر اور کس لیے؟ جو کچھ وہ چھوڑ آئی تھی، جہاں سے اُسے نکال دیا گیا تھا۔ جسے چھوڑتے وقت مر جانے کے علاوہ اُسے اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اُس کی طرف واپس جانے کے لیے اب وہ تیار نہیں تھی۔ پچھلے بھیانک تجربوں کے مقابلے میں انجانے کا ڈر بہت کم تھا۔ اُس کے دل میں مستقبل کے بارے میں نہ کوئی امید تھی اور نہ خیال تھا۔ وہ صرف سر پر آئی ہوئی مصیبت سے پناہ چاہتی تھی۔

سوما کو یاد آ رہا تھا۔ بیج ناتھ تحصیل کی کچہری میں پولس دھن سنگھ کو پکڑ کے لے گئی تھی۔ تو وہ سڑک پر بیٹھ کر سب لوگوں کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اُسے یاد آ رہا تھا۔ لوگ اُسے گھیرے ہوئے اُس کا تماشہ دیکھ رہے۔ اب چاہے جان نکل جائے مگر اس طرح کا تماشہ نہ بنے۔ گاؤں کی سوما مر چکی تھی۔ اب دوسری سوما تھی۔ بھلے گھر کی عورت، دھوکا کھائی ہوئی، خاندان سے نکالی ہوئی، بیوہ۔

برکت ہوشیاری سے سوما کو لاہور اسٹیشن سے رات کے وقت لے کر چلا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت اور اس کے بعد ایک گھنٹے تک سوما برقع پہنے رہی۔ برکت نے کہا تھا کہ لاہور سے نکل جانے کے بعد پھر کسی پہچاننے والے کا ڈر نہیں رہے گا۔ تم برقع اُتار کر کپڑوں میں لپیٹ دینا۔ ڈاک گاڑی اپنی تیزی اور جلد بازی دکھانے کے لیے دھواں دھار چال سے طرح طرح کی آوازیں نکالتی ہوئی لوہے کی پٹریوں پر تھرکتی، پھسلتی اور اندھیرے کو چیرتی چلی جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشن پلکوں کی جھپک کی طرح نکلتے جا رہے تھے۔ گاڑی کے ایک بار چلنے اور رُکنے سے دونوں کا سفر طے ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن گاڑی

چلتی ہی جا رہی تھی۔ گاڑی رُکتی تو اسٹیشنوں پر روشنی میں دکھائی دینے والے لوگوں کے چہروں اور بولیوں میں پنجاب سے فرق آتا جا رہا تھا۔ لیکن سوما کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کچھ نہیں دیکھ رہی تھیں، اُس کا بے حس دماغ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔

برکت نے سوما سے کہا تھا کہ وہ دونوں بمبئی جا رہے تھے۔ سوما نے سنا تھا کہ بمبئی بہت دور تھا۔ کتنی دور، وہ نہیں جانتی تھی۔ جتنی بھی دور ہو۔ اُس کی دوری اور نزدیکی سے کیا لینا تھا۔ اب اسے واپس ہی کب آنا تھا۔

گاڑی میں بہت بھیڑ تھی۔ دھکم دھکا۔ لگ بھگ دو سال پہلے سوما دھرم شالہ سے لاہور آئی تھی تو دوسری طرح کی گاڑی تھی۔ اسے منور رمانے سکنڈ کلاس میں اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔ سب لوگوں کے لیٹنے سونے کے لیے گدّے تھے۔ کوئی کسی کو دھکا نہ دیتا تھا۔ بھلمنساہٹ تھی۔ اِس گاڑی میں دھکّے ہی دھکّے تھے۔ جھگڑا تھا۔ برکت نے اسے بالکل ایک کونے میں لکڑی کی بنچ پر کپڑا ڈال کر بٹھا دیا تھا اور ساتھ ہی خود بیٹھ گیا تھا۔ سوما اس سے چھو نہ جانے کے خیال سے سمٹی بیٹھی رہی۔ برکت نے اپنے بائیں طرف دھکے دے دے کر کچھ جگہ بنالی تھی۔ اُس نے سوما سے لیٹ جانے کے لیے کہا۔ سوما گھٹنے سمیٹے لیٹ گئی۔ برکت خود بیٹھا رہا۔ نئے مسافر آتے اور دھکے دے کر بیٹھنا چاہتے۔ برکت آستین چڑھا کر لڑنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ "دیکھتے نہیں ہو زنانی ہے۔" سوما برکت کی حفاظت میں جا رہی تھی۔ برکت اسے لے جا رہا تھا۔

دن شروع ہو چکا تھا۔ کوئی بہت بڑا اسٹیشن تھا۔ برکت نے بتایا دلی ہے۔ سوما نے کچھ بھی دھیان نہ دیا، جو بھی ہو، بھیڑ چڑھی چلی آ رہی تھی۔ برکت چوکس تھا کہ کوئی سوما کی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر اُسے پریشان نہ کرے۔ اِن بارہ گھنٹوں میں سوما اپنی جگہ سے ہلی نہ تھی۔ برکت نے پوچھا "کچھ کھاؤ گی؟" سوما کو کچھ کھائے پیے بغیر دو دن رات ہو چکے تھے۔ پھر بھی اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ برکت نے اُس کے کان میں پیار سے سمجھایا۔ "کیا پاگل ہو۔ آدمی کیا کھائے پیے بغیر زندہ رہ سکتا ہے! ہاتھ منھ دھوؤ گی؟"

سوما مان گئی۔ برکت ٹونٹی دار لوٹا ساتھ لایا تھا۔ وہ پلیٹ فارم سے پانی لے آیا مگر اس لوٹے کو دیکھ ہی سوما کا دل بھٹک گیا۔ یاد آیا کہ مسلمان کے ہاتھ بک جانے کے خیال سے اُس کی جان نکلنے لگی تھی۔ اب وہ مسلمان ہی کے ہاتھ تھامے پناہ کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اب اس کے لوٹے سے کیا پرہیز کرتی؟"

سوما نے گاڑی کی کھڑکی سے باہر سر نکال کر ہاتھ منھ دھو لیا۔ لیکن اس لوٹے سے کلی نہ کر سکی۔ برکت اُس کے لیے مٹی کے کلھڑ میں چائے لے آیا۔ مسلمان کا چھوا کلھڑ تھا۔ دل میں بہت بُرا لگا۔ لیکن چائے پی لی۔ پچھیرا میں اُسے مسلمان سے بڑی نفرت اور گھن تھی، اور ڈر بھی لگتا تھا۔ اُس نے مسلمانوں کو گوجروں کی شکل میں دیکھا تھا۔ سنا تھا انھیں چھو لینے سے دھرم خراب ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بُرے کام کرتے ہیں۔ لیکن لاہور میں صاحب کی کوٹھی پر اُن کے کئی مسلمان دوست آئے تھے۔ اُن سے کوئی پرہیز نہ کیا جاتا تھا۔ وہ گھر کے برتنوں میں کھا پی جاتے تھے۔ صرف ماں جی اور بھابی کو یہ اچھا نہ لگتا تھا۔ سوما بھیڑ میں دبی، ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ اور اسٹیشن گزر گئے۔ برکت نے ایک ہندو پوری والے کو بلا لیا۔ سوما نے پوری کھائی۔ پھر ٹونٹی والے لوٹے کا پانی۔ اُس کا گلا سوکھ رہا تھا۔ دل نے کہا۔ میرا کیا بگڑ جائے گا! ہاری ہوئی سی بے پروائی کے ساتھ سوما نے پانی پی لیا۔

گاڑی کا ڈبہ لوہے کی پٹریوں پر تیزی سے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کھیت۔ گاؤں، جنگل، پہاڑ، اُلٹی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ سوما نے ایک بار بھی نہ پوچھا کہ بمبئی کب پہنچیں گے۔ بمبئی کتنی دور ہے؟ وہ لکڑی کے خالی تختے پر بیٹھی رہی۔ پھر رات آئی۔ سوما گھٹنے سمیٹ کر گہری نیند میں سو گئی۔ پھر دن چڑھا۔ لکڑی کا ڈبہ چلتا ہی جا رہا تھا۔ اب سوما کا دل کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ سوچنے لگی۔ یہ کیا کرے گی؟ جواب سیدھا تھا۔ جو کچھ کرنا پڑے گا، کرے گی۔ برکت اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کا اتنے نزدیک بیٹھنا سوما کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن دنیا میں اور سب آدمیوں میں وہی اُس کا جانا پہچانا تھا۔ دنیا کے خوف اور اس کے درمیان وہی تو ایک آڑ اور لگاؤ تھا۔

برکت لاہور میں جیسا چھچھورپن کرتا تھا۔ ویسی کوئی بات گاڑی میں اُس نے نہیں کی۔ سوما سے صرف ضرورت کی ہی بات پوچھتا تھا۔ کبھی کھڑکی سے سر نکال کر ریل کی تال پر گنگنانے لگتا۔ اور کبھی بالکل گمبھیر بیٹھا رہتا۔ شاید وہ بھی سوچ رہا تھا۔ بمبئی پہنچ کر کیا کرنا ہوگا۔؟

پچھیرا سے دھرم شالہ آنے پر آدمیوں کی بھیڑ دیکھ کر سوما کو حیرت ہوئی تھی۔ لاہور میں وہ حیرت خوف سے بدل گئی۔ بمبئی میں وکٹوریہ گاڑی پر چڑھ کر بازاروں سے گزرتے وقت دونوں طرف بہت اونچے اونچے مکان، بھیڑ سے بھری سڑک، گلیاں اور طرح طرح کے مرد اور عورتوں کو دیکھ کر اُس کے سوچنے کی طاقت بڑھ گئی تھی۔ اِس جمگھٹ میں وہ صرف برکت کو پہچانتی تھی۔ بھیڑ کے دھکوں میں کھو جانے کے ڈر سے وہ اس کے گھناؤنے ہاتھ کو پکڑے نہ رہتی تو کیا کرتی؟

برکت نے سوما کو نل بازار کے پاس ایک چھوٹے سے ہندو ہوٹل میں ٹھہرا دیا تھا۔ سمجھا دیا تھا کہ اپنے آپ کو برکت رام کی بی بی بتائے اور کہے کہ بیماری کے علاج کے لیے پنجاب سے آئے ہیں۔ اُسے چوری چکاری کے خطرے سے ہوشیار کر کے برکت رہنے کے لیے جگہ کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔ دو راتیں سوما کو ہوٹل کے تنگ کمرے میں گزارنی پڑیں۔ برکت دن میں دو بار گھنٹہ گھنٹہ بھر کے لیے آتا اور رات میں کافی دیر سے آتا۔ سوما انتظار کر رہی تھی۔ کیا ہوگا۔ برکت اس کے لیے سستے داموں کی تین چمکیلی ساڑیاں لے آیا تھا۔ اُس نے رات میں بیٹھ کر سوما کو سمجھایا کہ وہ سوما کے لیے سینما کی نوکری ڈھونڈ رہا تھا۔ ایسی نوکری مل جائے گی تو سینکڑوں روپے تنخواہ ملے گی۔ کوٹھی، بنگلہ، موٹر گاڑی، نوکر چاکر، سب کچھ میسّر آجائے گا۔ برکت دلاسا دیتا۔ "گھبراؤ مت، دو چار ہی دنوں کی بات ہے۔ وہ سوما سے اخلاق سے پیش آتا تھا اور اُس کی خاطر داری میں لگا رہتا تھا۔

برکت پہلے بھی بمبئی میں تین برس رہ چکا تھا۔ شہر سے اچھی طرح واقف تھا۔

برکت نے اسکول میں پڑھتے وقت ہی طے کر لیا تھا کہ ایکٹر بنے گا۔ اسے یقین تھا کہ ایکٹروں کی سب خوبیاں، خوب صورت چہرہ، اچھا ڈیل ڈول، چستی پھرتی، ادا اور لیاقت۔ سب اس میں موجود تھے۔ جب وہ سینما کے گانے ہو بہو انھیں طرزوں میں گاتا تھا تو لڑکے اس پر فدا ہو جاتے تھے۔ گھر پر جب وہ اپنی کوٹھری میں گانے لگتا تو پڑوس کی لڑکیاں اور عورتیں کھڑکیوں کی اوٹ سے سننے لگتی تھیں۔ اس نے ایکٹروں کی شکل بنانے کے لیے سر پر بال بھی بڑھا لیے تھے۔ قلمیں لمبی لمبی کنپٹیوں سے نیچے اُتری ہوئی کٹوا لیتا تھا۔ مونچھیں اُس وقت جتنی کچھ نکلی تھیں، اوپر سے صاف کر کے ہونٹوں کے کنارے پر باریک سی لکیر سی بنا لیتا تھا۔ اُس نے محرم کے زمانے میں کالے کپڑے کی قمیص سلوائی تھی۔ اس قمیص کو موقع موقع سے سفید پتلون کے ساتھ پہن لیتا تھا۔ بدن اس کا یوں بھی اچھا تھا۔ اس پر کندھے ذرا پیچھے کھینچ کر چلتا تھا۔ سیر سپاٹے کے وقت کلائی پر رومال باندھ لیتا اور ہاتھ بھر کا ایک ڈنڈا ہاتھ میں لیے رہتا۔ بات کرتے وقت گردن ذرا ترچھی ہو جاتی تھی اور سر کو ہلکا جھٹکا دے کر زلفیں ماتھے پر بکھیر لیتا تھا۔

برکت کا باپ بجلی گھر میں دفتری تھا۔ ترقی ہوتے ہوتے گزارے کے لائق تنخواہ پینتالیس روپے ماہوار ملنے لگی تھی۔ اسے امید تھی کہ لڑکا قاعدے سے انٹرنس پاس کرے گا تو مہرباں

افسروں کی مہربانی سے اُسے بھی اچھی نوکری مل جائے گی۔

برکت کے بدن کی اُٹھان اور شکل اچھی ہونے کی وجہ سے اُس کا بیاہ اُس وقت ہی ہو گیا تھا جب وہ آٹھویں درجے میں تھا۔ اس بیاہ سے برکت مطمئن نہیں تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اس کی شادی فلمی شادی کی طرح ہونی چاہیے تھی۔ وہ لڑکی کو موٹر سائیکل پر لے کر پھٹ پھٹ کرتا ہوا بھاگ جاتا۔ لوگ پیچھا کرتے، مار پیٹ ہوتی۔ لکھ پتی کی بیٹی اس کے سوا کسی سے بیاہ کرنے سے انکار کر دیتی۔ تب لکھ پتی ایک کوٹھی جہیز میں دے کر اس سے بیاہ کر دیتا۔

برکت کا بیاہ خود اس کی پسند سے نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت برکت انیس برس کا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بہن اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ ماں کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ برکت کی بہن زہرا گھر کا کام سنبھالتی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں زہرا سسرال چلی گئی۔ گھر کا کام سنبھالنے کے لیے برکت کی ماں کو بہو گھر میں لانے کی فکر نے پریشان کر دیا۔ بہو اس نے ایسی چنی جو گھر کا کام سنبھال سکے۔

سکینہ کا باپ امجد علی چار برس پہلے روٹی کمانے کے لیے افریقہ چلا گیا تھا۔ گاؤں لوٹ کر اُس نے دیکھا۔ لڑکی ماں سے اونچا سر نکالے ہوئے تھی۔ بیٹی کے بارے میں بہت سی باتیں بھی سنیں۔ اُسے لڑکی کے بیاہ کی جلدی تھی۔ امجد کو امرتسر میں اپنے سالے کے چچیرے بھائی میاں لیاقت کا لڑکا برکت پسند آ گیا۔ شادی ہو گئی۔ امجد نے اپنی بدیس کی کمائی سے بیٹی کو اچھا جہیز بھی دیا۔

برکت پہلی رات سکینہ سے ملا تو اُس کے دل میں کئی ارمان اور پروگرام تھے۔ سکینہ سست اور اُداس تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے چھیڑا نہ جائے۔ چھلکتی جوانی سے بھری لڑکی کو پہلی بار پا کر برکت کے لیے دل مارے بیٹھے رہنا اُس کے سارے ارمانوں کا خون ہوتا۔ اُس نے سینما کے ہیروؤں سے اپنے اختیار کا استعمال کرنا چاہا۔ وہ سکینہ کو چٹکی کاٹ کر مسکرا رہا تھا کہ سکینہ کے انگوٹھیاں بھرے اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ اُس کے گال پر پڑا اور ساتھ ہی دبے لہجے میں گالی بھی سنائی دی۔

برکت اور سکینہ دونوں ہی جوان تھے۔ سکینہ دیہات کی سترہ برس کی لڑکی اور برکت شہر کا انیس برس کا نوجوان تھا۔ پھر بھی برکت مرد تھا اور سکینہ عورت۔ برکت نے اسے گالیاں دے کر خوب پیٹا۔ سکینہ نے بھی دبی آواز میں گالیوں اور لاتوں سے جواب دیا۔ برکت کے گال کی ہڈی پر انگوٹھے کی چوٹ سے نشان بن گیا۔ جسے وہ کئی دن تک پگڑی باندھ کر شملے سے ڈھانکے رہا۔ ساتھیوں کو اس نے کہانی گڑھ کر سنا دی کہ اندھیرے میں ایک انجانے بدمعاش سے اُس کی مار پیٹ ہو گئی تھی۔

برکت کا دل سکینہ سے پھٹ گیا تھا۔ اُس نے اپنے دل میں سمجھ لیا تھا کہ حرام زادی، بدچلن ہے۔ اُسے قتل کرنے کی ٹھان لی۔ پھر سوچا ایک اور بیوی اوپر سے لاکر بٹھا دے گا۔ اور سکینہ کو ساری عمر باندی بنا کر رکھے گا۔ برکت کے دل میں جو مٹھاس اور رنگینی تھی وہ ختم ہوگئی۔ وہ عورتوں کے بارے میں شکّی ہوگیا۔ اُس کے خیال میں عورت سے کھیلنا سانپ سے کھیلنا تھا۔ عورت کو چھونے سے زیادہ اسے دور ہی سے پچکارنے ٹچکارنے میں ہی اسے زیادہ لطف آتا تھا۔

۱۹۳۹ء میں برکت کے والد کا انتقال ہوگیا۔ انٹرنس پاس کرنے میں ابھی ایک برس باقی تھا۔ اسکول کے ماسٹروں کو جیسے اُس سے دشمنی تھی۔ برکت کو پاس ہو جانے کی اُمید نہ تھی کیوں کہ پاس ہوکر منشی جی بن جانے، اور دن بھر دفتر میں گزار کر شام کو رومال میں ترکاری باندھے، سر لٹکائے، ٹاٹ کے پردے سے ڈھکے دروازے پر لوٹنے کی زندگی برکت کو منظور نہ تھی۔

وہ منشی جی بننے کے لیے نہیں، بلکہ فلمی دنیا میں مجنوں اور دیوداس بننے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ وہ فلسفی کی طرح سوچتا تھا۔ ایکٹر دنیا میں شہنشاہی کا مزا بھی اُٹھا سکتا ہے اور گھسیارے کا بھی۔ ایک زندگی میں بیسیوں زندگی کے گیان۔ دنیا کو ساتھ اُٹھا کر تو کوئی نہیں لے جائے گا۔ جو کھا، پی، پہن اوڑھ لیں گے مزا کرلیں گے، وہی اپنا ہے۔ مرنے کے بعد سو حویلیاں بھی چھوڑ گئے تو کس کام کی؟ بڑھیا سے بڑھیا مکان، حسین عورتیں، پوشاکیں ایکٹر کے لیے ہیں۔ کتنی حسین اور کم سن عورتوں سے وہ بغل گیر ہوتا ہے۔ ایکٹر کی ادائیں کتنی پردہ پوش رانیوں اور بنگلوں میں رہنے والی میم صاحباؤں کے دل چرا لیتی ہیں۔ زندگی کے کتنے دَور ایک ساتھ، بھرپور اور تیز......!

برکت کو لگ بھگ سارے مشہور اور کامیاب ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے نام یاد رہتے تھے اور اُن کی آمدنی کے بارے میں افواہیں بھی سن رکھی تھیں۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اُڑ کر بمبئی جائے۔ پھر وہ ہوگا اور سینما کی دنیا!

برکت کا سب سے گہرا اور قابل بھروسہ دوست ریلوے کے مستری میاں نصرالدین کا بیٹا جمیل تھا۔ برکت نے اپنے سنہرے خواب جمیل کو سنائے تھے۔ جمیل بھی اس خوابوں کی دُنیا میں پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ اُس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ برکت نے ماں کی خوشامد کر کے، ہزاروں روپے کما کر گھر بھیجنے کا وعدہ کرکے، رُوٹھ کر اور گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی دے کر ایک سو پانچ روپے وصول کرلیے تھے۔ اپنی بیوی کے کچھ زیور بھی ہتھیا لیے تھے اور جمیل کے ساتھ بمبئی چلا گیا تھا۔ دونوں ملاڈ، سانتا کروز اور دادر کے فلم اسٹوڈیو کے چکّر لگاتے رہے۔ لیکن اسٹوڈیو کے پھاٹک

اور گورکھا دربان بہشت کے داروغہ رضوان سے بھی زیادہ چوکس اور بے مروت تھے۔ اپنا سارا روپیہ ختم کر کے بعد بھی وہ لوگ اسٹوڈیو میں پاؤں نہ رکھ سکے۔ مگر دونوں نوجوان اپنی ریاضت میں ثابت قدم رہے۔ آخر انھیں اندر جانے کا موقع مل گیا۔ دونوں کو سینما کے ریستوران میں جگہ مل گئی تھی۔ مہینوں وھسکی سوڈے کے گلاس اور چائے کی پیالیاں اور طشتریاں دھوتے رہنے کے بعد ان کی سمجھ میں آیا کہ ابھی لوگوں کی نظر میں ان کی عمر کم تھی اور سینما کی دنیا کا فرشتہ بننے کے لیے ایک حور کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ سینما کی دنیا میں حوروں کی قیمت فرشتوں سے کہیں اونچی ہوتی ہے۔

سینما کمپنی کے مالک کی گاڑی کا ڈرائیور مرید خان پنجابی راجپوت مسلمان تھا۔ اُس نے ایک دن برکت اور جمیل کو بہت پھٹکارا۔ "پٹھان کے بیٹے ہوکر یہاں بھڑوے اور رنڈیوں کے جوٹھن دھوتے ہو!" اُس نے دونوں کو ایک موٹر مرمّت کے کارخانے میں نوکر رکھوا دیا۔ جمیل تو مستری کا کام سیکھنے لگا۔ لیکن برکت کو وہ کام پسند نہ آیا۔ کچھ دن اس نے کارخانے میں مزدوری کی اور ایک ٹیکسی والے کا کلینر بن کر اُس نے ڈرائیوری سیکھ لی۔ برکت کو بس کمپنی میں نوکری مل گئی تھی۔ لیکن اس سے نبھ نہ سکی۔

برکت کو ٹیکسی چلانا پسند تھا۔ آزادی رہتی اور دوستوں میں بیٹھ کر شیخی مارتا۔ "یار آج ایک دل پھینک لیڈی سواری مل گئی تھی۔ اتنی فدا ہوگئی تھی کہ ٹیکسی سے اُترنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ کرایہ دینے لگی تو ہم نے آنکھ مار کر مسکرا دیا۔ دس کے دو نوٹ دے گئی۔ اپنے بنگلے پر آنے کو کہہ گئی ہے! ......" ایسی کہانی سنا کر اسے سچ مچ ایسا سکھ پانے کی سی خوشی ہوتی۔ وہ سینما سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے یہاں بھی چکر لگاتا رہتا اور فلم اسٹاروں سے تو اکثر ٹیکسی کا کرایہ بھی نہ لیتا تھا۔

برکت بیمار ہوجانے کی وجہ سے گھر لوٹ آیا تھا۔ گھر کی حالت اچھی نہ تھی۔ ایک بھائی مل میں گیٹ کیپر کی نوکری کر رہا تھا۔ چھوٹا بھائی ایک رشتہ دار کے کرگھوں کے کارخانے میں پندرہ روپے پاتا تھا اور کام سیکھ رہا تھا۔ ماں پہلے سے زیادہ بیمار تھی۔ اس کی بیوی کی وجہ سے کافی جھگڑا تھا۔ سکینہ کے ماں باپ کہتے تھے۔ "داماد بدچلن اور بُرا ہے۔ لڑکی کو سسرال والے تنگ کرتے ہیں"۔ سکینہ اپنے چچیرے بھائی کے بیاہ میں اپنے گاؤں گئی تو پھر واپس نہیں آئی۔ افواہ تھی کہ بڑے چچیرے بھائی نے اسے چادر ڈال کر گھر میں لالیا تھا۔ اور کہتا تھا۔ جسے ہمت ہو لے جائے!

برکت کو امرتسر میں رہنا اچھا نہ لگا۔ لاہور جا کر نوکری کی تلاش میں اُس نے بیرسٹر سرولا کو کئی سرٹیفکٹ دکھائے اور انھوں نے اسے ڈرائیور رکھ لیا۔ برکت کا بمبئی واپس جا کر سینما میں کام کرنے کا ارمان دل ہی میں رہ گیا تھا۔

ہوٹل میں دو دن رہ کر برکت سوما کو ماہم لے گیا۔ جمیل نے اسے پڑوس کی خالی کھولی (کوٹھری) دلا دی تھی۔ اور راشن کارڈ بھی بنوا دیا تھا۔ لڑائی کے دن تھے۔ بمبئی میں راشن کارڈ کے بغیر آٹا دال نہیں مل سکتا تھا۔ محلے میں کئی تین منزلہ چالیں (عمارتیں) آمنے سامنے اور ایک جیسی بنی ہوئی تھیں۔ نیچے کی منزلوں میں عام طور پر ناگرہ جوتی بنانے والے جلسلیری موچی رہتے تھے۔ ایک ایک کھولی میں کئی کئی خاندان آباد تھے۔ جب تک سورج کی روشنی رہتی، موچی اور موچنیں برآمدے میں بیٹھ کر جوتیاں سیتے رہتے۔ شام کے وقت مرد جوتیاں بیچنے چلے جاتے اور عورتیں نہانے، دھونے اور پکانے میں لگ جاتیں۔ ایک ایک کھولی میں دو دو تین تین چولھے جلتے تھے۔ پوری چال دھوئیں سے کالی تھی۔ نہانے دھونے اور برتن مانجھنے میں پانی بہنے سے چال کے سامنے کیچڑ بھی رہتی تھی۔ ہر منزل میں ساجھے کے غسل خانے اور سنڈاس تھے۔ سامنے موچیوں کے کپڑے جانوروں کی کھالوں کی طرح اور موچنوں کے بڑے بڑے لال کالے لہنگے بڑی بڑی چھتریوں کی طرح سوکھتے رہتے تھے۔ ان کپڑوں اور چمڑے کی بُو سے چال مہکتی رہتی تھی۔

چالوں کی اوپر کی منزلوں میں موچیوں سے اچھی مالی اور سماجی حیثیت کے، کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، غریب کلرک اور ڈرائیور وغیرہ رہتے تھے۔ ان کھولیوں میں بھی کئی آدمی اور خاندان ایک ساتھ رہتے تھے۔ وہیں آدمی پیدا ہوتے رہتے، بیمار اور بوڑھے پیدا ہونے والوں کے لیے جگہ چھوڑ کر مرتے رہتے۔

جمیل برکت کے رہنے کے لیے تین کنبوں والی کھولی میں رہنے کا انتظام سستے داموں میں کر سکتا تھا۔ لیکن برکت نے سوما کی سہولت اور آرام کے خیال سے زیادہ کرایہ دے کر پوری کھولی لے لی۔

سوما ماہم کی اس کھولی میں آکر بہت گھبرا گئی۔ پہلے دن تو برکت نے نل سے پانی اور قریب کی دوکان سے راشن لا کر دے دیا لیکن ہر روز یہ کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ برکت نے سمجھایا۔ "آٹا، دال، چاول، چینی لینے کے لیے بنیے کی دوکان کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ میں کام کی تلاش میں جاؤں یا بنیے کی دوکان کے سامنے کیو میں کھڑا رہوں۔ پڑوس میں ہی تو

دوکان ہے۔ عورتوں کو سامان جلدی مل جاتا ہے۔ تم ہی لے آیا کرو۔"

لاہور میں سوما گھر کی رسد لانے موٹر میں جایا کرتی تھی۔ بمبئی میں ماہم کی دوکان کے سامنے فرلانگ فرلانگ لمبے کیو، لگتے تھے۔ ایک ایک قدم سرکتے سرکتے سوما کو گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ دل میں سوچتی، اس راشن سے تو آدمی مہنگا خرید لے۔ یا کھائے بغیر رہ جائے۔ کھانا تیار کر کے وہ برکت کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ برکت آ کر اطمینان دلاتا۔ "گھبراؤ مت، میں جلد ہی تمہارے لیے سینما میں کام کا انتظام کر لوں گا۔ میں لوگوں سے ملاقات کر رہا ہوں۔"

پڑوس کی کھولیوں کی عورتوں نے سوما سے بات کرنی چاہی۔ انھوں نے سوما کو اپنے یہاں بیٹھنے اور بات کرنے کے لیے بلایا۔ لیکن وہ ان کے یہاں پل بھر سے زیادہ کے لیے نہیں گئی۔ بائیں طرف کی کوٹھری کے لوگ دکھن کے تھے۔ سوما ان کی زبان بھی نہ سمجھتی تھی۔ دائیں طرف کے لوگ ہندوستانی بولتے تھے۔ سوما ان کی بات کچھ کچھ سمجھ پاتی تھی۔ ان لوگوں کے پوچھنے پر اُس نے بتا دیا کہ وہ پنجابی ہے۔ اس کا آدمی ڈرائیور ہے۔ کام کی تلاش میں ہے۔ پڑوسیوں نے بھی اسے اکیلے ہی کھولی لے کر رہنے کی وجہ سے پیسے کا غرور دکھانے والی سمجھ کر زیادہ بات نہیں کی۔

سوما سوچتی تھی۔ سینما میں کام کیسے کر سکوں گی؟ بیرسٹر جگدیش کے لیے دل میں نفرت ہو جانے پر بھی اس کا دلایا ہوا اپنے خوب صورت ہونے کا یقین موجود تھا۔ اسے اپنے گلے کی مٹھاس پر بھروسہ تھا۔ لیکن شک تھا کہ وہ ایسے کام سب کے سامنے بھی کر سکے گی؟ سینما اُس نے کئی بار دیکھا تھا جو اچھا بھی لگا تھا لیکن سب لوگوں کے سامنے جانا، گانا اُسے شرم ناک اور توہین آمیز معلوم ہوتا تھا۔ سوما چاہتی تھی، برکت کمائے اور وہ گھر سنبھالے لیکن برکت سے یہ بات کس حق سے کہتی؟

ماہم کی چال میں آجانے کے بعد برکت سوما سے جھجک ختم کر کے اختیار اور دعوے کے ساتھ بات کرنے لگا تھا۔ دل بہلانے کے لیے چھیڑ چھاڑ بھی کرتا تھا۔ وہ چپ رہ جاتی۔ برکت کو سوما کی وہ تصویر بھی یاد آجاتی، جب لاہور میں ہمت کر کے برکت نے مذاق کیا تھا۔ "حضور غریبوں پر بھی کچھ نظر عنایت ہو جائے" اور سوما نے ماتھے پر بل ڈال کر اُسے ڈانٹ دیا تھا۔ "کیا کہتا ہے! تمھیں جو کچھ بولنا ہے صاحب سے بولو!" برکت اب بھی سوما کی خاموشی سے ڈر جاتا، کہیں ڈانٹ نہ دے۔

سوما نہ جھنجھلاتی نہ مسکراتی۔ چائے یا کھانا تیار کرنے کے بہانے کترا جاتی۔ کسی بات کے لیے

برکت کو مخاطب کرنے کی ضرورت ہوتی تو لجاجت سے 'بھائی' کہہ کر بات کرتی۔ جھنجلانے یا انکار کرنے کی حالت سوما کی نہیں رہ گئی تھی۔ خود ہی سب کچھ قبول کرکے برکت کے ساتھ اس کی پناہ میں آئی تھی۔ وہ ہر طرح اُس کے رحم کی محتاج تھی۔ برکت ہی اس کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔ برکت کے سامنے کس منھ سے اکڑتی یا انکار کرتی۔ مرد عورت کو اپنی ہی تسکین کے لیے تو پالتا اور سہتا ہے۔ صرف ایک طریقہ سوما کے پاس تھا۔ برکت کو بھائی کہہ کر اُس کے دل میں کسی بدلے کی خواہش کے بغیر ہمدردی کا جذبہ جگاتی رہے۔ سوما کام کاج کی بات کرنے لگتی۔ "بھائی سینما کا کام مجھ سے کیسے ہوگا؟ مجھ میں اتنی عقل کہاں ہے؟ بھائی تم دن بھر پریشان پھرتے پھرتے تھک جاتے ہو۔ مجھے کسی کے گھر کے کام کاج کی نوکری ہی دلا دو۔ بھائی یہ تو بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں مجھیں اچھی نوکری مل سکے گی۔"

برکت رات کو واپس آتا تو شراب پیے ہوئے ہوتا تھا۔ اس شراب کی بدبو سے سوما کا دل متلانے لگتا۔ بیرسٹر کبھی کبھی پیتا تھا تو اس شراب سے ویسی بو نہیں آتی تھی۔ کئی بار تو وہ سوما کو بھی اپنے گلاس سے گھونٹ بھر لینے کے لیے بے بس کر دیتا تھا۔ پی کر وہ کیسی باتیں اور حرکتیں کرتا تھا۔ اُس وقت اُس سے مستی کی خوشی برستی تھی۔ سوما کو اب وہ یاد بہت تلخ اور توہین آمیز معلوم ہوتی تھی۔ سوچتی، پھر کیا وہی سب کچھ ہونے کو ہے۔ اب تو پتنگ کٹ کر نیچے گلی میں گر چکی ہے۔ اور کیا کرے گی؟ پتنگ کتنی اونچی چڑھ گئی تھی ......

سوما برکت کو کھلاتی پھر خود کھا کر برتن مانجھنے بیٹھ جاتی۔ اتنے میں برکت سو جاتا۔ سوما بتّی بجھا کر اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑی رہتی۔ ایسے کب تک نبھے گا؟ برکت کو سوما کے لیے اسٹوڈیو میں جگہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تین ہفتے بیت گئے۔ وہ جمیل سے بھی چالیس روپے اُدھار لے کر کھا چکا تھا۔ وہ جہاں جاتا کورا جواب مل جاتا۔ "اکسٹرا ایجنسی سے بات کرو۔"

بنواری برکت کا پُرانا ملاقاتی تھا۔ اس وقت سے جب بنواری نے اپنی مصیبت میں 'اکسٹرا ایجنسی' کے معرفت کام کیا تھا۔ برکت اس پر ہنستا تھا۔ "سالے ہم پارٹ کریں گے تو اپنے بوتے پر۔"

بنواری اب "دار فیض" کمپنی میں ڈائیلاگ لکھنے کا کام کرنے لگا تھا۔ برکت کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنا پڑھا لکھا تھا۔ برکت نے سوما کے حُسن اور صلاحیت کی تعریف کرکے کہا۔ "دوست ایک گوہر لے آیا ہوں پنجاب کے پہاڑوں سے! اسے اسٹوڈیو میں کہیں جگہ دلا دو۔"

بنواری نے جواب دیا۔ "بھائی ایجنسی سے کہو۔ ورنہ ایجنسی والا بگڑ جائے گا۔ آج اکیلا تم لاؤ گے تو کل پچیس کی ضرورت ہوگی تو کون لائے گا؟ یہ دردِ سر کون مول لے بھیّا!"

برکت اکسٹرا ایجنسی والوں سے گھبراتا تھا۔ جوان کے چکر میں آیا، عمر بھر اکسٹرا رہا۔ سالے خون پیتے ہیں۔ کمپنی سے دس روپے عورت کے لیں گے تو غریب کو پانچ تھما دیں گے۔ عورت پر ایک بار ان کی مہر لگ گئی تو کوئی کمپنی براہِ راست اسے اپنی کمپنی میں نہیں لے گی۔ سالے اچھا ناچنے والیوں کو دس پندرہ روپے میں ٹرکاتے ہیں۔ سوما تو ابھی کچھ جانتی نہیں۔ مصیبت ہے کہ یہ سالے اسٹوڈیو کا دروازہ گھیرے رہتے ہیں۔ کمیشن لیے بغیر کسی کو اندر نہیں گھسنے دیتے۔ کوئی ڈائریکٹر یا زور دار آدمی ہی کسی کو جگہ دلا سکتا ہے۔

برکت مایوس ہوکر دار فیض اسٹوڈیو کے ریسٹوران والے جیوا جی بھائی کے یہاں پہنچا۔ پانچ برس پہلے برکت نے اس کے یہاں برتن دھونے کا کام کیا تھا۔ اُس وقت اُس کا ریسٹوران بھی ایسا ہی ویسا تھا۔ اب جیوا جی بھائی کے اپنے دو مکان تھے۔ ایک ٹیکسی تھی۔ اسٹوڈیو میں ریسٹوران تو چلتا ہی تھا۔ اس کے ساتھ اب وہ اکسٹرا اسپلائی بھی کرتا تھا۔ برکت جیوا جی بھائی کو اپنا پُرانا تعلق نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مگر جیوا جی بھائی کی مردم شناس نظروں اور تحکّمانہ سوالوں کے سامنے وہ کچھ نہ چھپا سکا۔

جیوا بھائی نے پوچھا۔ "کہاں سے لائے ہو؟"

برکت نے خوش ہوکر جواب دیا۔ "سیٹھ پنجاب کے پہاڑوں کا گوہر ہے۔ دیکھو گے تو مان جاؤ گے۔"

"کتنی عمر ہے؟"

برکت نے گھٹا کر بتایا۔ "ہوگی انیس بیس برس!"

"کیا کچھ جانتی ہے؟"

"آپ دیکھیے تو اُسے، سب جان جائے گی۔"

"اچھا دیکھیں گے۔" جیوا جی نے پتہ پوچھ لیا۔ لیکن بے پروائی برت گیا۔

برکت جیوا بھائی کے یہاں دوپہر تک انتظار کر کے دوپہر بعد اُسے ماہم کی طرف لے چلنے میں کامیاب ہوا۔ اور شرماتا شرماتا اُسے اپنی کھولی میں لے گیا۔

سوما کو اُس نے بتایا۔ "یہ ہمارے ملنے والے سیٹھ جی ہیں۔"

سوما ایک طرف سمٹی بیٹھی رہی۔ جیوا بھائی کنکھیوں سے اُس کے چہرے اور بدن کو بھانپتا رہا۔ لوٹتے وقت برکت نے جیوا بھائی کو یقین دلایا۔ "یہ کوٹھیوں اور صاحب لوگوں میں رہی ہے۔ ابھی سہمی ہوئی ہے۔ موقع آنے پر کھلے گی تو دیکھو گے! اسٹیج پر روشن، مدھو اور چندرا کو پھیکا نہ کر دے تو پیشاب سے مونچھ منڈ والوں۔"

جیوا بھائی نے برکت کو بھائی چارے کے انداز سے گاڑی میں بٹھالیا اور ایک سگریٹ دے کر سمجھایا۔ "دیکھو میاں! لادی کی گھوڑی ریس میں نہیں دوڑ سکتی۔ یہ عورت اسٹوڈیو میں بھیڑ بنانے کے سوا اور کیا کرے گی؟ کچھ جانتی نہیں۔ دو برس اس کو سکھانے میں لگیں گے۔ تب تک تم اس سے کماؤ۔ پھر دوسری لے آنا۔ اسے اسٹوڈیو والے پانچ نہیں دس دے دیں گے۔ ہم تمھیں اس کے بیس پچیس دلا سکتے ہیں۔

برکت بہت مجبور ہو گیا تھا۔ اسے جیوا بھائی کی تجویز مان لینی پڑی۔ جیوا بھائی نے اسے 'کُھڑا پارسی' کے پاس ایک چال دکھا دی کہ رات دس بجے عورت کو یہاں لے آئے۔ دس روپے کا ایک نوٹ بھی برکت کے ہاتھ میں پیشگی دے دیا اور شام کے وقت گاڑی بھیجنے کا بھی یقین دلایا۔

برکت عام طور پر صبح جاتا اور آدھی رات تک واپس آتا تھا۔ اُس دن وہ سورج ڈوبنے کے وقت ہی آ گیا۔ بادامی کاغذ کی ایک تھیلی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ تھیلی سوما کو تھما کر اُس نے کہا۔ "کھانا جلدی کر لو۔ نو بجے ایک جگہ چلنا ہے۔ سیٹھ کی موٹر آئے گی۔ سینما کے کام کے لیے تمہیں دو چار آدمیوں سے ملانا ہے۔ وہ لوگ بڑے آدمی ہیں۔ بڑی مشکل سے یہ انتظام کیا ہے۔ بہت خوشامد کی ہے تو مانے ہیں۔ ان لوگوں سے ذرا خاطر اور سمجھ داری سے بات کرنا۔ سینما میں اچھی نوکری آسانی سے نہیں ملتی۔"

کاغذ کی تھیلی میں پاؤڈر اور سرخی تھی۔ دھرم شالہ میں اسے دھن سنگھ نے بھی پاؤڈر اور کریم لا کر دیا تھا۔ لاہور میں بھی وہ پاؤڈر اور کاجل لگانے لگی تھی۔ منورما اور دوسری عورتوں کو دیکھ کر سر کے بال بھی دوسرے ڈھنگ سے باندھنے لگی تھی۔ لیکن اس طریقے سے کہ دوسرے کو معلوم نہ ہو کہ اس نے بناؤ سنگار کیا تھا۔ رات میں صاحب کے پاس جاتے وقت وہ بندی بھی لگا لیتی تھی۔ بندی کو دیکھ کر صاحب کے چہرے پر کتنی خوشی پھیل جاتی تھی۔ آج اس کے لیے سنگار کی اتنی خاص چیز برکت اس ڈھنگ سے لایا تھا۔

سوما گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے بہت دیر تک کھوئی سی بیٹھی رہی۔ لگ بھگ نو بجے برکت نے یاد دلایا تو اُٹھ کر ساڑی بدلی۔ برکت کی لال چمکیلی ساڑیاں اُس نے گھر کے روزانہ استعمال کے لیے نکال لی تھیں اور لاہور سے جو سفید ساڑی پہن کر آئی تھی اُسے دھلوا کر ضرورت کے وقت کے لیے رکھ لیا تھا۔ بڑے آدمیوں کے سامنے جانے کے لیے وہی ساڑی مناسب سمجھ کر اُس نے پہن لی۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ لیکن دوسری راہ نہیں تھی۔ جیوا بھائی کی گاڑی آ گئی۔ برکت گاڑی میں اُس کے ساتھ بیٹھ کر اُسے عقل مندی سے سلوک کرنے کی نصیحت کرتا رہا۔

امیر، بڑے آدمیوں کے لائق بڑا سا مکان تھا۔ نوکر وردی پہنے ہوئے تھے۔ سیٹھ بھی دکھائی دیا۔ سیٹھ نے برکت سے پوچھا۔ "آ گئے؟" سیٹھ نے زینے کے پاس ایک بہت چھوٹے سے کمرے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "آئیے۔" سیٹھ اور ایک آدمی بھی ان کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔ سوما سمجھ نہ سکی۔ آدمی نے دیوار میں کچھ کیا۔ کمرے کا دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ اور ان لوگوں کے پاؤں کے نیچے فرش اُٹھنے لگا۔ چاروں طرف کی دیوار تیزی سے نیچے کی طرف سرکتی جا رہی تھی۔ سوما کے بغل میں کھڑا سیٹھ سگار پی رہا تھا۔ سوما گھبرا کر چیخنا چاہتی تھی کہ پنجرے جیسا کمرہ رُک گیا۔ سامنے برآمدہ دکھائی دیا۔ ساتھ کے آدمیوں نے دیوار کو چھوا۔ دروازہ کھٹاک سے کھُل گیا۔ سیٹھ نے باہر آنے کے لیے اشارہ کیا۔ "آئیے۔"

سیٹھ سوما کو ایک اچھے صوفہ کرسی لگے کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ یہ کیا چال ہے۔ یہاں سے تو نکل بھی نہیں سکتی تھی۔ زمین سے نہ جانے کتنا اوپر آ گئی تھی۔ پکارنے سے برکت سن نہیں سکتا تھا۔ یہ تو بیج ناتھ کے تھانے سے بھی بھیانک جگہ تھی۔ کمرے سے باہر ہنسنے اور بولنے کی آواز سنائی دی۔ کسی نے ذرا کواڑ دبا کر جھانکا اور پیچھے ہٹ گیا۔ دو منٹ بعد سیٹھوں جیسے کپڑے پہنے ایک نیا آدمی اندر آیا اور صوفے پر بالکل سٹ کر بیٹھ گیا۔ سوما گھبرا کر سرک گئی۔ اس سیٹھ نے اسے مخاطب کیا۔ "اے ایسا سرماتی ہو۔" اور مسکرا دیا۔

سیٹھ کے چہرے پر شراب کا بھاری پن اور سرخی دکھائی پڑتی تھی۔ سوما اس کی طرف دیکھ نہ سکی۔ لیکن سیٹھ کی سانس سے ولایتی شراب کی بو آ رہی تھی۔ سیٹھ نے اپنی بانہہ سوما کی کمر میں ڈالنے کے لیے اس کی پیٹھ کے پیچھے بڑھا دی۔ سوما ہاتھ بھر پرے سرک گئی۔ "ارے بات بھی نہیں کرے گی۔ ہم نے تو بہت تعریف سنی تھی!" سیٹھ مسکرا دیا۔

سوما نے سر جھکا لیا۔ وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ سیٹھ نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا ایک نوٹ

نکال کر سوما کی گود میں ڈال دیا۔ "بس اب تو ٹھیک ہے!"
سوما نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے ساڑی کے کھونٹ کے دھاگے بٹتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔
"میں نوکری کی بات کرنے کے لیے آئی تھی۔"
سیٹھ شاید سوما کی بات نہیں سمجھا۔ وہ جوش میں آکر سوما کے بدن سے آلگا اور شرارت سے سوما کا سینہ مسل دیا۔
سوما تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔
کمرے کے دروازے پر زور سے دھکے کی ایک آہٹ سنائی دی اور غصے میں بھری للکار۔ "ہم نے بھی پیسہ جمع! ہمارا پیسہ پھوکٹ کا ہے؟"
سیٹھ اٹھ کھڑا ہوا۔ سوما کے یکایک کھڑے ہونے سے نوٹ فرش پر گر گیا تھا۔ سیٹھ نے نوٹ اٹھالیا اور دروازے کے نزدیک جاکر بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"
"کون ہے کا بچّہ! باہر سے غصے سے بھری للکار سنائی دی۔ اس نمبر کا پیسہ ہم نے دیا۔ ہم سے پیسہ لیا کہ بالکل نیا شریف گھر کا عورت آیا ہے۔ بلاؤ اپنے سیٹھ کو سالا دھوکا کرتا ہے۔ ہمارا پیسہ پھوکٹ کا ہے۔؟"
سیٹھ نے کواڑ کی چٹخنی کھول دی۔ "چلو تم اپنا پیسہ وصول کرلو۔" کہہ کر سیٹھ باہر نکل گیا۔
باہر سے جھگڑے کی بات اونچی آواز میں اور بھی صاف سنائی دی۔ "ہم نے سب سے پہلے کا پیسہ دیا! اب کیا! ہمارے ساتھ دھوکا! سیٹھ کو بلاؤ۔"
سوما اندر کھڑی کانپ رہی تھی۔ اندر دروازے سے نوکر آیا۔ اُس نے سوما سے کہا۔
بائی اِدھر سے آؤ!"
نوکر سوما کو ایک غسل خانے کی راہ لے گیا اور ایک کمرے میں سے گزر کر سوما کو زینے سے نیچے لے چلا۔ سوما کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ زینہ ختم ہونے کو نہ آرہا تھا۔ نوکر نے سوما کو ایک چھوٹے سے اکیلے کمرے میں کرسی پر بٹھا دیا۔ اوپر سخت لڑائی چل رہی تھی۔ پیسہ ..... پہلے پھوکٹ ..... دھوکا ..... بے ایمانی وغیرہ الفاظ زور زور سے اور بار بار سنائی دے رہے تھے۔
سوما دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بے حس سی بیٹھی تھی۔ برکت کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ سوما سمجھ نہ سکی۔ وہ کیا بات کہہ رہا تھا۔ دوسرے شخص کی غصہ بھری آواز سنائی دی۔ "سالے تم ہم کو ٹھگتا ہے۔ تمہاری لاش سمندر میں پھنکوا دوں گا۔" سوما کی بے حسی کپکپی میں بدل گئی۔

نوکر نے آکر اُسے پکارا "چلو بائی۔"

سوما باہر نکلی تو برکت دکھائی دیا۔ برکت کے چہرے پر گھبراہٹ اور غصہ دونوں ہی تھے۔ اس کے ساتھ ایک انجان دُبلا پتلا آدمی کرتا دھوتی پہنے تھا۔ آدمی نے سوما کو غور سے دیکھا۔

برکت غصے میں دانت پیس کر سوما سے بولا۔ "چلو!"

برکت کے ساتھ کا آدمی بھی اُس کے ساتھ ہولیا۔ چند قدم چلنے کے بعد برکت نے گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔ "معلوم نہیں اب بس بھی ملے گی یا نہیں؟"

ساتھ کے آدمی نے جواب دیا۔ "بس اس وقت کیسے ملے گی۔ گیارہ کب کے بج گئے۔ عورت کا ساتھ ہے۔ یہ لو ٹیکسی کر لو۔ اچھا پھر ملنا۔"

لڑائی کا زمانہ ۱۹۴۴ء کا سال تھا۔ دشمن کے ہوائی جہاز رات میں زمین پر روشنی دیکھ کر بم نہ گرا جائیں۔ اس لیے بمبئی میں بلیک آؤٹ رہتا تھا۔ سڑکوں پر سے بجلی کی بتیاں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوکانوں میں بھی ڈھکی ہوئی دھندلی روشنی رہتی تھی۔ رات میں سڑکوں پر روشنی نہ ہونے کی وجہ سے لوگ باگ بھی بہت کم نکلتے تھے۔ موٹریں بھی اپنی لائٹ پر کاغذ لگا کر روشنی دھندلی کئے رہتی تھیں۔ برکت سوما کو لیے سونی اندھیری سڑک پر ٹیکسی کی تلاش میں آگے بڑھتا جا رہا تھا اور دانت پیس پیس کر دبے لہجے میں دھمکا رہا تھا۔ "گھر چل تجھے ٹھیک کرتا ہوں۔" اندھیرے میں برکت کی یہ دھمکی سوما کو بجلی سے جگمگاتے صوفے سے سجے کمرے میں سیٹھ کے پیار کے مقابلے میں کم بھیانک لگ رہی تھی۔

برکت کو کچھ دور جا کر ٹیکسی مل گئی۔ گاڑی میں سوما آنکھیں بند کیے چپ بیٹھی تھی۔ برکت ٹیکسی میں اپنی باہیں سینے پر باندھے بھرا بیٹھا رہا۔ وہ لوگ بھوکوں مرنے کی نوبت پر پہنچے ہوئے تھے۔ اسے سوما پر بھروسہ تھا کہ سمجھ دار عورت ہے۔ موقع کے لحاظ سے سب کچھ سنبھال لے گی۔ صاحب کو انگلیوں پر نچا لیتی۔ لیکن وہاں اُس نے اُلٹا نخرہ دکھایا۔ سیدھے منھ بات نہیں کی۔ "مادر.... مجھے اُلو بناتی ہے۔ میں کیا اس کا مزدور ہوں! سراسر بے ایمانی اور دھوکا ہے....." وہ اپنی کوٹھری میں پہنچنے کے انتظار میں تھا۔

اپنی کوٹھری میں پہنچ کر سوما کا اتنی دیر سے سنبھلا صبر ٹوٹ گیا۔ وہ پھپھک پھپھک کر رو اُٹھی اور چہرے کو آنچل سے ڈھانک کر دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔

برکت نے غصے میں آستینیں سمیٹ لیں۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر سوما کے سامنے کھڑا ہو گیا اور دانت

پیس کر بولا۔ "میں نے تجھے ان لوگوں کی خاطر کرنے کو کہا تھا اور تو نے ان لوگوں سے سیدھے منھ بات نہیں کی ؟"

سوما نے چہرے سے آنچل ہٹا کر بھیگی آنکھیں اوپر اُٹھائیں۔ "تمھیں کیا معلوم کہ وہ کیا کر رہا تھا !" اُس نے پھر آنچل سے منھ ڈھانک لیا اور رونے لگی۔

سوما کے بغل میں پورے زور سے لات پڑی اور ساتھ ہی دو تین تھپڑ اُس کے سر اور کندھے پر پڑ گئے۔

سوما کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کا رونا بند ہو گیا۔ برکت غصّے اور جھلاہٹ میں بکتا جا رہا تھا۔ "حرام زادی وہاں اُس صاحب کے بچے کے سامنے ٹکڑوں پر ٹانگ پھیلاتی تھی تو شرم نہیں آتی تھی۔ یہاں ..... میں وہی جما کر بیٹھی ہے۔ مادر ..... چیر ڈالوں گا۔ میرے سامنے بنتی ہے۔ میں ...... جیسے حرام زادی کو جانتا نہیں۔"

سوما مار کھا کر سُن ہو گئی۔ گھٹنوں پر سر رکھے بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

"اب بولتی کیوں نہیں ؟" برکت نے ایک لات اور ماری۔

"کیا بولیں بھائی۔" دبی زبان سے سوما نے جواب دیا۔ اُس کا رونا رُک گیا تھا۔ "میں تو تمہارا ہاتھ پکڑ کر آئی ہوں۔"

برکت اور بھی جھلا اُٹھا۔ "بڑی آئی بھائی بنانے والی۔ وہاں تو گلے پڑ گئی تھی کہ مجھے لے چل ! یہاں کیا میں تجھے اپنی ہڈیاں کھلا کر پالنے لایا ہوں ..... آج ..... کا غرور توڑتا ہوں تو یوں سیدھی نہیں ہو گی۔"

برکت کھولی کے کواڑ بند کر کے چلا گیا۔ سوما کو باہر سے زنجیر میں تالا لگانے کی آہٹ ملی۔ وہ جسم اور دماغ سے بے حس بیٹھی رہی۔ آدھے گھنٹے اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس کے سوچنے کی طاقت واپس آئی۔ ایک بات بار بار اُس کے دماغ میں اُٹھ رہی تھی۔ وہ فضول ہی زندہ رہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُسے مجھیرا ہی میں مر جانا چاہیے تھا۔ دھرم شالہ میں مر جاتی۔ نہیں تو لاہور میں مر جاتی۔ اُس کے ساتھ سب نے دغا کی تھی۔

گھٹنے پر ٹھوڑی ٹیکے بے حس و حرکت بیٹھی وہ کچھ ہوش میں اور کچھ خواب میں سوچتی رہی۔ مر جانے کے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔ اُس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔

کواڑ کی زنجیر گرنے کی آہٹ سنائی دی۔ سمجھی آہٹ پڑوس کی کھولی میں اندر کی زنجیر کھلنے کی تھی۔

پڑوسی مزدورات کی پالی میں کام کر کے لوٹا تھا۔ سوما نے سوچا برکت بھی آیا ہوگا۔ شاید شراب ڈھونڈ رہا ہوگا۔

دیوار کی دوسری طرف سے ایک مردانہ گلے کی گالی دینے کی آواز آئی۔ دو عورتیں گالیاں دیتی سنائی دیں۔ جوان عورت بوڑھی کو جھوٹی چغلی کھانے کے لیے گالیاں دے کر کوسنے دے رہی تھی۔ بڑھیا اس پر چھنال ہونے کا الزام لگا رہی تھی۔ مرد سر کاٹ لینے کی دھمکی دے رہا تھا۔

پڑوس کی کھولی میں سناٹا ہو گیا۔ برکت نہیں لوٹا تھا۔ گہری سانس لے کر سوما نے سوچا۔ اُدھر چھنال ہونے کی وجہ سے مار پڑ رہی ہے۔ اِدھر چھنال بنانے کے لیے مار پڑ رہی ہے۔ سوما کو دھرم شالہ میں دھن سنگھ کے ہاتھوں کھائی ہوئی مار یاد آ گئی۔ اس مار کی یاد بڑے فخر کی تھی۔ دھن سنگھ نے اسے مارا تھا..... اسی بات پر تو اس نے دو قتل کر دیے تھے۔ اپنی عمر برباد کر دی تھی۔ مرد جسے اپنی عورت سمجھتا ہے، اس پر دوسرے کی نظر برداشت نہیں کر سکتا۔ برکت مجھے رنڈی بنا کر بیچنے کے لیے لایا ہے۔ اُس کی اپنی عورت کو کوئی نظر ڈالے تو مارنے مرنے پر تیار ہو جائے گا۔

سوما نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ رونے سے کیا فائدہ؟ .... کوئی سنے گا تیرا رونا؟ اُسے خیال آیا۔ وہ کہہ گیا ہے، تیرا مزاج آج ٹھیک کروں گا۔ شراب پینے گیا ہوگا۔ صاحب بھی شراب پی کر بہت رنگ میں آجاتا تھا۔ کیسی کیسی باتیں کرتا تھا! سوما کو اُس یاد سے گھن سی آئی۔ برکت کے شراب پی کر دھمکی پوری کرنے کے ارادے سے بھی اسے گھن اور اُداسی سی محسوس ہوئی۔ پھر خیال آیا۔ برکت اگر اُسے اپنی عورت سمجھے گا تو رنڈی بنا کر تو نہیں بیچے گا! سینکڑوں کے ہاتھ پڑنے سے تو کوئی ایک بُرے سے بُرا آدمی بھلا۔ ایک مرد کی آڑ تو ضروری تھی۔ مرد کی آڑ کے بغیر عورت کیسے رہے؟ سوما کو پڑوس کی کھولی میں اپنے مرد سے مار کھانے والی عورت پر رشک آنے لگا۔

سوما کو اپنی کھولی کے تالے میں کنجی گھمانے کی آہٹ سنائی دی۔ برکت آیا اور ساتھ ہی سستی شراب کی تیکھی بو۔ دل متلا دینے والی بو آئی۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ سوما کو اس کا مزاج ٹھیک کرنے کی دھمکی یاد تھی۔ دل نفرت سے بھر گیا۔ لیکن ساتھ ہی سوچا۔ اگر یہ سہہ کر بھی وہ رنڈی بنائی جانے سے بچ کر گھر والی بن سکے؟

برکت کے ہونٹ نشے سے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سوما کے بغل میں گر سا پڑا۔ "اب بول"، مشکل سے اُس نے کہا اور سوما کی بانہہ پکڑ لی۔

سوما نے دل کے اندر نفرت کو دبا کر کچھ سمٹتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ "تمہارے ساتھ ہی تو

آئی ہوں ۔" وہ بچنے کی کوشش کیے بغیر مسکراتے ہوئے مرجانے کے لیے تیار ہوگئی۔

برکت جڑ سے اُکھاڑے ہوئے پیڑ کی طرح لُڑھک گیا۔ سوما کو ایسی متلی ہو رہی تھی جیسے نابدان میں ڈوب رہی ہو۔ وہ اُٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ رہی۔

صبح کے سناٹے میں منزل بھر کے ساجھے کے غسل خانے میں نل سے پانی کی دھار گرنے کی آہٹ ملی۔ سوما اُٹھ کر نہانے چلی گئی۔ نہاکر پھر وہ دیوار سے پیٹھ لگاکر بیٹھ گئی۔ نزدیک ہی شراب میں لسباہوا، دھیمے دھیمے خرّاٹے لیتا برکت پڑا تھا۔ سوما کو اس سے گھن آرہی تھی۔ لیکن اب وہی تو اُس کا سہارا تھا۔ سوما کا جی چاہا مرجائے۔ سوچا۔ مرنا تھا تو پہلے مرتی، دھن سنگھ کے چلے جانے کے دن ہی۔

دن زیادہ چڑھ جانے پر سوما نے چائے بناکر برکت کو پکارا۔ اُس کی نیند نہ ٹوٹی تو پھر وہ دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔ برکت دوپہر میں اُٹھا۔ اُٹھتے ہی اُس نے سر میں درد کی شکایت کی۔ سوما نے پھر سے چائے گرم کرکے ایک پیالہ اسے دے کر کہا۔" سر میں درد ہے تو چار پیسے دو۔ پڑوسن کے لڑکے سے سر درد کی گولی منگا دوں۔"

برکت ایک میلی چادر کو بدن میں لپیٹتے ہوئے بولا۔"کس مادر ....." گالی دے کر وہ بولا۔ "کس مادر ..... کے پاس اب افیم کی گولی کے لیے بھی چار پیسے بچے ہیں۔ تو مجھے ایسے کھائے گی۔ ویسے بھی کھائے گی۔ کل اُس حرامی سے بات بنی تھی۔ تو نے مادر..... تو نے دولتی نہ ماردی ہوتی تو اِس وقت جیب میں بیس پچیس روپے ہوتے۔ بہن ..... مجھے کیا معلوم تھا تو اتنی ٹھگ ہے؟ ایسا مزاج ہے تو اپنی راہ دیکھ! ہمارا کیا ہے ہم آج جاکر فوج میں بھرتی ہو جائیں گے۔ روٹی کپڑا سرکار دے گی۔ سڑک پر ہاتھ پھیلائے پھرنا تب پارسائی کا مزہ آئے گا۔"

سوما نے ڈر سے کانپ کر آنکھیں موند لیں۔ اس نے سوچا تھا۔ اتنا گر جانے پر تو اس کے پاؤں دھرتی پر ٹک گئے ہیں۔ لیکن وہ اس کا بھرم (غلط خیال) تھا۔ اُس نے برکت سے آنکھیں ملاکر سخت لہجے میں کہا۔" خیر جو ہو گیا۔ ہو گیا۔ اب سہی۔"

برکت نرم پڑ گیا۔"سنبھال لے گی تو ملکہ بن جائے گی۔ لوگ تیرے قدم چومیں گے۔ تجھ پر اشرفیاں لٹائیں گے۔ آخر یہ تیرا حُسن کوئی ٹکڑوں پر بکنے کی چیز ہے؟ تو تو بے وقوف ہے۔ یا تو سالے صاحب کو ہی ایسا قابو میں کیا ہوتا کہ چالیس پچاس ہزار اینٹھ لیتی۔ الگ کوٹھی لے کر رہتی۔ اب یہاں بھی ایسی ہی بے وقوفی کرے گی تو کیا ہوگا؟ اماں، پھول کا کیا ہے۔ میز پر رکھ دو تو گل دستہ۔ زمین پر گر پڑا تو کوڑا۔ تو تو پڑھی

لکھی ہے۔ یہاں ہزاروں گدھیاں کما رہی ہیں۔ اب تو زمانہ ہی عورت کا آگیا ہے۔ سمجھ لے تیری بدولت ہم بھی روزی پا جائیں گے۔ یہ تو موقع ملنے کی بات ہے۔ وہ سالا بنواری جیوا بھائی کی ڈرائیوری کرتا تھا۔ سیٹھ نے ڈائریکٹر سے کہہ دیا تو اب وہ ڈائلاگ لکھتا ہے۔ مذاقیہ پارٹ کرتا ہے اور ہزاروں پیسہ پیٹ لیتا ہے۔ سالے کے بغل میں جب دیکھو نئی عورت اور ولائتی کی بوتل! ڈائریکٹر کی ناک کا بال بنا ہوا ہے سالا۔ وہ یہ ہے کہ گٹ پٹ مار لیتا ہے۔ اسے تو جب چاہوں بلا لاؤں۔ ساتھ کا پینے والا تھا۔"

برکت اپنے سبھی ملاقاتیوں سے تھوڑا بہت اُدھار لے چکا تھا۔ اُدھار لوٹا دینے کا کوئی موقع نہ تھا۔ وہ اس حال میں پہنچ چکا تھا کہ بے شرمی ہی اُس کا سہارا تھی۔ پچھلی رات بنارسی نے برکت کو "فل مون" ہوٹل میں پریشانی میں دیکھا تھا۔ وہ ایک عورت کی بھل منساہٹ کی وجہ سے مصیبت میں پڑ گیا تھا اور بلیک آؤٹ میں عورت کو لے کر چھ میل چلنے پر مجبور تھا۔ بنواری کو عورت پر رحم آگیا۔ برکت نے پہلا قرض ادا نہیں کیا تھا۔ پھر بھی بنواری نے اسے دس روپے دیے تھے۔

برکت بنواری کے اخلاق سے ہمت پاکر، مجبوری میں دوپہر پھر دار فیض اسٹوڈیو میں بنواری سے ملنے اندھیری گیا۔ بنواری نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "اسی عورت کو فلم میں رکھوانے کے لیے کہتے تھے؟ دوست! کہیں ڈائریکٹر ہی کے چپل جما دے تو؟" اور اُس نے مذاق کیا۔ "واہ میاں! گھوڑی کو رام کیے بغیر سواری کے لیے لے آئے۔ ایسی جلد بازی؟ بالکل اناڑی ہو۔ کسی کے کراری دولتی تو نہیں جما دی اس نے؟"

برکت نے مونچھ اینٹھ کر کہا۔ "استاد کوئی لدّو ٹٹّو تو ہے نہیں۔ پانی دار گھوڑی تو سوار کی ران پہچان لیتی ہے۔"

"ہم بھی دیکھیں گے؟" بنواری نے آنکھ مار کر پوچھا۔

"بھئی تم سے تو ہم نے پہلے ہی کہا تھا، تم سمجھ دار، پڑھے لکھے آدمی ہو۔ صاحب قلم ہو۔ آئیں گے۔" بنواری نے کہا اور برکت کے مانگنے پر اُس نے پانچ روپے اور دے دیے۔ اُس روز شام کے وقت "دار فیض" میں شوٹنگ نہیں تھی۔ بنواری بھول نہ جائے اس ڈر سے برکت اسٹوڈیو کے باہر انتظار کرتا رہا۔ بنواری باہر نکلا تو برکت نے یاد دلایا۔ "چلتے ہو؟"

اندھیرا ہو گیا تھا۔ چالوں میں روشنیاں جل چکی تھیں۔ سومانے دال چاول پکا کر ایک طرف رکھ

دیا تھا اور فرش پر دری بچھا کر لیٹی ہوئی تھی۔ برکت ایک آدمی کو ساتھ لیے ہوئے پہنچا۔ سوما نے دونوں کے لیے دری بچھا دی اور دیوار سے پیٹھ لگا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

برکت نے جان پہچان کرائی: "یہ ہمارے پنجابی دوست ہیں۔ سنیما کا ڈائلاگ لکھتے ہیں۔ بہت علم والے آدمی ہیں۔ ان کو فلموں کے مالک اور ڈائریکٹر بہت مانتے ہیں۔"

بنواری سوما کے اُداس چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ سوما برکت کا مطلب سمجھ کر جی نہ چاہنے پر بھی اُس کے آنے پر مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

برکت بنواری کی صلاحیتوں اور اُس کے اثرات بیان کیے جا رہا تھا۔ برکت کو چپ کرنے کے لیے بنواری اُس کے مُنہ کے سامنے ہاتھ کر کے پنجابی میں بولا "بس بس، بہت بک چکا اب رہنے دے۔"

"ان کے لیے چائے بناؤ۔" برکت نے کہا "اپنے وطن کے آدمی ہیں۔" وہ پھر بنواری کی تعریف کرنے لگا۔

بنواری نے چائے سے انکار کر دیا۔ اور دوسری باتیں کرنے لگا۔ برکت نے سوما سے کہا۔ "اچھا میں ان کے لیے کچھ پھل وَل لے آؤں۔ تم چائے تیار کرو۔ ٹھیک ہے۔ سمجھ گئی!"

بنواری نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر برکت کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن برکت "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہہ کر چلا گیا۔

سوما کے چہرے پر اُداسی کی چھاپ بنواری کی آنکھ سے چھپی نہ رہی۔ اُس نے ہمدردی سے لیکن بے تکلفی کے ساتھ پنجابی میں مخاطب کیا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ کو بمبئی آئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے؟"

"تھوڑے دن ہوئے ہیں۔" سوما نے مسکرانے کی کوشش کی۔

بنواری کے کہا "اپنی طرف کے لوگوں کو یہاں کا ہوا پانی راس نہیں آتا۔ خوراک بھی ایسی ہی ملتی ہے۔ لگتا ہے بہت دُبلی ہو گئی ہو۔"

بنواری کے سلوک سے سوما نے مسکرانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اُس کی طرف دیکھ کر چپ ہو گئی۔

بنواری دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ "کیا یہ آدمی آپ کے یہاں نوکر تھا؟"

سوما نے بنواری کے انداز سے اُس کی طرف سہم کر دیکھا اور کوئی جواب نہ دے کر سر جھکا لیا۔

بنواری۔ "سینما میں کام کرنا چاہتی ہیں؟"

سوما نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جی"

بنواری محسوس کر رہا تھا کہ وہ عورت اپنے دل کی تکلیفوں کو کوشش کر کے چھپا رہی تھی۔ بنواری

آرام کے لیے دیوار کے سہارے اور نیچے کھسک کر سگریٹ کا لمبا کش لے کر بولا۔" سینما بھلے لوگوں کی جگہ نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرح کی بربادی سے بہت بہتر ہے۔ دنیا میں نیک بنے رہنا بہت مشکل ہے آدمی مٹ جاتا ہے۔" اُس نے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کو پھینک دیا۔" اچھا میں چلوں۔ برکت تو نہ جانے کب آئے گا؟"

سوما اپنی اُداسی سے جاگی۔ سوچا مہمان کی خاطر تو کچھ نہیں ہوئی۔ یہ بھی محسوس کیا کہ برکت کے مقابلے میں اس آدمی کا کھولی میں رہنا زیادہ اطمینان بخش اور سہارے کا سبب تھا۔ سوما نے کہا۔" نہیں ذرا تو بیٹھیے۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

"نہیں نہیں!،، بنواری نے ہاتھ ہلا کر انکار کیا۔" چائے میں اس وقت نہیں پیوں گا۔ رہنے دو۔ فکر مت کرو۔ ہاں ایک بات ہے۔ سینما میں آؤ گی تو اپنے آپ کو کیا بتاؤ گی؟ دنیا میں ایک آدمی کی آڑ ہونا اچھا ہوتا ہے۔ یہ سوچ لینا۔،، بنواری اُٹھ کھڑا ہوا۔

سوما نے دبی زبان سے اصرار کیا۔" کچھ دیر تو بیٹھیے، چائے ضرور پیجیے۔ دو منٹ میں بن جائے گی" سوما کو کئی دن بعد ایک آدمی ملا تھا جسے وہ شریف سمجھ سکتی تھی۔

سوما کے لہجے میں پریشانی محسوس کر کے بنواری پھر بیٹھ گیا۔ سوما چائے بنانے لگی۔ چائے کی پیالی بنواری کے سامنے رکھ کر وہ ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی اور سر جھکائے ہوئے ہمت کر کے بولی۔ "مجھ سے سینما کا کام ہو جائے گا؟،،

"کرو گی تو سب ہو جائے گا۔،، بنواری نے جواب دیا۔" جو آدمی دل روتا رہنے پر بھی مسکرا سکتا ہے۔ وہ سینما کا کام بہت اچھا کر سکتا ہے۔،،

بنواری نے چائے پی کر اُٹھنے سے پہلے کہا۔" سنیے! آپ مصیبت میں ہیں۔ برکت کو میں جانتا ہوں۔ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ دو نوٹ رکھ لیجیے اپنے پاس۔،،

بنواری نے دس دس روپے کے دو نوٹ جیب سے نکال کر سوما کے سامنے رکھ دیئے۔" برکت تمہیں بھوکا بھی مار سکتا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ روپے کا بڑا سہارا ہوتا ہے۔ اس طرح رکھیے کہ برکت کی نظر نہ پڑ سکے۔ اب چلتا ہوں۔،،

سوما نے نوٹوں کو چھوا نہیں۔ انکار بھی نہیں کیا۔

بنواری چلا گیا تو سوما آنچل میں منہ چھپا کر رو پڑی۔ خوب روئی۔ پھر اُس نے نوٹوں کو اٹھا کر چھپا لیا۔ سوچ رہی تھی۔ اگر یہی بھلا آدمی مجھے سہارا دے دے تو اب بھی بچ جاؤں۔ بنواری چال

سے کچھ ہی قدم گیا تھا کہ برکت مل گیا۔ برکت کی بے چینی کو بھانپ کر بنواری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
"دوست بڑے زور کا مال لائے ہو! پیچھے پیچھے وارنٹ تو نہیں آ رہا ہے؟"
"استاد تم اعتبار رکھو!" برکت نے سر ہلا دیا۔ "کچھ کام دلاتے ہو؟"
بنواری نے ایک سگریٹ برکت کو دیا اور دوسرا خود اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ سوچ کر جواب دیا۔ "صبح گیارہ بجے اسٹوڈیو میں آجانا۔ کچھ سوچیں گے۔"

فلمی دنیا میں بنواری کی اچھی ساکھ تھی۔ وہ آوارگی اور سوجھ بوجھ دونوں کے لیے مشہور تھا۔ عمر اُس کی کم نہ تھی اور اپنی عمر سے زیادہ معلوم بھی ہوتا تھا۔ وہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں فلمی دنیا میں بہت سے پاپڑ بیل چکا تھا۔

بنواری نے ۱۹۱۹ء کے تحریک عدم تعاون اور ستیہ گرہ میں سینکڑوں طالب علموں کی طرح کالج چھوڑ دیا تھا اور ملک کی آزادی کے لیے سیاسی جد وجہد میں والنٹیر بن گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد کانگریسی نیتاؤں نے عدم تعاون کو تعاون کا روپ دے دیا۔ کانگرس لڑائی کے مورچے کے بجائے دستوری تحریک بن گئی اور بغیر تنخواہ کے رضاکار سپاہیوں کی ضرورت نہیں رہی۔ وقت اور روپیہ خرچ کرنے والے کارکنوں کی ہی اہمیت رہ گئی۔

بنواری کے خاندان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اس نے گزارے کے لیے اخباروں میں نوکری کر لی۔ اخباروں میں وہ اپنی خواہش سے کچھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ ضرورت بھر پیسہ بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے غیر مطمئن تھا۔ وہ مالی لحاظ سے نچلے متوسط طبقے میں تھا لیکن خیالوں کے لحاظ اونچے طبقے میں رہتا تھا۔ ادیب ہونے کی وجہ سے اُس کا آنا جانا خوش حال گھروں میں بھی ہو جاتا تھا۔

بنواری نے اپنی عقل کا بھروسہ کیا تھا یا اور دھوکا کھایا تھا۔ وہ ایک خوش حال خاندان کی خوش خصلت بیوہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ خوش حال بیوہ نے اس کی محبت کو قبول کیا۔ لیکن زندگی کو اُس کے باندھ لینا منظور نہیں کیا۔ اس محبت کے جھگڑے نے اس نابرابری کو ظاہر کر دیا۔ بنواری اپنے خیالات اور تصوّرات کے لحاظ سے اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ لیکن زندگی کی مادّی کامیابیوں کے ترازو پر اس کا وزن کچھ بھی نہیں تھا۔ بنواری کو یہ حقیقت ماننی پڑی۔ زندگی کا نیا باب شروع کرنے کے لیے وہ لاہور چھوڑ کر بمبئی چلا آیا تھا۔

بنواری زندگی کے ذرائع اور وسائل کے ترازو پر ہلکا اُترتا تھا۔ لیکن اسے اپنی کلا (فن) کی طاقت پر بھروسہ تھا۔ اُس نے فن کے پھیلے ہوئے میدان سینما کے کاروبار میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی فنی لحاظ سے کامیاب کہانیاں لے کر سینما کے ٹھیکہ داروں کے یہاں گھومتا رہا۔ فن کے تاجر اُس کے بھولے پن پر مسکرا دیتے تھے۔ کسی غیر معروف کہانی کار کی سوجھ بوجھ پر بھروسہ کرکے پانچ دس لاکھ روپے کی بازی لگا دینے کی حماقت کون کرتا۔

بنواری کے بھوکے رہنے کی نوبت آگئی۔ لیکن اُس کی خودداری اور ذہنی پندار باقی رہا۔ اُس نے اپنی کلا کو بیچنے کے بدلے اپنی جسمانی محنت کو بیچنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اپنے آپ کو ان پڑھ بناکر چپراسی کی نوکری کرلی۔ لیکن اسے نباہ نہ سکا۔ اُسے بخار رہنے لگا۔ کھانسی آنے لگی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر اُسے خود اپنے اوپر ترس آنے لگا۔ اُسے ماننا پڑا، اس کی عقل، تصورات اور دل کا سکون جسم کی طرف سے بے پرواہی نہیں کرسکتے۔ مناسب غذا اور کچھ پڑھے لکھے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

بنواری نے سوچا۔ وہ ایکسٹرا ہی بن جائے۔ اُس کے لیے بھی اپنی صلاحیت کو منوانے کی ضرورت تھی۔ اُس نے تجربے سے بے بس ہوکر مان لیا کہ سینما کی دنیا میں خوشامد سے بڑی دوسری کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ ایکسٹرا سپلائر موتی رام کی معرفت ایک فلم میں فوج کا کیمپ دکھانے کے لیے اکٹھی کی گئی بھیڑ میں شامل ہوکر اسٹوڈیو میں گیا تھا۔

بنواری نے خودداری اور پندار کو چھوڑ کر ڈائریکٹر صاحب کا کھلونا بن جانے میں اپنی کمتری اور ڈائریکٹر صاحب کی برتری دکھانے میں اپنی صلاحیت دکھائی وہ ڈائریکٹر کو پسند آیا۔ بنواری اسٹوڈیو میں کامیڈین کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ دوسرے کی حماقت دیکھ کر لوگوں کو اپنی عقلمندی کے غرور کی تسکین ہوتی ہے۔ بنواری کے اِس کام کی قیمت بہت سمجھی گئی۔

بنواری چمک گیا۔ اب فلم کی دنیا میں اُس کا جادو تھا۔ 'تم کیا چاہتے ہو ...... جو کہو میں بن کر دکھا سکتا ہوں' بنواری مذاقیہ ایکٹنگ کے ساتھ ساتھ کامیڈی ڈائلاگ بھی سمجھانے لگا۔ ڈائرکٹر کے سامنے وہ اپنی بات سدا اُن کی سوجھ بوجھ کی شکل میں رکھتا تھا۔ اگر ڈائریکٹر کوئی بے تکی بات کہہ دیتے تو وہ جوش کے ساتھ اُس کی تائید کرتا۔ ڈائریکٹر مسٹر مہنت اسے اپنا داہنا ہاتھ ماننے لگے۔ بنواری فن کی خدمت اور سچائی کا غرور چھوڑ چکا تھا۔ اب اس کے لیے وہی چیز کلا اور فن تھی جو اسے زندگی میں سہارا دے سکتی تھی۔ پہلے وہ اپنے آپ کو فن کار سمجھتا تھا۔ اب وہ اپنے

آپ کو فن باز کہنے لگا۔

دارفیض کمپنی میں "جلتا گھونسلہ" فلم بن رہی تھی۔ فلم کی کہانی ڈائریکٹر صاحب کی سوجھ سے دو کامیاب انگریزی فلموں کے پلاٹ ملا کر ہندوستانی ماحول کے لیے گھڑ لی گئی تھی۔ ناچ گانا بھرپور تھا۔ ڈائریکٹر صاحب 'سوشل ہٹ' تیار کر رہے تھے۔ فلم میں گھریلو زندگی کے مناظر دیے گئے تھے۔ آدھی فلم کی شوٹنگ ہو چکی تھی۔ باقی کہانی ابھی ڈائریکٹر صاحب یا بنواری کے دماغ میں تھی۔

فلم کا ایک منظر فلمایا جا رہا تھا کہ ہیرو اپنی سالی کے بیاہ میں سسرال جاتا ہے اور وہاں ہیروئن کی ایک سہیلی کے حسن پر مرمٹتا ہے۔ ہیروئن کے لیے ڈائریکٹر صاحب نے بجربہ کار ایکٹرس چندرا کو چنا تھا۔ ہیروئن کی بہن کے سین زیادہ نہیں تھے۔ اس بات کے لیے انھوں نے گومتی سے دو ہزار کا معاہدہ کر لیا تھا۔ وہ دو تین ریہرسل کر آئی تھی لیکن ڈریس ریہرسل کے لیے نہیں آئی۔ ہیروئن کی سہیلی کا پارٹ رحیمہ کر رہی تھی۔ اس کا بھی معاہدہ تھا۔ گومتی اور رحیمہ کئی جگہ تھوڑا تھوڑا کام کرتی تھیں۔ گومتی کے نہ آنے سے کمپنی کو تو نقصان تھا ہی۔ اس سٹ کے سارے دوسرے ایکٹروں اور اسٹوڈیو کا کرایہ بھی مفت سر پڑ رہا تھا۔ لیکن رحیمہ کو بھی نقصان تھا۔ اُسے "آکریٹ کمپنی" والے دو گانے کے لیے بُلا رہے تھے۔ اُن نے دارفیض سے اپنے معاہدے کا خیال کر کے اُن سے انکار کر دیا تھا۔ رحیمہ نے ڈائریکٹر سے شکایت کر دی: "گومتی آپ کے یہاں نہیں آئی۔ وہ آکریٹ میں گئی ہے۔"

ڈائریکٹر مہنت کو ایکٹرس کی اس بے ایمانی پر غصہ آگیا۔ آکریٹ والے دارفیض کو نقصان پہنچانے کی اور بھی حرکتیں کر چکے تھے۔ بنواری نے موقع دیکھ کر مہنت سے کہا۔ "سنا ہے گومتی کو بیماری لگ گئی ہے۔ غریب گھومتی رہتی ہے۔ لیکن دو دن میں اس کے چہرے پر چھالے پڑ جائیں گے تو کم بخت کا میک اپ کیسے ہو گا؟ حضور اُس کی آواز میں بھی فرق آگیا ہے۔ حضور جو بات چاہتے ہیں وہ اُس میں نہیں رہی۔"

مہنت نے اپنا سگریٹ کیس بنواری کی طرف بڑھا کر پوچھا۔ "یعنی؟"

بنواری نے سگریٹ لیتے ہوئے کہا۔ "حضور گومتی اسٹیپا بنی ہے۔ لیکن وہ کوئی خاص نہیں جچی کہ منی یعنی چندرا کے مقابلے میں ہیرو کا دل چھین لے یا یوں کہیے کہ پبلک کا دل تھام لے۔ آپ اس کا میک اپ کچھ اور سوچ ڈالیے! "سائلنٹ لارک" میں 'بنس'، 'ڈورا' سے زیادہ حسین ہے۔ ایکٹنگ چاہے اچھی نہ ہو، شکل میں تو کشش ہو۔"

"ہوں! مہنت سگریٹ کے دھوئیں سے چڑچڑاتی آنکھیں سکوڑ کر سوچنے لگا۔
"حضور، کل ایک عورت دیکھی ہے۔ اسٹیج پر آجائے اور آپ کا ڈائرکشن ہو تو 'جلتا گھونسلہ' سب فلموں کو مات دے دے۔ عورت ذہین بھی کافی ہے۔ بالکل 'سائلنٹ لارک' (خاموش بلبل) آپ کی ڈائرکشن کو سمجھے گی بھی خوب۔ حکم ہو تو بلا کر دیکھا جائے۔ گومتی کی ریہرسل بھی کون پوری ہوگئی ہے۔ حضور، ایک آدھ نیا چہرہ بھی تو آنا چاہیے۔"
مہنت نے کرسی کی پیٹھ کا سہارا لے کر کہا۔ "ابھی آسکے گی! بلوالو۔ فیصلہ کرو۔"

سوما سنیما کمپنی کی موٹر میں ماہم سے اندھیری جا رہی تھی۔ برکت اس کے پہلو میں بیٹھ کر نصیحت کرتا رہا..... "بڑی مشکل سے یہ موقع ہاتھ آیا ہے۔ اس وقت سنبھال لو گی تو زندگی سنبھل جائے گی۔"
سوما دانت دبائے، برکت سے آنکھیں چرائے سوچتی جا رہی تھی۔ تجھ سے بچنے کے لیے تو میں کنوئیں میں کودنے کو تیار ہوں۔ اب رہ ہی کیا گیا ہے جس کے لیے ڈروں گی؟ کل والا وہ بھلا آدمی ذرا سہارا دے دے۔ پرمیشور کرے وہ وہاں ہو۔"
اسٹوڈیو میں سب سے پہلے بنواری اُسے ملا۔ اُس نے دلاسا دیا۔ "گھبرانا نہیں کسی بات سے۔"
سوما کنوئیں میں کودنے کی ہمت کرکے آئی تھی۔ اسے محسوس ہوا، یہ آدمی ہاتھ کا سہارا دے کر کنوئیں پر سے پار کودنے میں مدد دے گا۔ ڈائریکٹر نے بغیر کسی جھجک کے اس کے چہرے کو گہری نگاہ سے گھور کر دیکھا۔ سوما اس نگاہ سے گھبرائی نہیں۔ جیسے انجان ڈاکٹر کے سامنے کپڑا اٹھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔
ڈائریکٹر نے اس کے ماتھے، ناک، آنکھیں، ہونٹ، گال، ٹھڈی سب پر تیز نگاہ ڈالی۔ اور بنواری کی طرف گھوم کر گمبھیر ہو کر کہا۔ "ناٹ بیڈ۔" (بُری نہیں ہے) جیسے کسی اوزار کو پرکھ رہا ہو۔ "کین شی اسپیک (بول سکے گی)؟"
ڈائریکٹر نے سوما کو مخاطب کیا۔ "راستے میں آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی؟"
سوما نے نامعلوم اشارے سے سر ہلا کر پلکیں جھپکا کر شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔
مہنت سرگوشی کے انداز میں بنواری سے انگریزی میں بولا۔ "یہ تو آنکھ سے بات کرتی ہے۔

آنکھیں خوب ہیں۔"

بنواری نے انگریزی میں اس کی تائید کی۔" اس کی ادا کے ساتھ چمپا اینڈ پارٹی کا بیک گراؤنڈ میوزک مل جائے تو جلتا گھونسلہ بمبئی میں ایک برس چلے۔"

سوما کو اسٹوڈیو میں ریہرسل کے لیے بلایا گیا۔ وہاں آٹھ اور عورتوں کو دیکھ کر سوما کو بھروسہ ہوا۔ لیکن یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان عورتوں کی آنکھوں میں ہمدردی اور خلوص نہیں بلکہ رشک اور حسد تھا۔

میک اپ روم میں لے جاکر سوما کے کپڑے اُتروائے گیے۔ اور اس کے چہرے کو رنگ لگا کر نئے ڈھنگ سے سنوارا گیا۔ فوٹوگرافر نے لینس کے ذریعے اُس کے چہرے کو نزدیک سے دیکھا۔ یعنی کیمرے کی آنکھ سے۔

اسٹیج پر عورتیں دلہن کو گھیر کر گیت گانے کے لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ سوما کو بھی اُن کے نزدیک بٹھا دیا گیا۔ ڈائریکٹر ہاتھ بھر کی چھڑی سے اشارے کر کے سب لوگوں کو حکم دے رہا تھا۔ سوما کو دلہن کے نزدیک بٹھا دیا گیا۔ ہیرو ایک کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔

ڈائریکٹر نے سوما کو مخاطب کر کے کہا۔" دیکھیے!" اور دلہن کی طرف چھڑی سے اشارہ کیا۔ "ان کی ٹھڈی چھو کر کہیے۔" ہائے اتنی اُداس کیوں ہو؟"

سوما نے حکم پورا کیا۔

ڈائریکٹر نے کہا۔" ذرا اونچا بولو۔"

سوما نے اونچی آواز میں دہرایا۔

ڈائریکٹر نے اپنی جانگھ پر چھڑی مار کر حکم دیا۔" مسکرا کر!"

سوما نے کوشش کی، لیکن ڈائریکٹر کو اطمینان نہیں ہوا۔ ساتھ بیٹھی ہوئی عورتیں سوما کی ناکامی پر مسکرا دیں۔

بنواری نے خشک لہجے میں ٹوکا۔" بی بی جی، یہاں مسکرانے کے دام دیے جاتے ہیں۔ شرمانے کے نہیں!"

سوما نے ایک بار پلک جھپک کر مسکرانے کی کوشش کی اور مسکرا کر دکھا دیا۔

ڈائریکٹر ہنر شناس تھا۔" گڈ"، تعریف میں ہاتھ اُٹھا کر اُس نے شاباشی دی۔ کیمرہ مین سے کہا۔" گھڑ گھڑے یاد رہے، یہاں کلوزاپ ہوگا۔"

ڈائلاگ ڈائریکٹر کے بتانے پر دُلہن آنسو بھرے لہجے میں بولی ۔" بہن تم لوگوں کے ساتھ بچپن گزرا ہے ۔ تم لوگوں کو چھوڑ کر جا رہی ہوں ۔"

سوما سے مسکرا کر کہلایا گیا ۔ " ابھی ایسا کہہ رہی ہو ، وکت آئے گا کہ ہم لوگ تمہاری خبر کو ترسیں گے اور تمھیں خط لکھنے کی فرصت نہ ہوگی ۔ "

سوما نے حکم پورا کیا ۔

بنواری نے ٹوکا ۔" وکت نہیں ، وقت بولو ۔" ساتھ کی عورتیں ہنس دیں ۔ سوما کو کئی دوسرے لفظوں ۔ انتجار کو انتظار ، سبر کو صبر ، بشنک کو بے شک بولنے کے لیے کہا گیا ۔ ساتھ کی عورتیں بار بار ہنس دیتیں ۔ لیکن سوما ہنسی کو ٹال جاتی ۔

پہلے ہی دن کانوں کان بات پھیل گئی ۔ عورت پنجاب کے پہاڑوں سے آئی ہے ۔ اس کا نام پہاڑن پڑ گیا ۔

سوما دوسرے دن برکت کے ساتھ اسٹوڈیو پہنچی تو دیکھا جھگڑا ہو رہا تھا ۔ جیوا بھائی ناراضگی سے کہہ رہا تھا ۔" ایکسٹرا ایکٹرس لانے کا ٹھیکہ آپ نے ہمیں دیا ہے تو آپ خود ایکٹرس کیسے لا سکتے ہیں ۔ گومتی نہیں آرہی تھی آپ ہمیں خبر دیتے ۔ ہم آپ کی ضرورت کے مطابق دوسری ایکٹرس سپلائی کرتے ۔ جو عورت آپ نے رکھی ہے ، ہم اِس کے لیے اِس آدمی کو پیشگی دے چکے ہیں ۔

جیوا بھائی نے غصّے میں برکت کی ناک کے سامنے انگلی اُٹھا کر للکارتے ہوئے کہا ۔" تم بولو ۔ تم نے اِس کے دس روپے ہم سے اڈوانس لیے کہ نہیں ؟ "

برکت صاف انکار کر گیا ۔ جیوا بھائی نے اِس بے ایمانی پر بہت گالیاں دیں ۔ جیوا بھائی نے بنواری سے گواہی مانگی ۔" تم بولو جی ۔ تم نے اُس رات عورت کو ہمارے ہوٹل میں دیکھا تھا کہ نہیں ؟ . . . . . وہ ہماری اسامی ہے ۔ ہمارے آدمی کو آپ سیدھے کیسے لگا سکتے ہیں ؟ ہمارا کمیشن کہاں جائے گا ؟ یہ بزنس ہے کہ ڈکیتی ہے ۔ ؟ "

بنواری نے دیکھا کہ جیوا بھائی اپنے کمیشن کے لیے سوما کی بے عزّتی کر ڈالے گا ۔ بنواری جیوا جی کو بانہہ سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا ۔ جیوا بھائی طیش میں آرہا تھا ۔" جب پچاس عورت کی ضرورت ہو تو ہم پریشان ہوں ۔ اور جب آپ کو کوئی عورت پسند آجائے ۔ آپ ہماری اسامی اُڑا لیں ! یہ بزنس ہے ! وہ ہماری اسامی ہے ۔ ہم چاہے اسے اسٹیج پر بھیجیں ، چاہے دوسرے کام لیں ۔ آپ ہمارا بزنس بگاڑیں گے تو ہم آپ کی مدد کیسے کریں گے ؟ سینما والے ایجنسی کے بغیر فلم بنانا چاہتے ہیں بنائیں یا ہم ایجنسی

ختم کیے دیتے ہیں۔ کل آپ کہیں گے ایکٹر ہمارا پیسہ مار کرے گیا۔ تو ہم ذمہ دار نہیں۔ سمجھ لیجیے۔"

بنواری نے سمجھایا۔ "سیٹھ تم کاروباری آدمی ہو۔ اکھڑ بننے میں کیا رکھا ہے؟ ایک چڑیا جال سے گزر گئی تو کیا جال کو توڑ ڈالیں گے؟ اور سینکڑوں پھنسیں گی! یہ عورت تمہارے بس کی نہیں ہے۔"

"ہم نے سینکڑوں ایسی ماں ...... بیچ ڈالیں۔" سیٹھ نے مونچھ پر ہاتھ رکھ کہا۔

"ہوگا۔" بنواری نے آہستہ سے کہا۔ "ڈائریکٹر نہنت کو یہ عورت بہت پسند ہے۔ خود اُسی نے بلوایا ہے۔ اُس سے بگاڑ کیوں کرتے ہو! دوسری جگہ کسر نکل جائے گی۔ ہماری بات مانو۔"

سوما ٹاٹ کی دیوار کے پیچھے سے یہ سب سُن کر کانپ رہی تھی۔

پہاڑن ڈائریکٹر نہنت کی امیدوں سے تیز نکلی۔ وہ سب کچھ ٹھیک کر لینے کی جی جان سے کوشش کر رہی تھی۔ شام کے وقت فرصت ہونے بنواری برکت کو صلاح دے کر سینما لے جاتا۔ ایکٹرسوں کے مختلف کاموں کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا۔ "کیا سمجھیں؟" ..... کیسا رہا۔ کیا تم ایسا نہیں کر سکتیں؟"

سوما نے لاہور میں منورما اور بھابی کے ساتھ کئی بار سینما دیکھا تھا۔ سینما اسے اچھا لگتا تھا۔ لیکن وہ ایکٹرسوں کو دیکھ کر سوچتی۔ "ہائے کیسی ہیں یہ لوگ! سب کو دکھا کر ایسا کرتی ہیں۔ انھیں شرم نہیں آتی؟ اب وہ سوچتی۔ 'یہ تو میں بھی کر سکتی ہوں .....' بنواری اور برکت بھی یقین دلاتے: "تمہارے لیے کچھ کٹھن نہیں۔ دو فلموں میں اچھی طرح کام کرلو۔ پھر سینما والے تمہاری خوشامد کرتے پھریں گے!" وہ اسے مدھو، چندرا اور رمیا بالو کی باتیں سناتے۔ وہ کتنے ہزار روپے ماہوار کما رہی تھیں۔

بنواری نے ایک فلم میں پہاڑن کو ایک دیہاتی ناچ دکھا کر پوچھا۔ "تم ایسا ناچ سکو گی؟"

پہاڑن نے کہا۔ "سکھانے سے ناچ لوں گی۔" وہ گانے کے لیے بھی تیار تھی۔ سب کچھ کرنے کے لیے بے چین تھی۔

پہاڑن کو صرف تین سین کے لیے بلایا گیا تھا۔ شروع میں کہانی یوں بنائی گئی تھی۔ ہیرو، رینو (پہاڑن) پر فریفتہ ہو کر اُس کی محبت میں اپنی پتنی کی طرف سے غافل ہو جائے گا اور ہیروئن اپنی بہن کو زہر دے کر مار ڈالے گی۔ پھر جاسوسی پلاٹ چلے گا۔ مگر پہاڑن کی کامیابی دیکھی تو ڈائریکٹر نے اُسے کچھ اور وقت پر اسکرین پر رکھنا مناسب سمجھا۔ اُس کے روپ سے فائدہ اُٹھانے کے لیے دو تین سین اور بڑھا دیے۔ بنواری یو۔ پی میں مروج 'کھوڑیاں' کا ایک گانا کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے ڈائریکٹر کو سمجھایا۔ "حضور اس پر پہاڑن کا ایک ناچ ہو جائے۔" ڈائریکٹر اس سوجھ پر اُچھل پڑا۔ اُستاد بھورے کو حکم ہوا کہ ساز اس طرح بجیں کہ پہاڑن تال سنبھال سکے۔ پہلے اُسے

گیت گا کر سنایا گیا۔ پھر ایک کڑی بار بار گوائی گئی۔ ڈائریکٹر اور ساؤنڈ انجینئر چوکھے ریکارڈنگ روم سے بار بار آواز اونچی کیے جانے کی ہدایت دیے جا رہے تھے۔ ساؤنڈ انجینئر گیت کو پاس نہیں کر رہا تھا۔ پہاڑن کے چہرے پر سرخی آگئی اور پسینے کی بوندیں چھلک آئیں۔

بنواری نے ڈائریکٹر کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر کہا۔ "اگر اِس وقت ٹیکنی کلر کیمرہ ہوتا!"

ساؤنڈ انجینئر چوکھے کئی بار پہاڑن کی آنکھوں میں دیکھ کر مُسکرا چکا تھا۔ بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر پہاڑن آنکھیں جھکا کر ٹال گئی تھی۔ بنواری نے بھانپا اور اکیلے میں پہاڑن کو سمجھایا۔ "پہاڑن۔ یہ سینما کا اکھاڑہ ہے۔ سمجھ لو۔ اگر یہ آدمی چاہے تو تمہارا گلا بانسری کا بول بن جائے۔ اور اگر نہ چاہے تو پھٹا بانس بنا رہے۔ کیمرے کا مورچہ تم نے جیت لیا۔ مہنت بھلا آدمی ہے۔ کیمرے کو خوب سمجھتا ہے۔ کیمرہ مین اُسے چرا نہیں سکتا۔ لیکن چوکھے دوسرے ڈھنگ کا آدمی ہے۔ اسے سمجھ لو۔"

پہاڑن کو اُداس ہوتے دیکھ کر بنواری نے ڈانٹ دیا۔ "تو پھر اِدھر پاؤں کیوں رکھا تھا۔ ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ابھی سنبھال لوگی تو ہم لوگ تمہاری جوتیاں سیدھی کریں گے۔"

دوسرے دن ریہرسل سے پہلے چوکھے نے پہاڑن کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ شرما کر مسکرا دی۔ "آپ تو ہم سے ناراض رہتے ہیں۔"

چوکھے نے کہا۔ "نہیں تو۔ آج شام ہمارے ساتھ کھانا کھائیے۔"

پہاڑن نے جواب دیا۔ "آپ تو ہمیں بہت ڈرا دیتے ہیں۔ ہمارا گانا تو آپ کو اچھا نہیں لگتا۔ ڈر کے مارے بھوک مر گئی ہے۔ کھائیں گے کیا؟"

اُس شام پہاڑن کے گانے کی کافی تعریف ہوئی۔ شام کے وقت چوکھے کے ساتھ گریٹ مغل میں کھانا کھانے گئی۔ رات ایک بجے چوکھے نے اسے ٹیکسی میں ماہم پہنچا دیا۔ سوما آدھی رات میں گھر پہنچی تو ڈر رہی تھی کہ برکت جھگڑا کرے گا۔ شاید ہاتھ بھی چلا بیٹھے۔ اُس نے غصّے میں طے کیا کہ بولے تو سہی۔ ساتھ کی کھولی میں پٹنے والی عورت کی بات یاد آئی..... اُس کم بخت کا مجھ پر کیا حق ہے؟

سوما کے کافی کھٹکھٹانے پر برکت نیند سے اُٹھا۔ لیکن اُس نے کچھ کہا نہیں۔ چپکے سے اپنی چادر میں پھر لپٹ کر سو گیا۔ سوما کو بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟۔ جو ہو۔ پاؤں رکھنے کی جگہ تو مِل گئی۔ ڈیڑھ مہینے سے اسٹوڈیو میں جا رہی تھی۔ آٹھ سو روپے مل چکے تھے...... شاید کچھ دن بعد وہ اپنی خواہش سے چل سکے گی۔ اِس کوٹھری سے چھوٹ سکے گی۔

بہاڑن کے گانے کی ریکارڈنگ بہت اچھی ہوئی تھی۔ گانے کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ اور اُس کے ناچ کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ فرش پر لکیر کھینچ کر بتا دیا گیا تھا کہ کس بول پر اُسے کہاں پاؤں رکھنا ہے۔ فل ڈریس ریہرسل میں بہاڑن کو لہنگا اور چولی پہنایا گیا تھا۔ اس کا پتلا پیٹ کھلا ہوا تھا۔ اُس کے اچھے خاصے گورے جسم پر، جہاں بدن کھلا ہوا تھا اور سفیدی لگا دی گئی تھی کہ رواں بُرا دکھائی نہ دے۔ چولی خوب کسی ہوئی تھی۔ چولی یوں بھی بھری ہوئی تھی اور کچھ روئی بھر کر اُسے اور نوکیلی بنا دیا گیا تھا۔

ریکارڈ بار بار دہرا رہا تھا۔ "دوپہریا کا معاملہ، میرا گورا بدن کملائے۔"

ڈائریکٹر نے سوما کو سمجھایا کہ "دوپہریا کا معاملہ" میں بھولے پن سے دونوں ہاتھ پھیلائے اور 'میرا گورا بدن' کہتے وقت کندھوں کو چھو کر کمر کو بل دے۔ 'کملائے' کہتے وقت آنچل سے ہوا لے لے۔ اس کھڑی کا بھاؤ پورا کرنے میں لگ بھگ ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ کبھی بہاڑن کے پاؤں فرش پر بنے نشانوں سے آگے پیچھے ہو جاتے۔ کبھی فوٹوگرافر روشنی بدلواتے۔ بہاڑن ہانپ گئی۔ بیس بار اس ٹکڑے کے بھاؤ ایکٹنگ کر چکنے کے بعد ٹیک لیا گیا۔ اسے چائے پلا کر کچھ آرام کا موقع دیا گیا۔

گیت کے دوسرے ٹکڑے پر ناچ شروع ہوا۔ "ساسوری، تیرا بیٹا ری، تیرا بیٹا ری میرے جوبن کو ہاتھ لگائے۔" اس ٹکڑے میں پہلے کے مقابلے میں اور بھی دیر لگی۔ مسکرا کر گھونگھٹ کھینچتے وقت پاؤں فرش پر بنے نشان سے آگے پیچھے ہو جاتے تھے۔ بہاڑن نے جی توڑ کر محنت کی اور ڈائریکٹر کا حکم پورا کر دیا۔ ڈائریکٹر پورے طور پر مطمئن تھا۔ سوما کا کلوز اپ اور ناچ کا اسٹل، لیا گیا۔ اس روز دار فیض کمپنی کے پروڈیوسر ایم، پالت اپنے یہاں آئی نئی ایکٹرس کی تعریف سن کر اس کا کام دیکھنے آئے تھے۔ ڈائریکٹر مہنت اور سب لوگ اُن کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔ پالت نے شوٹنگ ختم ہونے کے بعد بہاڑن کو مبارک باد دی اور چائے کی دعوت بھی دی۔

بہاڑن اپنی قیمت سمجھنے لگی تھی۔ اُس کے چہرے اور چال میں فرق آگیا تھا۔ اُس نے بہت تھکی ہونے کی وجہ سے پروڈیوسر سے معافی چاہی۔ پروڈیوسر کے لیے کرسی سے اُٹھی بھی نہیں۔

پالت صاحب نے نرمی سے مسکرا کر کہا۔ "اچھا کل سہی۔" اور چلے گئے۔

بنواری آکر بولا۔ "بہاڑن غضب کر دیا تم نے! یہی تو سب سے بڑا سانپ ہے۔ یہی تو مالک ہے

اس کے چاہنے سے ڈائریکٹر اور دوسرے لوگوں کو گوبر کی عورت کو بھی ہاتھی دانت کی مورت بنانا پڑے گا۔ کم از کم یہ فلم پوری ہونے تک اسے پھنسا کر رکھنا ہے۔

دوسرے دن پہاڑن پالت کے ساتھ ڈنر کے لیے تاج میں گئی اور وہاں سے ٹیکسی میں ماہم آئی۔ پروڈیوسر نے پہاڑن کو تیسرے دن تاج میں پھر بلا بھیجا۔

پالت نے ڈائریکٹر صاحب کو رائے دی۔ عورت کسی دوسری فلم کمپنی میں نہ جانے پائے۔ اب تک پہاڑن پچیس روپے روز پر کام کر رہی تھی۔ پالت کے سمجھانے سے مہنت نے اسے چھ مہینے کے لیے شرط نامہ لکھنے کے لیے کہا۔ پہاڑن نے بنواری سے رائے چاہی۔

بنواری نے سمجھایا۔ "پندرہ سو مہینہ مانگنا، اور ہر مہینے کی تنخواہ پیشگی۔"

پہاڑن کو بنواری کی رائے پاگل پن معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اس نے ڈائریکٹر سے یہی کہہ دیا تھا اور اس کی بات مان لی گئی تھی۔

پہاڑن کے ہاتھ میں کافی روپیہ آگیا تھا۔ اس نے ماہم کی چال چھوڑ دی۔ بنواری کی مدد سے اس نے دادر میں ایک فلیٹ دو سو روپے ماہوار پر لے لیا تھا۔ برکت کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت بات تھی۔ اب تک اسٹوڈیو سے جو کچھ ملتا تھا اس کا زیادہ حصہ برکت کے ہاتھ میں چلا جاتا تھا۔ بنواری نے پہاڑن کو نقد لینے سے منع کر دیا "چک لیا کرو۔ اور بینک میں جمع کرو۔"

سوما کی اس حرکت پر برکت بہت بگڑا۔ "ابھی سے ہمیں آنکھیں دکھانے لگی؟" اس نے سوما کو بہت گالیاں دیں اور مارنے پیٹنے کی دھمکی دی۔

پہاڑن برکت کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ ماتھے پر تیوریاں تھیں۔ برکت کو گھور کر دھمکایا۔ "خبردار بکواس کی تو! ابھی پولس میں بھجوا دوں گی۔ رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو۔ باہر کے کمرے میں۔"

برکت کو پھر پہاڑن میں لاہور والی سوما دس گونے تیکھے پن کے ساتھ دکھائی دی۔ وہ سہم گیا اور اپنی ضرورت کے لیے کبھی خوشامد سے اور کبھی غصہ دکھا کر پہاڑن سے روپے وصول کرنے لگا۔ اس کا خرچ کم نہ تھا۔ اسے آٹھ دس روپے روز چاہیے ہی تھے۔

گومتی دو دن تکلیف زیادہ ہونے کی وجہ سے دار فیض میں نہ پہنچ سکی۔ تیسرے دن آئی تو

اسے معلوم ہوا کہ اُس کی جگہ کوئی دوسری عورت رکھ لی گئی۔

گومتی نے ڈائریکٹر کی خوشامد کی۔ "آدمی کو دُکھ سکھ ہو ہی جاتا ہے۔ وہ کسی دوسری جگہ کام کرنے نہیں گئی تھی ...... کوئی ثابت کرکے دکھائے! مگر دارفیض کو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اُسے جواب ملا "جو پیشگی تم کھا گئیں۔ وہ تمہارا۔ اب ہمیں چھٹی دو۔"

دارفیض سے گومتی کے ہٹائے جانے کی بات پھیلی تو اُس کی بیماری کی بدنامی بھی پھیلنے لگی۔ دوسری جگہ اسے کام ملنا ناممکن ہوگیا۔ علاج ہوتے رہنے سے اس کی بیماری دبی ہوئی تھی۔ اب علاج کے لیے پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے بیماری بھڑک اُٹھی۔

گومتی کو پہاڑن پر غصہ تھا کہ پہاڑن کو رکھنے کے لیے ہی اُسے نکالا گیا تھا۔ وہ کہتی پھرتی تھی۔ پہاڑن جانتی کیا ہے۔ ایکٹنگ کیا کرے گی؟ جنگلی بکری کی طرح آنکھیں پھاڑ کر ممیا دیتی ہے۔ کمپنی والے سفید رنگ کا گدرا امرود دیکھ کر لپک پڑے ہیں۔ حرام زادی کو چار روز میں کچل کر پھینک دیں گے۔"

گومتی، ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور کمپنی کا کچھ بگاڑ نہ سکتی تھی۔ دل کی جلن سے لڑنے کے لیے وہ پہاڑن کے فلیٹ پر پہنچی اور اُس کے دروازے پر کھڑی ہو کر گالی دینے لگی۔ "تو نے ہم بیسوا کے پیٹ پر لات ماری ہے۔ تیرا ستیاناس ہو! جس حُسن کا تجھے گمان ہے، بھگوان تیرے اسی حسن کو برباد کرے! جس کی تو کمائی کھاتی ہے، تیری ...... میں کیڑے پڑیں! برس بھر میں بیماری نہ لگ جائے تو مجھے سڑک پر سو جوتی مارنا۔"

پہاڑن گھبرا کر اندر کمرے میں جا چھپی۔ کواڑ بند کر لیے۔ اُس کی مہاراجن گومتی کا مقابلہ کرنے لگی۔ گومتی کو چپ ہوتے نہ دیکھ کر برکت جوتا ہاتھ میں لے کر سامنے آگیا۔ اور گومتی کو پکڑ کر فلیٹ سے نیچے اُتار دیا۔ گومتی گالیاں بکتی چلی گئی۔

پہاڑن کا دل بہت دیر تک زور سے دھڑکتا رہا۔ وہ کواڑ بند کیے، آنکھیں موندے، پلنگ پر لیٹی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی۔

گومتی کے اس مخالفانہ پرچار سے دوسری کمپنیوں میں بھی پہاڑن کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ "جلتا گھونسلہ" فلم ختم ہوتے ہی منی مالا نے بھی پہاڑن کے خلاف پرچار شروع کر دیا تھا۔ پہاڑن کو خواہ مخواہ ہیروئن بنا کر اُس پر لاد دیا گیا تھا۔ فلم کے اشتہار میں تو منی مالا کا نام تھا لیکن فلم میں تھی۔ پہاڑن! سب جانتے تھے اب اگلے فلموں کے اشتہاروں میں پہاڑن کا نام سب سے اوپر ہوگا۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر چاہے جسے چڑھا دیں، جسے گرا دیں۔

سال ختم ہوتے ہوتے پہاڑن کی تین فلمیں بمبئی میں دکھائی جا رہی تھیں۔ "معصوم چور" اور "من کا سودا" میں پہاڑن نے ہیروئن کا کام کیا تھا۔ بمبئی کا آسمان پہاڑن کے نام سے گونج رہا تھا۔ اس کے چہرے کی دس گنا بڑی تصویریں دیواروں پر ہر طرف دکھائی دے رہی تھیں۔ مکانوں میں اور چائے پان کی دوکانوں پر، پان بیڑی کی دوکانوں پر اس کے گانوں کے ریکارڈ سنائی دیتے رہتے تھے۔ وہ ہر وقت اپنا چہرہ دیکھتی اور اپنی ہی آواز سنتی تھی ..... میرے جوبن کو ہاتھ لگائے ...... من پنچھی بھول نہ جانا ..... بسائیں پریت کا سنسار۔"

پہاڑن چار فلموں میں ایک ساتھ کام کر رہی تھی۔ کمپنی والوں کو اپنی شوٹنگ اور ریہرسل اس کی آسانی کے مطابق طے کرنی پڑتی تھی۔ بینک میں اس کے پاس تیس ہزار روپے جمع تھے۔ روپے کو وہ برباد نہیں کرتی تھی۔ بنواری اسے بار بار سمجھاتا رہتا تھا "اصل چیز یہی ہے ..... ایکٹرس کی زندگی پانچ نہیں سات برس!"

پہاڑن کا مزاج کافی تیز ہو گیا تھا۔ وہ کم ہی لوگوں سے ملتی تھی۔ اُس سے محبت جتانے والے لوگ بہت تھے۔ انھیں وہ منہ نہ لگاتی تھی۔ بنواری کی نصیحت تھی ...... "اس جنجال میں نہ پھنسنا۔ پریم ہمارا ہتھیار ہے۔ اس خنجر کو اپنے ہی پیٹ میں نہ گھونپ لینا۔"

پہاڑن پر کامیابی کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ لیکن اپنی پچھلی زندگی بھی خوب یاد تھی۔ اُس کے مقابلے میں اپنی کامیابی اور صلاحیت پر اسے اطمینان تھا۔ کبھی سوچتی۔ وہ سب جھمیلا نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا۔ جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ وہ دنیا کے لیے دل چسپی اور آنند بکھیرتی تھی۔ لیکن خود گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔

پہاڑن برکت سے بہت پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ برکت کو کئی بار ایکسٹرا میں کام ملا لیکن اسے دو تین روپے سے زیادہ کوئی نہیں دیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہاڑن اسے اپنے ساتھ ہیرو کا پارٹ دیے جانے پر ضد کرے۔ پہاڑن یہ کیسے کر سکتی تھی۔ برکت اسے پہاڑن کی بے وفائی سمجھتا تھا۔ اس بات پر دہ جھگڑا کرتا تھا۔ پہاڑن کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ "مجھے معاف کرو۔ تمھیں مجھ سے جو لینا ہو ایک بار لے لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

برکت جوا کھیلے بغیر نہ رہتا۔ پہاڑن اسے دو بار ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپیہ اس شرط پر دے چکی تھی کہ وہ اس کے یہاں سے چلا جائے گا۔ لیکن برکت روپیہ لے کر بھی نہیں گیا۔ ایکٹر بننے کی دھن چھوڑ کر اُس نے اپنے رہنے سہنے کا ڈھنگ بھی بدل لیا تھا۔ قمیض پتلون چھوڑ کر وہ ریشمی کُرتا اور تہمد پہننے لگا تھا۔ مونچھیں بھی بڑھا لی تھیں اور اُنھیں اینٹھ کر رکھتا تھا۔ ایک چھوٹا ڈنڈا ہاتھ میں رکھتا۔ بے وقت تال ٹھونک کر دھمکی

دیتا رہتا۔ "کہو تو دو ہاتھ لگوا دیں۔" دو چار آدمی اپنے ساتھ لگائے رکھتا۔ اُن کے نشہ پانی کا خرچ بھی اسی کے ذمّے تھا۔ ایک بار وہ کوکین کے معاملے میں پھنس گیا۔ پہاڑن نے اپنی بد نامی کے ڈر سے بنواری کو بھیج کر پولس کو دو سو روپے دے کر اُسے چھڑایا۔ اُس کے بعد کوتوالی کے لوگوں سے برکت کی دوستی ہو گئی تھی۔

پہاڑن کی شہرت اور اہمیت بڑھتی جا رہی تھی اور اُسی لحاظ سے آمدنی بھی۔ دادر کا فلیٹ چھوڑ کر وہ ایک بنگلے میں رہنے لگی تھی۔ ایک بڑی موٹر لے لی تھی۔ وہ پہلے بھی زیادہ چپ رہنے لگی تھی۔ برس بھر اُس نے نہ دن دیکھا نہ رات۔ ایک ساتھ چھ چھ کمپنیوں میں کام کرتی تھی۔ دوسری کمپنیاں بھی اسے کام دینے کے لیے بے چین تھیں۔ اُسے فرصت نہ ہونے سے انکار کر دینا پڑتا۔ بنواری کی نصیحتوں کا اب اُلٹا اثر ہو رہا تھا۔ پہاڑن سوچتی، میں کتنے دنوں تک لٹّو کی طرح ناچتی رہوں گی؟ آخر میرا کیا ہے؟ روپیہ کافی ہے۔ کیا چنڈال برکت کے لیے کماتی جاؤں؟ دوسرے ایکٹر، ایکٹرس روپیہ کماتے تھے اور اس کا زیادہ حصہ ریس اور شراب میں اُڑا دیتے تھے۔ پہاڑن ایسا نہ کرتی تھی۔ بینک میں اُس کی جمع رقم خوب بڑھ رہی تھی۔

برکت نے افواہ سنی تھی کہ کئی لوگ، پروڈیوسر سیٹھ بالت بھائی۔ پروڈیوسر سُتلی والا اور ڈائرکٹر زماں پہاڑن کے پیچھے پڑے ہیں کہ وہ ان سے بیاہ کرلے۔ اُس نے یہ بھی سنا کہ پہاڑن پروڈیوسر ستلی والا اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنواری سے محبت کرنے لگی ہے...... جلدی کسی کو لے کر بس جائے گی۔ اُس کا دل سینما سے پھٹ گیا ہے۔

برکت افواہ سُن کر شک میں پڑ گیا تھا۔ اُسے بنواری کی ایمان داری پر بھروسہ تھا۔ اُس نے پہاڑن کی بے غرض مدد کی تھی۔ برکت ان لوگوں سے ہوشیار رہنے لگا۔ وہ لوگ پہاڑن کے یہاں آتے تو برکت ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ ان سے جھگڑا۔ پہاڑن باہر جاتی تو رکھوالی کے لیے ڈرائیور کے ساتھ آگے کی سیٹ پر بیٹھ کر ساتھ جاتا تھا۔

برکت نے مشہور کرنا شروع کر دیا۔ "پہاڑن میری بیوی ہے۔ نکاح ہو چکا ہے.... کوئی سالا اس کی طرف آنکھ اُٹھائے گا تو آنکھ پھوڑ دوں گا۔"

پہاڑن کے لیے برکت کا طور طریقہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ سوچتی۔ 'یہ کب تک مجھے نوچ نوچ کر کھائے گا؟ کیا میں اس کی دُدھار گائے ہوں؟ مجھے کچھ ہو جائے یا کمانا بند کر دوں تو یہ یہاں سے ایسا بھاگے گا۔ جیسے آگ لگے گھر سے چوہے بھاگتے ہیں۔ یہ کون ہوتا ہے مجھ پر پہرہ دینے والا؟ اگر میں

بس جاؤں تو یہ مجھے روکنے والا کون ہے ؟ کیا میں ساری زندگی یوں ہی ٹھگی جانے کے خوف سے کانپتی رہوں ؟'

شام کے وقت اسٹوڈیو سے لوٹ کر بہاڑن تھکی ہوئی اور جھلائی ہوئی برآمدے میں بیٹھی تھی۔ 'نوادے' کمپنی کی نئی فلم "رنگیلی کنکیا" میں وہ پچاس ہزار کے معاہدے پر ہیروئن کا پارٹ کر رہی تھی۔ اُس دن اُس کے ندی میں نہانے کے سین کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ ڈائریکٹر خوش تھا۔ نہاتے وقت اس کا بدن زیادہ سے زیادہ دکھایا گیا تھا۔ ڈر تھا سنسر کے اعتراض کا۔

اسٹوڈیو کے قاعدے اور ڈسپلن کے مطابق سوما ڈائریکٹر زماں کی ہدایتوں پر چل رہی تھی۔ لیکن گاڑی میں لوٹتے وقت اسے یاد آگیا۔ پانچ سال پہلے کا واقعہ۔ وہ تالاب پر چادر میں پیٹی کپڑے دھو رہی تھی اور روشن سنگھ آگیا تھا۔ وہ شرم اور ڈر سے کیسے سمٹ گئی تھی! پھر لاہور کی کوٹھی میں منو بی بی اور بیرسٹر اچھے کپڑے پہن کر بازار چلنے کے لیے کہتے تو وہ شرم سے سمٹ جاتی تھی۔ رات میں سب لوگوں کے سو جانے پر صاحب کے کمرے میں جاتی تھی تو بتی جلانے سے پہلے ہوشیاری سے دیکھ لیتی کہ ساری کھڑکیوں پر پردے پڑے ہیں۔ اسے فخر تھا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب اسے کھول کھول سب کو دکھایا جاتا تھا۔

بہاڑن کے بنگلے کے دائیں طرف، چوراہے کے پار، ایک اونچی دیوار پر، اُس کی بہت بڑی تصویر باہیں پھیلائے ہوئے اُس کے سینے کا اُبھار دکھا رہی تھی۔ ریڈیو کی تیکھی آواز میں اُسے اپنا ہی سُر سنائی دے رہا تھا۔ "کس گلے ڈالو بہیاں، مورے سیّاں اِس بِدھ (طریقہ) کرو بریت"۔ سوما سوچ رہی تھی۔ میرا پریم ساری دنیا کے لیے بازاری چیز ہے۔ دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ بیرسٹر سے پوشیدہ محبت کی بات یاد کر کے اُس نے ایک گہری سانس کھینچی ...... یہ بھی کتنے دن تک چلے گا؟ پھر سوچا۔ اُسے کیا مل رہا ہے..... پیسہ! لیکن پیسہ تو اطمینان کے لیے ہوتا ہے۔ اطمینان کہاں تھا؟ کیوں نہ سب کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ بس جائے؟ اِس وقت لوگ اُس کی خوشامد کر رہے ہیں۔ چار برس بعد کون پوچھے گا؟ لیکن ایسا کون تھا؟ کس کا بھروسہ اور یقین کر سکتی تھی؟ محبت میں اپنے آپ کو بُھلا دینے کی بات وہ نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ زندگی کے لیے سہارا چاہتی تھی۔ پروڈیوسر بالت اور ڈائریکٹر زماں اُس کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ لیکن جن آدمیوں سے چھو جانے سے چھپکلی کو چھونے کی سی متلی ہوتی تھی۔ اُن کے ہاتھوں اپنے آپ کو کیسے سونپ سکتی تھی! اپنے آپ کو بیچنے کی ضرورت اسے رہی نہیں تھی۔

اور دوسرے لوگ بھی پہاڑن کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن بنواری اسے کسی کا، اپنا بھی بھروسہ نہ کرنے کی نصیحت کرتا تھا۔ اس لیے اسے بنواری پر ہی بھروسہ تھا۔ بنواری نے کبھی اس سے اپنا کوئی مطلب پورا کرنے کی کوشش نہ کرکے سدا اس کی مدد ہی کی تھی۔ کبھی اُدھار لیا تو ضد کرکے لوٹا دیا۔ سوما سوچتی، اگر بنواری سے بیاہ کرلے؟ اُس وقت سماج میں اُس کی حیثیت بنواری سے اونچی تھی۔ کچھ لوگ ہنستے۔ سوما کو کسی کے ہنسنے کی پروا نہ تھی۔ سوچتی: ہم لوگ کہیں دُور پہاڑوں میں جا بسیں گے۔

بنواری سوما کے یہاں بیٹھ کر گھنٹوں بات کرتا رہتا۔ شراب منگوا کر پی لیتا۔ مگر اُس کی نگاہوں میں وہ بات کبھی نہ آئی جو مرد کی آنکھوں میں عورت کو دیکھ کر آتی ہے۔ پہاڑن اپنے آپ کو بنواری کے حوالے کر دینے کے واضح اشارے کر چکی تھی۔ جنھیں یاد کرکے پہاڑن کو شرم سی محسوس ہونے لگتی مگر بنواری کی یہ بے پروائی اسے اور بھی اپنی طرف کھینچتی تھی۔

پہاڑن ایسی ہی تکلیف دہ اُلجھنوں میں پھنسی ہوئی تھی کہ سامنے سڑک پر بنواری پیدل آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس کے اندر آجانے پر ایک گہری سانس لے کر پہاڑن نے طے کر لیا۔ آج اُس سے آخری بات ہو جائے!

بنواری اپنے دُبلے جسم کو ایک بڑی کرسی کی آدھی سے بھی کم جگہ میں سمیٹ کر بیٹھ گیا اور اُس نے پوچھا۔ "کچھ سست ہو، کیا بات ہے؟ ہماری تو آج پینے کی طبعیت ہے۔"

"میں تو اب تنگ آگئی ہوں۔"

"کس سے؟"

"زندگی سے۔ پیار کرنے والوں سے۔ کل بالت بھائی نے سر کھایا، آج زماں صاحب نے۔"

"مبارک باد۔ نکلواؤ بوتل اسی بات پر۔ ابھی تمہارا بھاؤ بڑھ رہا ہے۔"

"میں بھاؤ بازار کی چیز ہوں؟" پہاڑن نے اُس کی آنکھوں میں گھور کر پوچھا۔ "شرم نہیں آتی؟ تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو؟"

"آج تم بگڑی بیٹھی ہو۔" بنواری جھینپ گیا۔

"میں دُکھی ہوں۔" پہاڑن نے آنچل سے چہرہ ڈھانک لیا۔

"بات کیا ہے پہاڑن؟" بنواری نے پوچھا۔

"تم بتاؤ میں کیا کروں؟ تم خود ہی کہتے ہو، یہ رنگ ڈھنگ بہت چلے گا تو چار پانچ برس

چل سکے گا۔"

"سچ مچ بیاہ کی بات سوچ رہی ہو؟ تمہیں کس پر بھروسہ ہے؟"

"تم پر" پہاڑن نے پھر آنچل سے منہ ڈھانک لیا۔

"تم دھوکے میں ہو۔" بنواری ہنس دیا۔ "تم سے اداکاری نہیں بنھ رہی ہے تو کسی بڑے اسامی کو پکڑو۔ جس کی عمر کافی ہو۔ اور سنو پہلے عدالت میں بیاہ کرلینا تب پریم! اچھا ہم چلتے ہیں۔" بنواری اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو میں منگواتی ہوں۔" پہاڑن نے آنکھیں پونچھ لیں۔

"نہیں، اب نہیں پیئں گے۔ ہم دل بہلانے کے لیے آئے تھے۔ تم اپنا غم سنا رہی ہو۔" بنواری چلا گیا۔

پہاڑن غصے میں دانت پیس کر رہ گئی۔ 'یہی ایک آدمی ہے جسے میں بھروسے کے لائق سمجھتی ہوں۔ وہ ایمانداری سے کہہ رہا تھا کہ مجھ سے دل بہلانے آیا تھا۔ آگ لگے اس کی ایمانداری میں۔'

پہاڑن نے سوچا، 'دنیا میرے گلے میں باہنہ ڈال کر کھیلنا چاہتی ہے۔ لیکن باہنہ تھام کر سہارا دینے کے لیے کوئی تیار نہیں!'

مالکوں کی ادلا بدلی

دھن سنگھ سرکار سے جان بچانے کے لیے بھاگتا ہوا، سپاہی کی وردی پہن کر سرکاری آدمی بن گیا۔ ساری کارروائی قاعدے کے مطابق ہوئی۔ اُس کے جسم کو ٹھونک بجاکر دیکھا گیا کہ اس کی صحت سرکاری کام اچھی طرح کرنے کے لائق ہے یا نہیں۔ فوجی دفتر سے اس کے بتائے ہوئے گاؤں کے خیالی پتے پر پوچھ تاچھ کے لیے تھانے میں کاغذ بھیجے گئے کہ وہ سرکاری کام کرنے کے سلسلے میں بھروسے کے لائق ہے یا نہیں؟ ضابطے اور قانون کی نمائش کے نیچے ہر جگہ کھوکھلی تھی۔ سرکار کو اُس وقت آدمیوں کی ضرورت تھی۔ صحت کی جانچ کرنے والے ڈاکٹر نے اُس کے کپڑے اُتارتے ہی، اس چھوٹے سے آدمی کو چھوئے بغیر ناک سکوڑ کر انگریز سرکار کے دشمنوں کی گولی کھانے کے لائق سمجھ لیا۔ ضلع ہوشیارپور میں جنت پوری تھانے سے اس کے قابل بھروسہ ہونے کے سوال پر تحقیقات کی گئی تھی۔ تھانے کے منشی نے سپاہی کو گاؤں میں جاکر تحقیقات کرنے کا حکم دیا۔ سپاہی نے کسی فائدے کی امید نہ دیکھ کر چودہ میل ایڑیاں رگڑے بغیر ہی دوسرے دن جواب دے دیا کہ اعتراض کے لیے کوئی وجہ نہیں تھی۔

دھن سنگھ کا ٹرائل لیا گیا۔ دھن سنگھ نے لگ بھگ برس بھر بعد موٹر کے اسٹیرنگ، کلچ اور بریک کو چھوا۔ انجن کی گمگماہٹ کی گونج سنی۔ اس نے محسوس کیا، اس کی زندگی پرانے ڈھرے پر واپس آگئی تھی۔ پیٹ بھر کھانا۔ بارک میں پوری نیند اور موٹر چلانے کا کام۔ جو اس کے جسم کے مطابق ہو چکا تھا۔ وہ دوسرے ملک اور سماج میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں سب وردیاں پہنے تھے۔ حکم، چستی، پھرتی اور سپاہیانہ بول چال تھی۔ وہاں سب جوان تھے! جاؤ جوان! کھاؤ جوان! مرو جوان! یہاں عزت اور بے عزتی کا روپ بھی الگ تھا۔

خاکی وردی پہنے سارے لوگ دیش کے بھوکے ننگے، سکڑے سمٹے لوگوں کے مقابلے میں طاقت ور اور عزت دار تھے۔ اس سماج میں سپاہی سے نائک، نائک سے جمعدار اور جمعدار سے صوبے دار گالی اور بوٹ کی ٹھوکر کے بغیر بات نہیں کرتا تھا۔ گالی اور ٹھوکر کی کوئی مخالفت بھی نہیں تھی۔ ہر طرف حکم کا راج تھا۔ چھاؤنی کے اس سماج میں آدمیوں کے کئی درجے تھے۔ یہ درجے وردی سے پہچانے

جاتے تھے۔ جس وردی پر فیتے کی ایک قطار یا بیتل کی ایک پھلی بڑھ جاتی، اُس کی طاقت اور احترام بڑھ جاتا۔ عام سپاہیوں کو عورت کو ساتھ رکھنے کا اختیار نہ تھا۔ لیکن بڑے افسر قیمتی کپڑوں میں ملبوس، گوری گوری، لچکیلی عورتوں کو ساتھ لے کر شان سے چلتے تھے اور بنگلوں میں رہتے تھے۔ دھرم شالہ میں بھی لالہ جی، بیرسٹر صاحب، منّو بی بی، اِن کے بھائی بند، بڑے لوگ جن کے پاس روپیہ تھا، ایسے ہی رہتے تھے۔ افسر حکم دیتے تھے اور سپاہی پورا کرتے تھے۔

مورچے پر سپاہی کی زندگی غیر معمولی تھی۔ ایک تناؤ تھا۔ وہاں سوچنے اور خواہش کی بات نہ تھی۔ صرف حکم تھا۔ وہاں عورتیں نہیں تھیں۔ بچے نہیں تھے۔ سوراج کے لیے انگریزوں سے لڑنے والے ہندوستانی کی کوئی بات نہ تھی۔ نہ انقلاب زندہ باد تھا۔ نہ مہاتما گاندھی جی کی جے۔ نہ سوبھاش بابو کی جے۔ نہ جیل جانے کی باتیں۔ چھاؤنی کے بارکوں کی یہ دنیا باقی ہندوستان کی دنیا سے بالکل الگ تھی۔ یہاں کانگرس، سوشلسٹ، کمیونسٹ اور سیاست کی کوئی بات نہ تھی۔ کبھی پڑھے لکھے بازار جاتے تو اخبار پڑھ لیتے۔ دوسری دنیا کی باتیں جان پاتے اور دوسروں کو بتا دیتے تھے۔ عام طور پر کانگریسی اخبار پڑھنا منع تھا۔ یہاں بات چیت، پریڈ، راشن اور فرنٹ (مورچے) کی ہوتی تھی۔ کبھی عورت دکھائی دے جاتی تو اُس کے بارے میں ویسی ہی باتیں ہوتی تھیں جیسے کھیت سے اوکھ یا مولی چوری سے اُکھاڑ لینے کی بات ہوتی ہے۔

دھن سنگھ کا ظاہری رُوپ بدل گیا تھا۔ لیکن اُس کے دلی خیالات نہیں بدلے تھے۔ اُس کی اصل زندگی انگریزی سرکار کے ختم ہو جانے اور سوراج مل جانے پر ہی ممکن تھی۔ اُسی وقت وہ پہاڑوں میں جا کر سوما کو واپس پا سکتا تھا۔ اسے سوما کی آنسوؤں سے بھیگی صورت دکھائی دیتی رہتی۔ بے چاری میرے انتظار میں لالہ جی کی کوٹھی میں نوکرانی کا کام کرتی ہوگی۔ اُسے اپنی جیسی وردی پہنے سارے لوگ اپنے دیس اور جنتا کے دشمن دکھائی دیتے تھے۔ جو انگریزی سرکار کو دیس میں جمائے ہوئے تھے۔ جو دیس بھر میں ریل کی پٹڑیوں پر کھڑے ہو کر انگریزی سرکار کی حفاظت کے لیے پہرہ دیتے تھے۔ وہ سنتا کہ تین چار لاکھ ایسے آدمی ہیں تو مایوس ہو جاتا۔ انگریزوں کا راج کیسے ختم ہوگا؟ سب کو اپنے پیٹ کی فکر ہے، آزادی کوئی نہیں چاہتا۔ لوگ اپنی خواہش سے غلام بنے ہیں۔

دھن سنگھ اچھا ڈرائیور تھا۔ اُس کی ڈیوٹی اسٹاف کار چلانے پر لگی تھی۔ عام سپاہی چھاؤنی سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ افسروں کے لیے یہ پابندی نہیں تھی۔ برسات کے دن تھے۔ رات میں موسلا دھار بارش ہونے پر بھی میجر صاحب آدھی رات تک کلب میں ناچتے رہتے تھے۔ دھن سنگھ کلب کی ڈیوٹی میں

بوچھار کی وجہ سے گاڑی میں سمٹا ہوا، ان کا کھیل ختم ہونے کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ کبھی ایک میم کو کبھی دوسری کو ساتھ لیے بازاروں اور ہوٹلوں میں گھومتے رہتے تھے۔ سب افسروں کو صاحب اور اُن کے ساتھ گھومنے والی عورتوں کو چاہے وہ ہندوستانی ہوں میم صاحب پکارا جاتا تھا۔ دھن سنگھ سوچتا تھا۔ انھیں سوراج کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ یہ لوگ سوراج کیوں ملنے دیں گے؟ یہ تو انگریزوں ہی کے بھائی بند ہیں۔ بڑے لوگوں، امیر لوگوں کو سوراج کی کیا ضرورت ہے؟ انھیں کیا تکلیف ہے؟ انگریزوں نے اپنا راج چلانے کے لیے کافی لوگوں کو اپنی طرف سمیٹ لیا ہے۔

دھن سنگھ اور میجر صاحب کے اردلی سپاہی یار محمد کی دوستی ہو گئی تھی۔ یار محمد بہت ہنسوڑ آدمی تھا۔ صاحب کے سامنے وہ بہت خاموش اور فرماں بردار بنا رہتا تھا۔ مگر پیٹھ پیچھے ان کا خوب مذاق اُڑاتا تھا۔ وہ اردلی کے کام کے لیے بہت لائق سمجھا جاتا تھا۔ کوئی افسر بدل کر آئے، اردلی وہی رہتا تھا۔

یار محمد دھن سنگھ کو سمجھاتا تھا۔ بے وقوف اکڑ خاں لوگ اردلی کی ڈیوٹی پسند نہیں کرتے۔ اس ڈیوٹی میں بہت مزا اور آرام ہے۔ قواعد پریڈ سے چھٹی۔ بس تن کر سلام کرو۔ صاحب کے جوتے پیٹی پالش کر دیے تو کیا۔ چار گھنٹے کی پریڈ میں کون جسم توڑے!

یار محمد خلافت اور کانگریس کی تحریکوں میں کام کر چکا تھا۔ وہ کہتا تھا "ہمیں اُس میں بھی مزے تھے۔ والنٹیروں کو خوب حلوہ پوری ملتی تھی۔ اس میں بھی ہم اپنی ڈیوٹی لیڈروں کی چاکری میں لگوا لیتے تھے۔ خلافت کانگریس دب گئی تو ہم اِدھر آ گئے۔ اسی میں عقل مندی ہے۔ خدا نے گیدڑ بنا کر پیدا کیا ہے۔ شیر تو نہیں بن جائیں گے۔ لیکن شیر کے پیچھے لگے رہو۔ شیر کا جوٹھا بھی اپنے لیے بہت ہے۔" دھن سنگھ اس کی باتوں پر خوب ہنستا۔ لیکن تنہائی میں یار محمد کی باتوں سے اُسے مایوسی ہوتی۔

دھن سنگھ کی کمپنی کی تبدیلی پہاڑی سڑکوں پر گاڑی چلانے کی عادت ڈالنے کے لیے رانی کھیت چھاؤنی میں ہو گئی تھی۔ پہاڑوں کو دیکھ کر دھن سنگھ کو اپنا دیس اور سوما اور بھی زیادہ یاد آنے لگے۔ کمایوں کے پہاڑ بہت کچھ کانگڑا کے پہاڑوں جیسے تھے۔ لیکن فرق بھی تھا۔ ان پہاڑوں کے مرد اور عورت مختلف تھے۔ سب سے بڑا فرق یہ کہ وہ سب کانگڑا کی بولی نہیں بولتے تھے۔ دھن سنگھ جب خالی ٹرک سڑکوں پر چلاتے وقت مسافروں سے بھری گاڑیوں کو دیکھتا تو اسے ان ڈرائیوروں پر رشک آتا۔ چھاؤنی میں ہر روز زخمی انگریز اور امریکن سپاہی گاڑیوں پر آتے رہتے تھے۔ کبھی ہندوستانی سپاہی بھی آ جاتے تھے۔

سڑک کے کنارے اور پہاڑوں پر ہر جگہ فوجی انتظام تھا۔ سپاہی پہاڑوں میں لڑائی کی تعلیم پا رہے تھے۔ دھن سنگھ نے کبھی نہیں سمجھا تھا کہ یہ دیس اتنا بڑا ہے اور انگریز سرکار کی طاقت اتنی پھیلی ہوئی ہے۔ ہزار دس ہزار سپاہیوں کا مر جانا انگریزی سرکار کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ دھن سنگھ کو اپنا وجود بالکل فضول معلوم ہوتا۔ لڑائی کے مورچے سے ہزاروں میل دور بھی انگریز، امریکن، اور ہندوستانی زخمی سپاہی گاڑیوں میں بھرے چلے آ رہے تھے۔ اسے بھی جلد ہی لڑائی کے مورچے پر جانا تھا۔ چھاؤنی میں سپاہیوں کو فوجی اخبار دیا جاتا تھا۔ اس اخبار میں انگریزوں کی جیت کی ہی خبریں ہوتی تھیں۔ رانی کھیت کے بازار میں وہ لوگوں کو دوسرے اخبار پڑھتے دیکھتا تھا۔ سپاہیوں کو وہ اخبار پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ان کے کانوں میں بھنک پڑتی کہ انگریز ہار رہے تھے۔

دھن سنگھ کی کمپنی مورچے پر بھیج دی گئی۔ تین راتیں ریل میں رہنے کے بعد اور جہاز پر ندی پار کر کے وہ گوہاٹی پہنچا، گوہاٹی سے دیماپور۔ دیماپور اسٹیشن کے ساتھ ہی خوب چوڑی سڑک کے دونوں طرف بانس کی ٹٹیوں اور چھپروں کا ایک شہر بسا ہوا تھا۔ چھپر بہت قرینے سے قطاروں میں تھے۔ بستی صرف خاکی وردی پہنے سپاہیوں کی تھی۔ دس میل تک صرف سپاہی سپاہی تھے۔ ہزاروں سپاہی، موٹر اور توپیں روزانہ آ رہی تھیں۔ دھن سنگھ اتنا انتظام دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ اتنی بڑی طاقت کو کون توڑ سکتا تھا۔

دھن سنگھ کنوائے (فوجی گاڑیوں کا کارواں) میں لاری چلاتا تھا۔ چار موٹریں ایک ساتھ چل سکنے کے لائق چوڑی سڑک پر کنوائے منی پور آتے جاتے تھے۔ لاریوں پر جال ڈال کر جالوں میں درختوں کی ٹہنیاں اور جھاڑ پھنسا دیے جاتے تھے۔ تاکہ آسمان میں اڑنے والے جاپانی ہوائی جہاز لاریوں کو نہ دیکھ سکیں۔ سپاہیوں سے بھری ہوئی یا سامان سے لدی ہوئی لاریاں ایک دوسری کے پیچھے دھیمے دھیمے سنبھل سنبھل کر آگے پیچھے سے اشارے لے کر چلتی تھیں۔ سڑک پر پچاسوں لاریوں کے ایک ساتھ چلنے سے اور سر پر منڈلاتے ہوئے ہوائی جہازوں کی گونج سے پہاڑی گھاٹیاں تھراتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ قیامت میں آسمان اور زمین کانپ رہے ہوں۔

کوہیما کی اونچی چڑھائیوں کے پار منی پور کے نزدیک پہنچنے پر توپوں اور بندوقوں کی آوازیں ایسی سنائی پڑتیں، جیسے گولیوں کی بارش ہو رہی ہو اور توپوں کی گڑگڑاہٹ بادلوں کی گرج بن گئی ہو۔ گھنے جنگلوں میں آدھی رات کا اندھیرا، موسلادھار بارش، کوئی بھی اڑچن سپاہیوں کے مورچے کی طرف جانے اور زخمیوں کی واپسی کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی تھی۔ صرف آسمان سے بموں کی بارش

ہونے پر کنوائے کے آگے یا پیچھے چلنے والی گاڑیوں سے پیغام ملنے پر لاریاں رُک جاتی تھیں۔ جب تک رُک جانے کا حکم نہ ملتا، ڈرائیور آسمان میں اُڑتے ہوائی جہازوں کو اپنے جہاز سمجھتے رہتے تھے۔

دھن سنگھ مسلسل اسی ماحول میں رہ کر موت کے اس خوف کو زندگی کا معمولی حصّہ سمجھنے لگا تھا۔ کبھی کبھی سڑکوں پر بموں کی بارش سے لاریاں اُڑ جاتیں۔ سڑکیں ٹوٹ جاتیں۔ بموں کی بارش رُکنے پر پھر سڑک دُرست کر دی جاتی اور لاریاں چلنے لگتیں۔ زندگی کی اس خوف ناک مصیبت میں ایک ساتھ چلنے والے لوگ ماں، باپ اور بھائی بہنوں سے بھی سگے بن گئے تھے۔ وہ زندگی کو خطرے میں دیکھ کر بھی دوسروں کو مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ جانے کی بات نہیں سوچتے تھے۔ آپس میں کوئی اختلاف اور پردہ نہ تھا۔ کسی طرح کا بھی پردہ نہیں۔ نہ جسمانی نہ ذہنی۔ زندگی کے سارے ضروری کام وہ ایک دوسرے کے سامنے اور ایک ساتھ کر سکتے تھے۔ بغیر کسی جھجک کے ہر بات کہہ اور سن لیتے تھے۔ مردان، جواہر، پہلو ان سنگھ، کھیم سنگھ، دھن سنگھ آپس میں سگے بھائیوں جیسے ہو گئے تھے۔ وہ لوگ جسم اور ذہن میں مسلسل تناؤ کو بھلانے اور طاقت محسوس کرنے کے لیے سدا گالی دے کر باتیں کرتے تھے۔ محبت، غصّہ، دکھ سکھ، سب کا گالیوں میں اظہار کرتے تھے۔

منی پور سے ٹرک میں مورچے کے لیے سپاہیوں کو لے کر یا گولہ بارود لاد کر، یا مورچے پر لڑنے والے سپاہیوں کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر منی پور کی طرف جانے میں، اور وہاں سے زخمی سپاہیوں کو لے کر واپس آنے میں چالیس، اڑتالیس اور کبھی ساٹھ گھنٹے لگ جاتے تھے۔ اتنے وقت تک دھن سنگھ اور اُس کے قافلے کے لوگ تلوار کی دھار پر رہتے تھے۔ لیکن انھیں اپنی بہادری پر فخر کرنے کا بھی موقع نہ تھا۔ کوئی ایک آدمی تو ایسی ہمت نہیں دکھا رہا تھا۔ سب ہی لوگ ایسا کر رہے تھے۔ انھیں سونے اور کھانے کے لیے فرصت نہیں ملتی تھی۔ چبینا پھانکتے رہتے تھے۔ آسمان سے گولے گرتے وقت گاڑیوں کو روک دینے کا حکم ملنے پر، آسمان سے برستی موت کے نیچے ڈرائیوروں کو نیند آجاتی۔ کسی کو خیال نہ آتا کہ وہ ساٹھ ستّر روپے ماہوار کے لیے سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ وہ اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے تھے۔

مورچے سے لوٹنے پر کمپنی کمانڈر کے حکم سے ڈرائیوروں کو چھٹانک بھر رم (شراب) مل جاتی تھی۔ کیمپ میں لگ بھگ چوبیس، بتیس گھنٹے آرام کے لیے مل جاتے تھے۔ گاڑیوں کو نزدیک کے نالے پر لے جا کر دھونا اور صاف کرنا ہوتا تھا۔ فرصت کے وقت کینٹین میں اپنے پیسے سے سستی شراب پی سکتے تھے۔ اس سے بھی جی نہ بھرتا تو ریستوران میں جا کر "جونگ" (دیہاتی شراب) پی لیتے تھے۔ کیمپوں میں اننّاس، نارنگی اور اُبلے ہوئے انڈے بیچنے والی عورتوں سے خرید کر کھاتے اور اُن سے دل لگی کرتے۔

اور چوری سے آس پاس کی بستیوں میں ٹہلنے چلے جاتے۔ جگہ جگہ بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں جن میں بہادر ہندوستانی سپاہی جاپانی راکشس کو کچل رہا تھا۔ جگہ جگہ ملیریا، آتشک اور سوزاک سے ہوشیار رہنے کی ہدایتیں لکھی ہوئی تھیں۔ سپاہیوں کے بدن اور دل کی تھکن دور کرنے کے لیے افسران گراموفون پر ریکارڈ بجواتے تھے۔ سینما بھی دکھایا جاتا تھا۔ کبھی کبھی گانے اور ناچنے والے لوگ بھی بلا لیے جاتے تھے۔ لیکن سپاہیوں کا سب سے بڑا من بہلاؤ کیمپ کے قریب کی بستیوں میں گھومنے سے ہوتا تھا۔ کیمپ سے باہر جانے پر کبھی پابندی تھی۔ فوجی پولس پہرہ دیتی تھی۔ حکم نہ ماننے پر گولی بھی ماری جاسکتی تھی۔ لیکن سبھی جانتے تھے کہ اتنی کٹھنائی اور جوکھم میں کام کرانا تھا تو قانون کی پابندی کہاں تک کی جاسکتی تھی۔ سپاہیوں کو زیادہ ڈرانا اور غیر مطمئن رکھنا بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

سپاہی مسلسل خطرے میں رہنے کی وجہ سے خطرے کی پروا نہ کرنا سیکھ گئے تھے۔ طبیعت میں آوارہ پن اُبھرتا تو سورج ڈوبنے کے بعد کی حاضری کے بعد چوری چوری کیمپ سے نکل کر بستیوں میں چلے جاتے۔ ایسے جرم کے لیے کبھی ایک دو کو سزا بھی دے دی جاتی۔ لیکن عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا۔ لیکن سپاہی اگر آپس میں جنگ کی رفتار کے بارے میں، نزدیک آتے ہوئے دشمن سے خوف کے بارے میں اور جاپانیوں یا آزاد ہند فوج کے بارے میں بات کریں تو اس جرم کی معافی نہیں تھی۔ جاپانیوں کے تیزی سے بڑھتے چلے آنے کی بات انھیں کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ ایسی باتیں صرف بہت اونچے افسر جانتے تھے۔

کیمپ میں حفاظتی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ زخمی سپاہی بڑی تعداد میں آ رہے تھے۔ کنوائے چھوٹے چھوٹے بنوا دیئے گئے تھے۔ سپاہیوں کو خطرہ رہتا تھا کہ دشمن بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ایک دن دھن سنگھ نے اپنے پیچھے لاری میں زخمی سپاہیوں کو بات کرتے سُنا..... "لاٹن سے پچاس قدم پر کھڈ تھی۔ کھڈ کے پار سے آزاد ہند فوج کے سپاہیوں نے گالی دے کر للکارا۔ "مادر...... انگریزوں کے کُتّے! اپنے بھائیوں پر گولی چلا کر اپنی جان دو گے؟" ہم نے جواب میں اور زور سے گولی چلائی...... ،، دھن سنگھ نے سُنا۔ اس کی چھپی ہوئی دلی خواہش نے سر اُٹھایا۔ لیکن یہ بات وہ کسی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

اپریل کے دوسرے ہفتے میں دھن سنگھ چالیس ٹرکوں کے قافلے میں کوہیما سے زخمیوں کو لا رہا تھا۔ دشمن کے ہوائی جہاز سر پر آ کر چیلوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر بم گرا رہے تھے۔ انتشار، املا اور رفتار فلہ

گھنے پیڑوں کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ سڑک پر قافلے کے آگے پیچھے بموں کے پھٹنے کی آواز ہوئی۔ قافلہ چھ گھنٹے تک دم سادھے کھڑا رہا۔ اندھیرا ہو جانے پر قافلہ چلا اور رات بھر روشنی کے بغیر سرکتا رہا۔ صبح کے وقت پھر دشمن کے ہوائی جہاز آ گئے۔ قافلہ پھر رُک گیا۔ پھر بم گرنے لگے۔ آخری دو ٹرک اُڑ گئے تھے۔ تیسرے پہر قافلہ دیما پور پہنچا۔ دیما پور پہنچ کر ڈرائیور بموں کے گرنے پر ہنس رہے تھے۔ مردان سنگھ اور بانو سنگھ آخر کے دو ٹرکوں کے ساتھ اُڑ گئے تھے۔

قافلے نے زخمیوں کو ہسپتال میں اُتار کر ٹرکوں کو قطار میں کھڑا کر دیا تھا۔ کپتان صاحب نے سب ڈرائیوروں کو اپنے ہاتھ سے پیٹھ پر شاباشی دی۔ بڑے انگریز افسر نے بھی ڈرائیوروں کی طرف تعریف کی نظر سے دیکھ کر سر ہلایا اور مسکرائے۔ سارے سپاہیوں کو گودام سے ایک ایک چھٹانک رم، بسکٹ اور مٹھائی کا راشن ملا۔ ٹرک دھونے کا کام دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

دھن سنگھ اور توتا سنگھ سگریٹ سلگا کر ٹہل رہے تھے۔ توتا سنگھ نے صلاح دی "چل کینٹین میں اور شراب پئیں۔"

دھن سنگھ نے انکار کر دیا۔ توتا سنگھ نے گالی دے کر کہا "پیسہ ساتھ لے جائے گا سالے! پرسوں مردان اور باتو کی طرح اُڑ جائے گا تو پیسہ کیا ...... میں رکھ لے گا!"

"چل ......" دھن سنگھ نے پیار سے گالی دے کر منظور کر لیا۔ دونوں نے کینٹین سے ایک ایک چھٹانک شراب اور پی لی۔ وہ اور بھی پینا چاہتے تھے لیکن کینٹین والے کو ایک وقت میں اس سے زیادہ دینے کا حکم نہ تھا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے اُدھر چلے گئے جہاں بستیوں سے عورتیں آ کر اناناس اور دوسری چیزیں بیچتی تھیں۔ توتا سنگھ دھن سنگھ کی بانہہ میں ہاتھ ڈالے ٹہل ٹہل کر عورتوں میں سے جوان چھوکریوں کو دیکھ کر اپنی رائے دے رہا تھا۔ وہ تھونگما کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس نے دھن سنگھ سے کہا "مادر...... بالکل پٹاخہ ہے پھوٹنے کے لیے تیار!"

تھونگما کٹے ہوئے اناناس میں نمک مرچ لگا کر کیلے کے پتوں پر رکھ کر بیچ رہی تھی۔ دو آنے میں ایک ایک پتہ دے رہی تھی۔ تھونگما کے پھولے پھولے ہونٹ پان سے لال تھے۔ چوڑے گول چہرے پر دبی دبی لمبی آنکھیں۔ دھن سنگھ کے لیے اِن چہروں کی عمر پہچان لینا مشکل تھا۔ ٹھوس گدگدے بدن سے بیس بائیس کی لگتی تھی۔ تھونگما رنگین دھاری دار چادر میں لپٹی سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ توتا سنگھ دھن سنگھ کی بانہہ میں بانہہ ڈالے، پنجوں پر بوجھ دے کر تھونگما کے سامنے اُکڑوں بیٹھ گیا۔ اناناس کے دو پتے لیے۔ ایک دھن سنگھ کے لیے۔ ایک اپنے واسطے۔

توتا سنگھ نے ایک روپے کا نوٹ دیا۔ تھونگما نے بارہ آنے اُس کی طرف بڑھا دیے۔ توتا سنگھ نے پیسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور تھونگما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا۔

تھونگما مسکرا دی۔ اُس نے پیسوں سمیت ہاتھ کھینچ لیا۔

توتا سنگھ نے پوچھا۔" جونگ ہے ؟"

گاؤں میں ہے۔" تھونگما نے جواب دیا۔

توتا سنگھ نے ایک روپیہ اور تھونگما کو تھما دیا۔ تھونگما نے اپنے باقی پانچ سات پتے ڈلیا میں سمیٹ لیے اور اُٹھ گئی۔ اُس سے بیس قدم پیچھے پیچھے توتا سنگھ اور دھن سنگھ ٹہلتے ہوئے چلنے لگے۔ تھونگما کا گاؤں کیمپ سے ڈھائی میل دور تھا۔ توتا سنگھ نے دو کلھڑ جونگ پی۔ دھن سنگھ کو بھی پلائی۔ توتا سنگھ نے دھن سنگھ سے بھی ایک روپیہ دلا دیا۔ توتا سنگھ تھونگما سے بے ہودہ مذاق کرنے لگا۔

تھونگما نے مسکرا کر کہا۔" ہم چینی لے گا۔ کپڑا لے گا۔"

توتا سنگھ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر زبان دی۔" اتنا چینی دے گا۔ کمبل دے گا۔"

سورج ڈوب رہا تھا۔ توتا سنگھ نے دھن سنگھ کو یاد دلایا۔" ما ...... حاضری کا وقت ہو رہا ہے۔"

دونوں لوٹ پڑے۔ راہ میں دیر ہو جانے کے ڈر سے انھیں دوڑنا بھی پڑا۔

دوسرے دن نالے پر ٹرک دھوتے وقت توتا سنگھ نے دھن سنگھ سے کہا۔" سالی کو سیر بھر چینی اور ایک کمبل تھما دیں گے۔ دونوں مزا لے لیں گے۔"

دھن سنگھ کو بات اچھی نہیں لگی۔ چینی کمبل دے دینے میں کچھ بھی مشکل نہیں تھی۔ کوہیما میں اس نے سڑک کے کنارے چار پیکٹ سگریٹ کے بدلے ایک فوجی کمبل لاری میں سے نکال کر دے دیا تھا۔ سرکاری مال کا کیا تھا؟ وہ سوچنے لگا۔ توتا بڑا بد معاش ہے۔ رنڈی بازی کرتا ہے۔ ایسے ہی جھگڑے میں میں دو کی جان لے کر آیا ہوں۔ یہاں تو دنیا ہی ایسی ہے۔

دو دن کی چھٹی کے بعد بھی تین دن تک دھن سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کی ڈیوٹی قافلے میں نہیں لگی۔ ڈرائیوروں نے آپس میں گپ شپ کی۔ شاید سڑک جاپانیوں نے لے لی ہوگی۔ اس بات سے انھیں کوئی فکر تھی اور نہ ڈر۔ دھن سنگھ دن میں خوب سوتا اور ٹہلتا رہتا، اس لیے رات میں اسے نیند نہ آتی۔ لیٹا لیٹا سوچتا۔ جاپانی جیت جائیں تو اچھا ہو! جانے کتنے دن لگیں گے؟ ..... تھونگما۔

پورے تین ہفتے گزر گئے۔ قافلے کوہیما اور منی پور کی طرف نہیں گئے۔ بلکہ دیما پور سے گوہاٹی

کی طرف زخمیوں کو لے کر جاتے تھے اور نئے سپاہیوں کو لا رہے تھے۔ موٹروں اور ریل سے بھی بہت بڑی تعداد میں سپاہی آ رہے تھے۔ افواہ تھی کہ مورچے پر بنگال سے ہوائی جہازوں پر سپاہی آ رہے تھے۔ لڑائی بہت زوروں پر ہو رہی تھی۔ برسات بھر دھن سنگھ گوہاٹی کی طرف قافلے میں جاتا رہا۔ برسات سے سڑک ٹوٹ جاتی تھی تو قافلہ دو دو دن رُکا رہ جاتا تھا۔

ستمبر میں جاپانی اور آزاد ہند فوج پیچھے ہٹ گئی۔ دھن سنگھ کا قافلہ پھر منی پور کی طرف جانے لگا۔ قافلہ دمیاپور لوٹ رہا تھا۔ اُس کی گاڑی سب سے آگے تھی۔ اُس کے ساتھ وائرلیس کا آدمی بیٹھا تھا۔ گاڑیاں ڈھلوان پر بریک لگا کر آہستہ آہستہ اُتر رہی تھیں۔ یکایک دھن سنگھ کی گاڑی کے بونٹ پر گولیاں آ پڑیں۔ اور ایک گولی اُس کی بانہہ کو چھید گئی۔ ساتھ بیٹھے وائرلیس والے آدمی کی کن پٹی پر گولی لگی۔ وہ منھ سے کوئی لفظ نکالے بغیر لڑھک گیا۔ گاڑی کے ایک پہیے کا ٹائر گولی سے پھٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی سڑک کے کنارے کھائی میں گر رہی تھی۔ دھن سنگھ نے بڑی مشکلوں سے ایک ہی ہاتھ سے اُسے بچا لیا۔

سڑک کے کنارے سے اسٹین گن (بندوق) کی کئی نالیاں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ کیچڑ میں کئی لت پت ہندوستانی سپاہیوں کے چہرے سامنے آ گئے۔ انھوں نے للکارا "اپنے ملک اور قوم کے لیے ہماری طرف آتے ہو تو گاڑی روک دو۔"

دھن سنگھ نے سمجھ لیا۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی تھے۔ اُس نے اپنے کو حوالہ کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اُس کے پیچھے آنے والے ٹرک بھی رُک گئے۔ سارے ڈرائیور ہاتھ اُٹھا کر گاڑیوں سے اُتر گئے۔ ٹرکوں میں انگریز زخمی سپاہی بھرے ہوئے تھے۔ آزاد ہند فوج کے افسر کے حکم سے ڈرائیوروں نے فٹ بورڈ پر کھڑے ہو کر گاڑیوں کو چلا کر کھڈ میں لڑھکا دیا۔ ٹرک سڑک سے گر کر لڑھکتے اُچھلتے نیچے چلے گئے۔ ان میں پڑے زخمی انگریز اور امریکن بکھر گئے۔ ڈرائیوروں نے رائفل لے لی اور آزاد ہند فوج کے ساتھ 'جے ہند' کا نعرہ لگا کر کھڈ میں اُتر کر جنگلوں میں پورب کی طرف چلے گئے۔

قافلے کے بیس ڈرائیور اور بیس سنتری آزاد ہند فوج کے بارہ آدمیوں کے پہرے میں گھنے جنگل میں چلے جا رہے تھے۔ آٹھ میل پیدل چل کر وہ ایک چھوٹے کیمپ میں پہنچ گئے۔ کیمپ میں

پھوس کے چھپّر تھے۔ آزاد ہند فوج کے افسر نے برطانوی ہندی فوج کے ڈرائیوروں اور سنتری سپاہیوں کی رائفلوں سے گولیاں نکلوادیں اور تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ دیش کے دشمن کا ساتھ چھوڑ کر اپنی قومی فوج میں شامل ہو رہے ہیں۔ ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمیں آپ پر اعتبار ہے۔ کہ آپ لوگ بھاگنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ بھاگنے کی کوشش کریں گے تو مجبوراً آپ کو گولی ماردینی پڑے گی۔"

دھن سنگھ نے اپنے زخمی بازو کو درد سے بچانے کے لیے، گلے سے پٹی لٹکا کر سہارا دے لیا تھا۔ ایک ہاتھ سے رائفل کو کندھے پر سنبھالے تھا۔ دوسرے دن دھن سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کو بڑے کیمپ میں جانا پڑا۔ ایک ہندوستانی افسر نے چپٹے چہرے والے، استرے سے سر منڈے جاپانی افسر کے سامنے ایک ایک سپاہی کو الگ الگ بلا کر برطانوی ہند فوج کے حالات کے بارے میں سوالات پوچھے۔ ڈرائیور جتنا جانتے تھے، اتنا بتا دینے میں اُنھیں کوئی اعتراض نہیں ہوا اور نہ اُنھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ غدّاری کر رہے تھے۔ اپنے دشمن کی نوکری سے چھوٹ کر اپنی قوم کی فوج میں شریک ہونے سے اُنھیں اطمینان تھا۔ وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہو کر انگریز سے لڑنے کو تیار تھے۔

آزاد ہند فوج کے ڈاکٹر نے دھن سنگھ کے بازو پر دوا لگا کر پٹّی باندھ دی۔ وہ تیسرے دن کیمپ کی طرف چلا۔ کئی جاپانی اور ہندوستانی زخمیوں کو خچروں پر یا برمی قلیوں کے کندھوں پر یا اسٹریچروں پر لے جایا جارہا تھا۔ چل سکنے والے پیدل چل رہے تھے۔ زخمی سپاہیوں کے لیے انگریزی کیمپ میں جتنا سامان اور آرام تھا۔ ویسا یہاں نہ تھا۔ لیکن دھن سنگھ کو شکایت نہ تھی۔ وہ انگریزوں کی نوکری تھی۔ یہ وطن کا کام تھا۔ گھنے پیڑوں اور چٹانوں کی آڑ میں چھوٹا سا اسپتال تھا۔ زخمی پھوس کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ جاپانی اور ہندوستانی سپاہی الگ الگ تھے۔ دھن سنگھ اپنے بازو کو سنبھال کر تھوڑا بہت گھوم پھر سکتا تھا۔ اس نے فوراً بھانپ لیا۔ سامان کی کمی تھی۔ جاپانی سپاہیوں کی خاطر زیادہ تھی اور ہندوستانی سپاہیوں کی حالت خراب تھی۔

ہندوستانی ڈاکٹر پریشان تھا۔ سپاہیوں کے بدن سے گولیاں نکالنے کے لیے، درد روکنے والے انجکشن کی دوا بہت کم تھی۔ یہ دوا صرف جاپانی سپاہیوں کو ہی دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے دھن سنگھ کو تسلّی دی۔ "بہادر آدمی ہو۔ حوصلہ رکھو۔" کمپاؤنڈر اور اردلی نے دھن سنگھ کی بانہہ تھام لی۔ اُس نے دانت بھینچ لیے۔ گولی نکال دی گئی۔ دھن سنگھ کی بانہہ ٹھیک ہونے میں پورا ایک مہینہ لگ گیا۔

ہسپتال میں ایک کمپاؤنڈر کانگڑہ ضلع کا تھا۔ سنگاپور میں جس وقت انگریزی فوج نے ہتھیار ڈال دیے تھے، وہ کمپاؤنڈر سنگاپور چھاؤنی میں تھا۔ اُس نے دھن سنگھ کو بتایا کہ جاپانیوں نے سنگاپور کو گھیر لیا تھا اور پورا کیمپ اُڑا دینے کی دھمکی دی تو انگریز کمانڈر نے حکم دے دیا...... "ہم تمھیں جاپانی کمانڈر کے ہاتھ میں سونپ رہے ہیں۔ اب تمھیں اپنی فوج کے کمانڈر کا حکم ماننا ہوگا۔ جیسے کوئی اپنی بکریوں کا گلہ بیچ دیتا ہو" اس کے بعد نیتا جی آ گئے۔

کمپاؤنڈر رنیت رام نیتا جی کی باتیں کرتا تھا تو اس کی آنکھیں جوش اور اُمید سے چمک اُٹھتی تھیں۔ "ہم لوگ اپنے وطن سے انگریزوں کو بھگا کر سوراج قائم کریں گے۔" وہ اپنی پہاڑی بولی میں جاپانیوں کو بھی گالی دے دیتا...... "یہ لوگ آدمی تھوڑے ہی ہیں۔ بڑے دغا باز، بڑے راکشش ہیں۔ انگریز پھر آدمی ہے۔ راج کرنا جانتا ہے۔ نوکر کو بھرپیٹ کھانا دے کر، پھُسلا کر خوش رکھ کر کام لیتا ہے۔ جاپانی تو بدن میں سنگین گھسیڑ کر کام لیتا ہے۔ نیتا جی کا حکم ہے، جاپان کی مدد چاہے ملے یا نہ ملے۔ ہمیں اپنی جان دے کر اپنا ملک لینا ہے۔"

دھن سنگھ سوچتا، 'ہندوستان میں برما کی طرح بغاوت ہو جائے تو مہینے بھر میں ہم لوگ کانگڑے کے قلعے تک پہنچ جائیں۔ مورچے پر جا کر لڑیں۔ میں پنجاب کی طرف سب سے آگے بڑھنے والی فوج کے ساتھ چلا جاؤں گا۔'

دھن سنگھ کا بازو ٹھیک ہوتے ہی اسے ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا۔ آزاد ہند فوج میں موٹروں کے قافلے نہ چلتے تھے۔ فوج کا راشن یا سامان پہنچانے اور زخمی سپاہیوں کو پیچھے لے جانے کا کام عام طور سے خچروں یا قلیوں کے کندھوں پر ہوتا تھا۔ دھن سنگھ کو دو خچروں پر ایک توپچی رسالے کے لیے راشن لانے لے جانے کا کام دیا گیا تھا۔

راشن کی بہت کمی تھی۔ انگریزوں کی چھاؤنیوں کی طرح چینی اور بسکٹوں کی بوریاں اِدھر اُدھر نہیں پڑی رہتی تھیں۔ دھن سنگھ کو یاد آتا تھا۔ دمیاپور اور کوہیما کے کیمپوں میں سپاہی راشن کو بوٹوں تلے روند کر چلے جاتے تھے۔ اور سڑک کے کنارے لڑکیاں اور عورتیں اپنے پیٹ اور بدن کو دکھا کر مٹھی بھر چینی، نمک اور کمبل کے لیے اپنا جسم دینے کے لیے تیار رہتی تھیں۔ آزاد ہند فوج میں وہ آدھا پیٹ کھا کر بھی لڑنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اب وہ عوام پر ظلم کرنے والوں کا نوکر نہیں تھا جنتا کا سپاہی بن گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کیا تنخواہ ملے گی، کب ملے گی۔ ملے گی بھی یا نہیں؟ — سوچتا، 'ایک بار آزاد ہند فوج کا سامنا دمیاپور کی ہندوستانی فوج سے ہو جائے۔

سارے لوگ انگریزوں سے جلے بیٹھے ہیں، اس لیے انگریزوں کا خاتمہ دنوں کی بات ہے۔

سات نمبر کیمپ میں راشن ختم ہوگیا تھا۔ شام تک راشن نہ آنے کی وجہ سے کیمپ کمانڈر نے دھن سنگھ اور کالے خاں اردلی سپاہی کو بیس نمبر کیمپ سے راشن لانے کا حکم دیا تھا۔ دھن سنگھ آٹھ میل پیچھے گیا۔ اُس نے گودام کے جاپانی افسر کو خط دیا۔ جاپانی افسر نے خط دیکھا اور اپنے ساتھ کے دو جاپانی افسران سے چڑچڑا کر بات کرتا رہا۔ ان لوگوں کے پہلے سے آیا اردلی بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے دھن سنگھ اور کالے خان کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ "پانچ گھنٹے سے کھڑا ہوں۔ بہن ...... جاپانیوں کو راشن دے رہا ہے۔ سالے نے میری چِٹھی پھاڑ کر پھینک دی۔"

جاپانی افسروں کا دھیان اپنی طرف کرنے کے لیے پہلے آئے ہوئے اردلی نے سلام کیا۔ افسر کے ماتھے پر سلوٹیں گہری ہوگئیں۔ اُس نے دھن سنگھ اور کالے خاں کو اشارہ کر کے اپنے پیچھے بلا لیا۔ افسر ایک گڑھے میں اُتر گیا۔ گڑھے میں بیس پچیس بوریاں اوپر نیچے رکھی ہوئی تھیں۔

یہ بوریاں ہندوستانی فوج سے چھینی ہوئی تھیں۔ ان پر ہندوستانی فوج کے نشان تھے۔ افسر کے اشارے سے دھن سنگھ اور کالے خاں ایک ایک بوری اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھ رہے تھے۔ افسر بوری میں ہاتھ ڈال کر دیکھتا جا رہا تھا کہ اس میں کیا تھا؟ چاول اور آٹے کی بوریاں اُس نے ایک طرف رکھوا دیں۔ ایک بوری میں کالی مرچ تھی۔

افسر نے کالی مرچ ہتھیلی پر لے کر اشارے سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

کالے خاں نے جواب دیا۔ "کالی مرچ۔"

افسر نے اشارہ کیا۔ "کیا کام آتی ہے؟"

کالے خاں نے منہ کی طرف ہاتھ کر کے بتایا۔ "کھائی جاتی ہے۔"

افسر نے بوٹ کی ٹھوکر سے اشارہ کیا۔ 'لے جاؤ'۔

کالے خاں اور دھن سنگھ نے سمجھانا چاہا کہ ایسی چیزیں کھا کر پیٹ نہیں بھرا جاتا۔ جاپانی افسر نے ناراض ہو کر گھڑکی دی۔ کالی مرچ کی بوری نہ چھوڑتے بنتا تھا اور نہ لے جانے سے کوئی فائدہ تھا۔ وہ لوگ کالی مرچ کی بوری خچر پر لادے اُداس لوٹ رہے تھے۔

کالے خاں نے دھن سنگھ کو ٹہوکا مارا۔ "ابے گھبراتا کیوں ہے؟ ہم لوگ تو جانور سپاہی ہیں۔ پہلے ہمیں انگریز جوتتا تھا۔ اس کے پاس اچھا چارہ تھا۔ وہ خوب لڑانے کے لیے ہری ہری گھاس اور دانہ دیتا تھا۔ اب جاپانی کے بس میں ہیں۔ کبھی نیتاجی کی دیا سے روس جیسی حکومت ہوگئی تو ہم لوگوں کے

بھی دن پھر یں گے۔ نیتا جی کا حکم ہے کہ ملک کی آزادی کے لیے سب کچھ سہہ لو۔ نیتا جی آتے ہیں تو یہ لوگ ہم سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ نہیں تو جو حال برمیوں کا ہے سو اپنا ہے۔ یہ لوگ تو ہمیں کچا کھا جائیں۔"

دو گھنٹے پہلے دو انگریزی ہوائی جہاز بم گرا گئے تھے۔ پگڈنڈیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ راہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ چتر سنگھ، دھن سنگھ اور کالے خاں اندازے پر دکھن پچھم چلے جا رہے تھے۔ کالے خاں بار بار کہہ رہا تھا۔ "راہ بھول گئے ہیں۔ اندھیرے میں اور بھٹک جائیں گے۔ دن نکلنے تک کہیں رُک جائیں۔ کالی مرچ کا بورا جلدی پہنچا دیں گے تو کیا ہو گا؟" چتر سنگھ اور دھن سنگھ نے بندوق چلنے کی آواز کی طرف چلنے کا فیصلہ کیا۔ اور دکھن پچھم کی طرف چلتے گئے۔ پورب کی طرف پو پھٹنے کا سا ہونے لگا۔ یہ لوگ اب بھی راہ کا فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ تھکا ہوا خچر بار بار لڑکھڑا جاتا تھا۔ تینوں ایک گھنے درخت کے نیچے چٹان کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ بیٹھے تو کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئے اور سو گئے۔

دھن سنگھ نے سانس رُکنے کی تکلیف سے چھٹپٹا کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ہل نہ سکا۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ مگر آنکھوں پر بھی کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ کر آنکھوں پر سے کپڑا ہٹایا گیا۔ اُس نے دیکھا، اُس کے دوسرے دونوں ساتھیوں کی حالت بھی ویسی ہی تھی۔

انھیں پستول دکھا کر تنبیہ کر دی گئی۔ "اگر چلاؤ گے تو گولی مار دی جائے گی۔" ان کے منہ سے کپڑا ہٹا کر پوچھا گیا۔ "تمہاری باقی فوج کہاں چھپی ہوئی ہے؟"

دھن سنگھ اور اُس کے ساتھی انگریزی فوج کے اسکاؤٹوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ انھوں نے کوئی خبر دینے سے انکار کر دیا۔ انھیں کیمپ میں لے جا کر الگ الگ کر دیا گیا۔ اور چھ گھنٹے کا وقت سوچ کر فیصلہ کرنے کے لیے دیا گیا کہ دشمن کا سارا راز بتا دیں۔ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔ چھ گھنٹے کے بعد دھن سنگھ کو پھر ایک انگریزی اور ایک ہندوستانی افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ڈر سے کانپ رہا تھا لیکن اُس کا جواب تھا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔"

دھن سنگھ کو گولی نہ مار کر دوسرے قیدی سپاہیوں کے ساتھ قید کر دیا گیا۔ چتر سنگھ تین دن بعد آیا۔ اُس کے بدن پر چوٹوں کے نشان تھے۔ چتر سنگھ کو خوب پیٹا گیا تھا۔ اُس نے بتایا وہ اپنی چالاکی کی وجہ سے پٹیا گیا تھا۔ ڈر کے مارے وہ جھوٹ بولا تھا کہ آزاد ہند کی فوج نے زبردستی سپاہی بنا لیا تھا۔ انگریزی فوج میں مل جانے کے لیے بھاگ کر آ رہا تھا۔ افسر نے اُس کی وفاداری کی تعریف کی۔ اُسے ساتھ چل کر آزاد ہند فوج کے مورچے اور کیمپ کی راہ بتانے کے لیے کہا۔ وہ اسکاوٹ پارٹی کو جو بیس

گھنٹوں تک بہکاتا رہا۔ اُسے بار بار گولی مارنے کی دھمکی دی گئی۔ وہ لڑکھڑا کر کہہ دیتا۔ حضور راستہ نہیں مل رہا ہے۔ اسے پیٹا گیا۔ اور پھر افسر کے سامنے لاکر پیش کیا گیا۔ افسر نے کہہ دیا: "ہٹاؤ ڈرپوک آدمی ہے۔ شاید بھول ہی گیا ہو۔ دماغ میں گوبر ہوتا ہے اِن سپاہیوں کے۔"

دھن سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو لگ بھگ پندرہ دن تک سو سپاہیوں کے ساتھ تاروں سے گھرے پھُوس کے جھونپڑوں کے کیمپ میں رکھا گیا۔ بعد میں فوجی قیدیوں کو گورکھا سپاہیوں کی گارڈ کی حفاظت میں دیماپور کی راہ سے "سلی گوڑی کیمپ" میں بھیج دیا گیا۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی ہندوستانی تھے۔ اور ہندوستانی سپاہی ہی ان پر سنگین لے کر پہرہ دے رہے تھے۔ پہرے دار سپاہیوں اور قیدی سپاہیوں کو آپس میں بات کرنے کی ممانعت تھی۔ پہرے دار سپاہی اپنی حکومت سے وفاداری اور مالک سے وفاداری کے غرور میں آزاد ہند فوج کے قیدی سپاہیوں کو نمک حرام سمجھ کر ان سے نفرت کرتے تھے اور آزاد ہند فوج کے سپاہی پہرے دار سپاہیوں کو انگریزوں کے ٹکڑوں پر پلنے والے "کُتّے" اور روپے کے لیے دیس کو بیچنے والے غدّار سمجھتے تھے۔ آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کو امید تھی کہ جلد ہی اُن کو فتح ہوگی اور وہ اپنے آزاد دیش کے بھائیوں سے گلے ملیں گے۔

رفتہ رفتہ پہرے دار اور قیدی سپاہیوں میں ذات اور زبان کا اثر ظاہر ہونے لگا تھا۔ قاعدے کی سختی کے باوجود باہر سے کیمپ میں خبریں آنے لگی تھیں۔ چھپاکر اخبار بھی آنے لگے تھے۔ انگریزوں کی جیت سے سپاہیوں کے دل بجھنے لگے تھے۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی اپنے تاریک مستقبل کے لیے تیار ہونے لگے تھے۔ اُنھیں ایک ہی اطمینان تھا کہ وہ ملک کے لیے لڑے تھے۔ اب اس کا پھل جو ہو۔

لڑائی میں برطانیہ کی جیت ہوئی۔ جیل کیمپوں میں بند آزاد ہند فوج کے سپاہی مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن اُنھیں خبر ملنے لگی تھی کہ دیس کی جنتا آزادی کی تحریک چلا رہی تھی۔ کیمپوں میں چھٹنی اور جانچ پڑتال ہونے لگی۔ دھن سنگھ کے چھُوٹنے کی باری نہیں آرہی تھی۔

دہلی میں آزاد ہند فوج کے رہ نماؤں کا مقدمہ چل رہا تھا۔ سارا ملک اور آزاد ہند فوج کے قیدی بے چینی سے مقدمے کے انجام کا انتظار کر رہے تھے۔ عوام کی زبردست مانگ کے سامنے انگریزوں کو جھک جانا پڑا۔ آزاد ہند فوج کے رہ نماؤں کے چھوٹنے کے تین مہینے بعد دھن سنگھ بھی بانکی پور فوجی جیل کیمپ سے رہا کر دیا گیا۔

اپنی اپنی راہیں

پروڈیوسر ستلی والا" غریب کی آہ".. فلم میں ہیروئن کے لیے پہاڑن سے اصرار کر رہا تھا۔ اُس وقت پہاڑن تین فلموں میں کام کر رہی تھی۔ اُس نے کہا۔" میرے پاس وقت کہاں ہے؟" ستلی والا نے اُس کی آسانی کے لیے ہر انتظام کرنے کا یقین دلایا۔ تو پہاڑن نے پچھتر ہزار مانگا۔

ستلی والا مُسکرا دیا۔" غریب کی آہ کے اتنے دام ہو گئے تو اب غریبی باقی نہیں رہے گی۔"

پہاڑن اس مذاق پر مسکرا کر چپ ہو گئی۔

ستلی والا نے سنجیدگی سے کہا۔" اصل بات یہ ہے کہ غریب کی آہ سنی ہی نہیں جاتی۔ نہیں تو اُس کی آہ میں اتنی طاقت ہے کہ سارا موجودہ نظام بھسم ہو جائے۔" اُس نے سماج سے نفرت ظاہر کرنے کے لیے منھ سے سگار کے دھوئیں کا بہت بڑا بادل چھوڑ دیا اور ہاتھ میں تھمے گلاس پر نگاہیں گاڑ کر اسے ہلا دیا۔ وسکی ملے سوڈے میں سے سینکڑوں بلبلے پھوٹ پڑے جیسے بہت بڑا سوتا اُبل رہا ہو۔

ستلی والا پہاڑن سے آنکھیں ملائے بغیر کہتا "جانتی ہیں آپ اِس جنگ میں ایک کروڑ روپیہ روز خرچ ہو رہا ہے۔ اِس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم کو لوٹنے کا حق چاہتی ہے۔ لیکن اگر دُنیا میں غربت کی آہ ہوشیاری کے ساتھ منظم ہو جائے تو ساری دنیا کے سماج سے لوٹ کھسوٹ کا مسئلہ ایک دن میں صرف ایک ہی دن میں حل ہو جائے۔"

پہاڑن ستلی والا کی عقل مندی کے اثر سے چپ ہو گئی۔ اُس نے تائید میں پلکیں جھپکائیں۔

ستلی والا اپنی بات اثر کرتی ہوئی دیکھ کر گلاس کی طرف سے نظر ہٹا کر بولا۔" غریب کون ہے؟ غریب خود نہیں جانتا کہ وہ لُٹ رہا ہے۔" اور اُس نے پہاڑن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔" آپ اِس فلم میں پچھتر ہزار چاہتی ہیں۔ آپ کہیں گی تو میں دے دوں گا۔ آپ سمجھیں گی کہ بہت لے لیا۔ لیکن میں دوں گا کہاں سے؟ روپیہ پونجی لگانے والوں کا ہے۔ کچھ آپ کو دوں گا۔ کچھ دوسرے ایکٹروں کو دوں گا۔ میں دن رات سر توڑ محنت کر کے فلم بناؤں گا۔ اسے بیچنے کی زحمت اُٹھاؤں گا۔ کچھ میں لوں گا۔ اس میں سرمایہ داروں کی بینکوں میں پڑی ہوئی لگ بھگ چار لاکھ کی پونجی لگے گی۔ آپ جانتی ہیں۔ اس فلم

سے کتنا روپیہ کمایا جانا چاہیے ؟"

ستلی والا نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے بتایا "بارہ چودہ لاکھ! یہ جائے گا سرمایہ داروں کے پاس۔ میں اور آپ اپنی کلا سے، اپنی محنت سے کما کر سرمایہ داروں کو دیتے ہیں۔ اس کے پاس ہماری محنت کی شکل میں اور دولت جمع ہو جاتی ہے۔ ہم پر ان کا قبضہ زیادہ اور زیادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔"

ستلی والا راز دارانہ انداز میں بولا "میں سوشلسٹ ہوں۔ اس لیے یہ سب راز آپ کو بتا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، ہم انٹلکچول (دانش ور) لوگوں کا استحصال نہ ہو۔ آپ کمپنی سے پچاس ہزار نہیں ایک لاکھ مانگیے۔ دلانا میرا کام ہے۔" اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ آواز دھیمی کر کے کو بولا "آپ کو خرچ چلانے کی تونگی ہے نہیں۔ دوسری کمپنیوں میں آپ کا کام چل رہا ہے۔ آپ کو ضرورت ہوگی تو اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ آپ کمپنی سے کہیے اس فلم میں پارٹ کرنے کے لیے کمپنی میں آپ کے ایک لاکھ کے شیر (حصّے) ہوں گے۔ منافع میں آپ کو ملیں گے تین لاکھ۔"

پہاڑن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ستلی والا نے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے۔ کمپنی کے انتظام میں آپ کا ہاتھ ہونا چاہیے۔ آپ پچھتر ہزار کی نوکر بن کر اپنی بے عزتی کیوں کرائیں۔ آپ محنت کرتی ہیں۔ آپ کو مالک ہونا چاہیے۔ جو محنت کرتا ہے۔ اسی کو مالک ہونا چاہیے۔" ستلی والا کی اُنگلیوں میں دبا ہوا سگار بجھ گیا۔ اُس نے ہاتھ میز پر ٹپکا تو کنارے پڑی وسکی کے گلاس میں سے ننھے ننھے بلبلوں کا بھنور اُٹھنے لگا۔

ستلی والا نے سمجھایا "اسی طرح ہم سماج کے اندر قانونی اور پُرامن انقلاب لا سکتے ہیں۔ کمیونسٹ لوگ تو مزدوروں کو بھڑکا کر شور کرتے ہیں۔ مزدور پٹ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ انقلاب مزدوروں کے ہاتھ کی بات نہیں ہے۔ آپ اکنامکس (اقتصادیات) اور پالیٹکس (سیاست) کا عمیق مطالعہ کریں تو دیکھیں گی کہ انقلاب متوسط طبقہ کے دانش ور لوگوں کا ہی کام ہے وہی لوگ اصل میں سماج کو چلا رہے ہیں۔ آج وہ سماج کو سرمایہ داروں کے لیے چلا رہے ہیں۔ وہ ہوشیار ہو جائیں تو سماج کو اپنے فائدے کے لیے چلا سکتے ہیں۔"

ستلی والا پہاڑن کی حیرت سے پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا اور بولا "آپ سوچ لیجیے۔ آپ کو جیسے بھی آسانی ہوگی، دو چار اِدھر یا دو چار اُدھر میں فیصلہ ہو جائے گا۔ بات اپنے ہی ہاتھ میں ہے۔ اصل بات میں نے آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔"

پہاڑن نے ستلی والا کی تجویز کے مطابق "غریب کی آہ" میں کام کرنے کے مسئلے پر کئی دن تک

سوچا۔ جی میں آیا بنواری کو بلاکر رائے لے۔ لیکن وہ بنواری کے سلوک سے چڑ گئی تھی ......
اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتا ہے؟ ...... میرا کام کیا اس کے بغیر نہیں چل سکتا؟"

ستلی والا پہاڑن سے ملتا رہتا تھا۔ ہر ملاقات میں ستلی والا کا اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ ستلی والا خود اس کے مستقبل کے مسئلوں پر باتیں کرتا رہتا۔ پہاڑن نے اُس کی تجویز مان لی۔ اپنی طرف سے اس نے بنواری کو فلم کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنانے کے لیے کہا۔

"غریب کی آہ" فلم کا پروپیگنڈا بڑے زوروں پر کیا جا رہا تھا۔ پروڈیوسر ستلی والا نے سب سے مشہور ایکٹر منور کو بھی پچیس ہزار کے معاہدے پر ہیرو کا کام کرنے کے لیے چن لیا تھا۔ اُس کے بھی پچیس ہزار کے شیئر (حصّے) تھے اور پچیس ہزار نقد لینے کی بات تھی۔ چیدہ اداکار اس فلم میں کام کر رہے تھے۔ اس لیے باقی ایکٹر اور ایکٹرس ستلی والا کو سستے داموں اور اُدھار مل گئے۔ دوسرے درجے کے ایکٹر اور ایکٹرسوں کو لالچ تھا کہ مشہور اداکاروں کے ساتھ کام کرنے سے اُن کا نام چھپے گا۔

فلم کی شوٹنگ تیزی سے ہو رہی تھی۔ بمبئی میں 'مدھوبن' سینما نے لاہور، دلی اور کلکتہ وغیرہ کے کئی سینماؤں نے فلم کی بکنگ کے لیے پانچ لاکھ پیشگی جمع کر دیا تھا۔ پہاڑن مطمئن تھی کہ اُس نے غلطی نہیں کی تھی۔ ستلی والا اُس کے یہاں آتا جاتا تھا۔ کبھی وہ شام کے وقت پہاڑن کو سیر کے لیے اپنی گاڑی میں لے جاتا تھا۔ بات چیت کمپنی اور اُس کے انتظام تک ہی نہیں رہتی تھی۔ ستلی والا کی شرافت اور عقل مندی سے متاثر ہو کر پہاڑن نے اُس سے اپنی بینک میں رقم کے بارے میں بھی رائے لی تھی۔ ستلی والا نے اسے اسٹیل اور دوسری چیزوں کے شیئر خرید وا دیے تھے۔

ایک دن ستلی والا نے دس ہزار روپے پہاڑن کے سامنے رکھ دیے۔ پہاڑن نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیسے؟"

ستلی والا نے جواب دیا۔ "آپ دوسرے آدمی کے ذریعے شیئر خریدتیں تو یہ اُس کا کمیشن ہوتا۔ مجھے کمپنیوں نے کمیشن دیا ہے، مگر آپ کے کام پر میں کمیشن نہیں لوں گا۔ یہ کام میں نے اپنا سمجھ کر کیا ہے۔"

پہاڑن کی آنکھوں میں شکر گزاری کی نمی آگئی۔ اُس نے اصرار کیا۔ 'نہیں، یہ آپ کا ہے، آپ رکھیے۔ مجھ پر آپ کے اور کافی احسان ہیں۔"

ستلی والا نے اُداس ہو کر کہا۔ "میں روپے کا کیا کروں گا؟ میری زندگی مختصر اور غیر اہم ہے۔

میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ دوسرے کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ اپنے گزارہ کے لیے میں کافی کما لیتا ہوں۔ بےکار کیوں جمع کروں؟" اُس نے پُردرد لہجے میں اپنی غم بھری کہانی سنائی۔ شادی کو ڈیڑھ برس ہو گیا تھا۔ لیکن پتنی سے اُس کی ایک دن کے لیے بھی نہیں بنی تھی۔ پتنی کے خیالات، طور طریقے اور مزاج دوسرے قسم کے تھے اور اُس کے دوسرے۔ "ہم لوگ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کو دیکھے ہفتہ گزر جاتا ہے۔ اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر نباہ رہا ہوں۔ اگر میرا مکان دیکھو تو وہاں کسی عورت کا سایہ دکھائی نہ دے گا۔ وہ کبھی دوپہر میں اکیلے آکر بیٹھ جاتی ہے اور کبھی رات بھر نہیں آتی۔ اُس کی اپنی سوسائٹی ہے، اپنے دوست ہیں۔ وہ سمجھتی ہے۔ میں اُس کے لائق نہیں ہوں مجھے اس کی تیز مزاجی اور غرور برداشت نہیں۔"

پہاڑن کو بڑی حیرت ہوئی۔ اتنے شریف آدمی کے ساتھ جس عورت کا نباہ نہیں ہو سکتا وہ کیسی ہو گی؟ اُس نے تکلیف کے ساتھ بےچینی سے کئی سوالات کر ڈالے۔ سلّی والا نے بغیر جھجک کے بتا دیا۔ دو برس پہلے وہ مسوری گیا تھا۔ اس وقت اُس کا ایک پنجابی دوست بھی اپنی بہن کے ساتھ اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہیں مسز سلّی والا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس وقت بہت شریف معلوم ہوئی تھی۔ ہفتہ بھر میں کوئی کسی کو کیا پہچان سکتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بھلے لگے تھے۔ دوست لاہور لوٹ گیا تو اُس کی بہن سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ ایک دن اچانک اس کی بہن کا خط آیا کہ وہ اُس سے بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ پھر تار آیا کہ بیاہ کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ وہ زبان دے چکا تھا۔ بیاہ کے تیسرے دن اُن میں لڑائی ہو گئی تھی۔

پہاڑن نے سلّی والا سے ہمدردی محسوس کی اور گہری سانس لے کر بولی۔ "ایسی عورت کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن میں تمہارے گھر جاؤں تو مجھ سے لڑے گی تو نہیں؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔ شاید خوش ہو گی کہ اُسے مجھے طلاق دے دینے کا بہانہ مل گیا۔" سلّی والا ہنس دیا۔

پہاڑن شرما گئی۔ اُس نے یوں ہی کہہ دیا۔ "تم ہی طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟"
"مفت میں ایک عورت کی زندگی خراب ہو جائے گی۔" سلّی والے کے لہجے میں درد تھا۔
پہاڑن نے اُس کی مخالفت کی۔ "واہ"

پہاڑن اپنی ذہنی پریشانی میں سہارا کے لیے بنواری کی طرف بڑھی تھی۔ بنواری ایمان داری یا بُزدلی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پہاڑن بے عزّتی اُٹھانے کے بعد سہارے کی تلاش میں بھٹک رہی تھی تو سُتلی والا بڑا دل اور دور رس عقل لے کر اُس کے سامنے آگیا تھا۔ وہ سدا بے غرض رہ کر پہاڑن کی بھلائی کی فکر کرتا تھا۔ پہاڑن محسوس کرتی کہ ایسے ہی خواہ انسان کے لیے وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ ستلی والا پہاڑن کے مستقبل کی بات کرتے وقت کہتا۔ "ہم لوگ ایسا کرسکتے ہیں۔ ویسا کرسکتے ہیں۔" پہاڑن کو محسوس ہوا کہ بنواری سے وہ بچ گئی۔

بنواری آتا تو اب پہاڑن اُس سے اتنا کُھل مِل کر بات نہیں کرتی تھی۔ اگر وہ پہلے کی طرح کہتا۔ "پہاڑن ہم پئیں گے، تو پہاڑن کو کمینہ پن اور بدتمیزی معلوم ہوتی۔ وہ چپ رہ جاتی۔ جیسے سُنا نہیں۔ اب وہ خود بھی نیند لانے کے لیے پینے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔ نیند آنے سے پہلے ستلی والا کی بات سوچتی رہتی۔ اس مٹھاس کے بدلے نشے کی بے وقوفی اچھی نہیں لگتی۔ بنواری کم ہی آتا تھا۔ پہاڑن دل میں کُڑھتی کہ خواہ مخواہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنوادیا۔ اسے غرور ہوگیا ہے۔

ایک دن ستلی والا کی بھلائیوں کی بات سوچتے سوچتے پہاڑن کو بنواری پر غصہ آگیا۔ اُس نے میری بے عزّتی کی ہے۔ مجھے ہمیشہ اِس طرح مخاطب کرتا ہے جیسے میری کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اُس دن سے پہاڑن کو بنواری سے نفرت ہونے لگی۔ ستلی والا اس سے ہمیشہ باعزت عورت کا سلوک کرتا تھا۔ بنواری نے اُس سے ساری باتیں کھود کھود کر پوچھ ڈالی تھیں۔ مگر ستلی والا نے کبھی پہاڑن کے بُرے دنوں کے بارے میں ایک سوال بھی نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ اُس سے عزّت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

پہاڑن نے سنیچر کی رات کو سوا دو بجے تک اسٹوڈیو میں کام کیا تھا۔ اتوار کے دن گیارہ بجے اُس کی نیند ٹوٹی۔ جلدی میں نہا کر کپڑے بدلے۔ ستلی والا نے ساڑھے گیارہ بجے آنے کو کہا تھا۔ چھٹی کے دن کہیں چلیں گے۔ دوپہر کا کھانا باہر کھائیں گے۔ ستلی والا بارہ بجے تک نہیں آیا۔ پہاڑن اُس کے یہاں نہ کبھی فون کرتی تھی اور نہ کبھی جاتی تھی۔ اسے جھگڑالو مسز ستلی والا سے بہت ڈر لگتا تھا کہ وہ ستلی والا کو پریشان کرے گی۔

پہاڑن پریشانی میں اِس کمرے سے اُس کمرے میں آجا رہی تھی اور اس کی نظر کھڑکی سے باہر سڑک پر جمی تھی اور کان ستلی والا کی موٹر کے ہارن کے انتظار میں تھے۔ ستلی والا پون بجے آیا۔ پہاڑن کو معلوم ہوا کہ وہ اُداس تھا اور اُداسی کو مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہاڑن

نے اُس کی گاڑی میں بیٹھ کر پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے ؟"

سڑک پر کافی بھیڑ تھی۔ ستلی والا شہر سے باہر نکل جانے کے لیے گاڑی کو ہوشیاری سے تیز چلا رہا تھا۔ پہاڑن بھی سانس روکے شہر سے باہر اکیلے میں نکل جانے کے انتظار میں تھی۔

پہاڑن نے کئی بار اصرار کیا تو ستلی والا نے جواب دیا۔ "وہ میری زندگی دوبھر کیے ہوتے ہے۔"

"کیوں کیا کہتی ہے ؟" پہاڑن نے حسرت سے پوچھا۔

"طلاق چاہتی ہے۔"

"تو مرنے دو چڑیل کو۔" پہاڑن نے غصے میں گہری سانس لے کر کہا۔

"سوچ لو۔" ستلی والا نے جواب دیا۔

"کیوں ؟" پہاڑن نے حسرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"لوگ کہیں گے۔ میں پہاڑن سے بیاہ کرنے کے لیے طلاق دے رہا ہوں۔"

پہاڑن کی آنکھیں جھک گئیں۔ پل بھر سوچ کر اُس نے ستلی والا کی طرف دیکھ کر دکھی آواز میں سوال کیا۔ "تم اس میں اپنی توہین سمجھتے ہو ؟"

"نہیں ! مجھے صرف تمہاری عزت کا خیال ہے۔"

پہاڑن آنچل چہرے پر رکھ کر رو پڑی۔

ستلی والا نے پہلی بار ہمت کی۔ اُس نے پہاڑن کو بانہوں میں لے کر پوچھا۔ "روتی کیوں، کیا میری بات بُری لگی ؟"

"مجھے رونے دو۔" پہاڑن نے جواب دیا۔ "ایک عمر کے بعد آج خوشی سے رو رہی ہوں۔"

پہاڑن کئی منٹ تک روتی رہی۔ ستلی والا اُس کا سر اپنے سینے پر دبائے رہا۔ پہاڑن نے آنسو پونچھے بغیر اپنا منہ ستلی والا کی طرف اُٹھا کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "آج میں زندگی میں..... سچ کہو، تم مجھے کبھی نہیں چھوڑو گے ؟"

ستلی والا نے اپنے ہونٹوں کے دباؤ سے اُس کے ہونٹوں سے نکلتے لفظ روک دیے۔

منورما کو ہر دوسرے ہفتے بیرے کے ہاتھوں لفافے میں سو روپے کے نوٹ مل جاتے تھے۔ یہ روپیہ لینے میں اُسے بُرا لگتا تھا۔ یہ بات اُس نے بھوشن کے سوا اور کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بھوشن نے

اسے سمجھا دیا تھا۔ اس میں شرم و ندامت کی کیا بات ہے۔ تم نے پندرہ ہزار روپیہ نقد دیا ہے۔ اس کے یہاں کھانا ہی تو کھاتی ہو۔"

ستلی والا سے روپے ملتے رہنے کی وجہ سے منورما کو بس یا ٹرام کا ٹکٹ خریدنے میں پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ ضرورت کے وقت ٹیکسی بھی لے سکتی تھی۔ کھانے کے لیے مالا بار ہل واپس آنا ممکن نہ ہوتا۔ وہ بھوشن کے لیے سستے چارمینار کے بدلے اچھے سگریٹ خرید دیتی۔ کبھی وہ دونوں یا دوسرے کامریڈوں کے ساتھ سینما بھی دیکھ لیتے۔ بھوشن کو دیسی فلمیں دیکھنے کا شوق نہ تھا۔ منورما کو تو اس سے چڑ تھی۔ یہاں تک کہ خود ستلی والا کی بنائی فلم 'دن رات' بھی وہ کبھی دیکھنے نہ گئی تھی۔

سوموار کو منورما گھر سے نکل رہی تھی تو بیرے نے اسے رقم کا لفافہ دے دیا۔ منورما نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ دس دس کے نوٹوں کے ساتھ ٹائپ کیا ہوا ایک خط بھی ملا۔ منورما ڈھلوان سڑک پر اترتے ہوئے خط۔ جیسے جیسے خط پڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کی چال دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ سڑک پر ایک کنارے کھڑے ہوکر اُس نے خط دوبارہ پڑھا۔ وہ حیرت زدہ اور پریشان ہوگئی۔ پل بھر سوچ میں کھڑی رہی۔ پیدل چل سکنا کٹھن ہوگیا۔ اُس نے خالی جاتی ٹیکسی کو اشارے سے بُلا لیا۔

منورما پارٹی دفتر کے سامنے ٹیکسی سے اُتری۔ اُس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ دو بج چکے تھے۔ کھانے کی چھٹی کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اُس وقت بھوشن کو بلانا ٹھیک نہیں تھا۔ ٹیکسی کا کرایہ چکا کر وہ پیدل "سویت مِتر سنگھ" کے دفتر کی طرف چلی گئی۔

ہفتہ وار اخبار کے پروف منورما کا انتظار کر رہے تھے۔ ستلی والا کے خط کے ٹکڑے بار بار اُس کی نظر کے سامنے ناچ جاتے تھے۔ سوچ رہی تھی۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ غنیمت تھا کہ کامریڈ منسر نیتا دفتر میں نہ تھی۔ کامریڈ آورے اگلے شمارے کے مضامین تیار کر رہا تھا۔ وہ بار بار پُکار لیتا تھا۔ "کامریڈ! یہ دیکھو گی؟ ونڈر فُل، بڑے کام کی چیز ملی۔"

منورما جھنجلا اُٹھتی۔ "پلیز ڈونٹ ڈسٹرب"۔ وہ اُٹھی اور بھوشن کو فون پر بُلا کر کہہ دیا۔ "ایک بہت ضروری کام ہے۔ چھ بجے سیدھے یہیں آجانا۔"

منورما کے لہجے میں بے چینی محسوس کرکے بھوشن نے پوچھا۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

منورما کو کہنا پڑا۔ "نہیں، بس تم آجانا۔"

بھوشن نے کہا۔ "اگر خاص بات نہیں ہے تو ساڑھے سات بجے رکھو۔ کام ختم کرکے کھانا کھا کر آؤں گا۔"

منورما جھنجلا اُٹھی۔ "کھانے سے پہلے آنا۔"

منورما چھ بجے بھی پروف ختم نہ کر سکی تھی۔ اِس لیے آورے سے مدد مانگی۔

آورے نے مزدوری مانگ لی۔ "ایک پیالہ چائے اور ایک پیکٹ چارمینار دینا ہوگا۔"

منورما نے جھنجلا کر ایک روپیہ پھینک دیا۔ روپیہ لے کر آورے نے سلام کیا اور سارے پروف منورما کے سامنے سے اُٹھا لیے۔

منورما مسکرا دی۔ "تھینک یو کامریڈ!"

منورما پھر پارٹی کے دفتر پہنچ گئی۔ اُسے بھوشن کے کمرے میں جا کر پکارنا پڑا۔ بھوشن نے نیچے سڑک پر آ کر پوچھا۔ "گھبرائی ہوئی ہو۔ کیا بات ہے؟"

"بتاؤں گی۔" منورما نے جواب دیا اور ایک ٹیکسی کو اشارے سے بُلا لیا۔ بھوشن نے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنا سوال دُہرایا۔ منورما بٹوے کو دونوں ہاتھوں سے دبائے چُپ رہی۔ اشارہ کر دیا۔ "ابھی ٹھہرو۔" والکیشور کے نزدیک منورما نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ چڑھائی پر چڑھ کر کنج کے نیچے وہ اسی بنچ پر بیٹھ گئے جہاں دو برس پہلے منورما نے اپنے بیاہ کی غلطی بھوشن کو بتائی تھی۔ منورما نے بلاؤز میں سے خط نکال کر بھوشن کو دے دیا۔ "پڑھو۔"

"روشنی کے نیچے جانا ہوگا۔" بھوشن نے کہا۔

"یہیں بیٹھو، میں بتاتی ہوں...... اچھا جاؤ پڑھ لو۔"

بھوشن خط پڑھ کر واپس آ گیا۔ اُس نے پوچھا۔ "تو پھر؟"

"تم بتاؤ۔" منورما کی آواز میں کپکپی تھی۔

"اب اور صورت ہی کیا ہے؟ اگر تم طلاق کے لیے درخواست نہیں دوگی تو وہ دے دے گا۔ تم کیا طلاق نہیں چاہتیں؟"

"ہائے چاہتی کیوں نہیں؟ لیکن وجہ کیا بتائی جائے گی؟"

"قانون میں تو وجہ تین ہی ہیں۔ کسی دوسرے سے جنسی تعلّقات، مار پیٹ یا نامردی، لیکن عدالت میں ثبوت چاہیے۔ کس بات کا ثبوت دیا جا سکتا ہے؟"

منورما نے فکرمند ہو کر کہا۔ "ایسی بات میں عدالت کے سامنے کیسے کہہ سکتی ہوں۔ پہلی دو باتوں میں سے کوئی بات ہے نہیں۔ کم سے کم مجھے نہیں معلوم ہے۔ ثبوت کیا ہے؟"

"ہوں۔" بھوشن بولا۔ "اس نے لکھا ہے۔ وہ عدالت میں صفائی نہیں دے گا۔ ایک طرفہ

ڈگری ہوجائے گی۔ لیکن ایسی بات وہ صرف آوارگی یا بدسلوکی کا الزام لگانے پر ہی برداشت کرسکتا ہے۔ تم درخواست نہیں دو گی تو وہ درخواست دے دے گا۔ اسے گواہ پیش کرنے میں بھی دقت نہیں ہو گی۔ وہ دس جھوٹے گواہ تمہارے بدکردار ہونے کے سلسلے میں پیش کرسکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے اُس کی اپنی بدنامی ہو گی۔ وہ نامرد کہلانے کے بدلے اپنی مردانگی کا ڈھول پیٹنا زیادہ پسند کرے گا۔ آج کل وہ کر کیا رہا ہے؟"

"شاید فلمیں پروڈیوس کر رہا ہے۔ اخباروں میں اشتہار تو نکل رہا ہے کہ ایکٹرس پہاڑن کے ساتھ مل کر کوئی فلم بنا رہا ہے۔"

"کسی ایکٹرس کو تو نہیں پھنسا رہا ہے؟"

"سب کچھ ممکن ہے۔"

"یہی بات ہے، اسی لیے اپنا راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ سنو وہ طلاق چاہتا ہے تو اُسی کو اس کا انتظام کرنا چاہیے۔ اُس نے لکھا تو ہے "یہ زندگی نہ میرے قابلِ برداشت ہے اور نہ تمہارے لیے۔ نہ ہم لوگ پتی پتنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تم پر پابندی کیوں ہو؟ لیکن اس میں اس کا اپنا مقصد اور کوئی چال ہے۔ تم اُس سے کہو کہ وہ خود ہی تمہاری طرف سے یہ درخواست تیار کردے اور گواہوں کے نام دے دے۔ ہاں، ہوشیار رہو۔ تم اپنے ہاتھ سے لکھ کر کچھ مت دینا۔ دیکھو اُس نے بھی خط پر دستخط نہیں کیے ہیں۔"

"ہوں۔"

"اس کے بعد؟" بھوشن کا لہجہ بدل گیا تھا۔ اُس نے منورما کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

منورما نے ایک گہری سانس لی۔ اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اور اُس کا سر بھوشن کے کندھے سے ٹک گیا۔

"بولتیں کیوں نہیں؟" بھوشن نے بے صبری سے پوچھا۔

"کیوں؟ ابھی کیا کم ستایا ہے؟"

بھوشن اُس کا چہرہ اپنی طرف اُٹھانا چاہتا تھا۔

"اب اتنے بے صبر کیوں ہوتے ہو؟" منورما مسکرا دی۔

بھوشن جھینپ گیا۔

بھوشن کو یقین نہ تھا کہ ستلی والا صرف اپنے اور منورما کی زندگی سے ڈھکوسلے کو دُور کرنے کے لیے

اپنے بیاہ کا تعلق ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اسے شک تھا سیتلی والا کوئی اور بڑا ڈھکوسلا کھڑا کر رہا ہے۔ سینما سنسار سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے بات چیت کرنے سے اُسے معلوم ہوا کہ ستلی والا پہاڑن پر فریفتہ ہے۔ پہاڑن کے ساتھ شرکت میں فلم بنا رہا ہے۔ چوٹی کے دو ایکٹروں کو لے کر اپنی کمپنی بنا رہا ہے۔ بھوشن نے سمجھ لیا ستلی والا منورما کو بیاہ کے بندھن سے آزادی دینے کے لیے کیوں تیار ہے۔

ستلی والا کا خط پانے کے بعد منورما کے لیے اُس کے مکان ویوز کریڈل میں پاؤں رکھنا بھی ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ وہ کھانے کے لیے واپس نہیں آتی تھی لیکن رات گزارنے کے لیے اسے آنا ہی پڑتا تھا۔ رات میں کسی دوسری جگہ کیسے رہ جاتی ؟ کوئی بھلی عورت رات اپنے گھر کے سوا اور کہاں گزار سکتی ہے ؟ وہ گھر چاہے اس کا نہیں رہا تھا۔ لیکن اُس کا گھر اور کہاں تھا ؟ سماج کی نظر میں تو وہی اس کا گھر تھا۔ طلاق کے خیال سے اسے آزادی اور بے عزتی دونوں ہی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھاتی۔ وہ روایتوں اور سنسکاروں کا اثر ہے۔ آزادی کے لیے کچھ سنسکاروں سے بھی چھٹکارا ضروری ہے۔ لیکن بے عزتی محسوس ہوتی تھی کہ وہ دوسری عورت کے مقابلے میں ٹھکرائی جا رہی تھی۔ منورما دل کو سمجھاتی۔ کیوں ؟ میں تو خود چھوڑ رہی ہوں ...... لیکن دوسری بات کو نظر انداز نہیں کر پاتی تھی۔

منورما سوچتی۔ "یہ پہاڑن کون ہے ؟ ستلی والا کی حقیقت نہیں جانتی ہوگی ...... ایکٹرس ہی تو ہے دونوں ایک دوسرے سے مطلب پورا کرنا چاہتے ہوں گے۔ پتی پتنی کے خیال سے اسے نہ کوئی مطلب ہوگا اور نہ اسے۔ ان دونوں کی نبھ جائے گی۔ دونوں مل کر دنیا کو ٹھگیں گے۔"

پہاڑن کی بڑی بڑی تصویریں شہر بھر میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے جذبات کو اُبھارنے والے گانے پر ریکارڈوں پر جا بہ جا سنائی دیتے تھے۔ لیکن منورما نے اسے فلم میں ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی تصویروں کی طرف بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ بھوشن نے مذاق میں کہا تھا "دیکھیں تو سہی یہ ہمارے پنجاب کی کون پہاڑن ہے۔ کیسی ہے ؟"

"مرنے دو، ہم کیوں دیکھیں ؟" کہہ کر منورما جھنجلا اُٹھی تھی "ہوگی کوئی تمہاری پہاڑن بہن، تم پہاڑی ہو، جاؤ دیکھو اسے !" اور مسکرا دیتی۔ "تمھاری پہاڑنیں خوب صورت بھی ہوتی ہیں اور چالاک بھی، وہ سوما ہی کیا کم تھی !"

منورما کو راستے میں پہاڑن کی بڑی سی، بہت خوب صورت تصویر دیوار پر دکھائی دے جاتی تو آنکھ اُس پر پڑ جاتی۔ دل ہی دل میں وہ کہتی۔ "اُس کے لیے تم ہی ٹھیک ہو ! تم اُس کے کان کاٹنا، وہ تمہارے کاٹے گا۔ اُس کے ساتھ ہی خیال آ جاتا، ویوز کریڈل کو چھوڑ کر وہ کہاں جائے گی ؟

منورما اُداس ہو جاتی۔ بے عزتی اور ٹھکرائی جانے کے احساس میں لپٹی ہوئی آزادی کا بوجھ دل پر محسوس کیے بغیر نہ رہتی ...... میں کہاں جاؤں گی؟ سوچتی پارٹی آفس میں چلی جاؤں گی فٹ پاتھ پر سو جاؤں گی۔ ستلی والا سے کہوں گی کہ مجھے اپنے قدموں سے نہ ہٹاؤ۔ اور چاہے جو کرو، میں تمہاری داسی ہوں، شوہر پرست داسی، اس کا مُنہ کڑوا ہو جاتا کہ سڑک پر تھوک دے۔

ستلی والا نے منورما کی طرف سے وکیل سے درخواست تیار کروا دی تھی۔ گواہی میں گھر کے بیرے کا نام دے دیا تھا۔ ستلی والا پر آوارگی اور بدسلوکی کا الزام تھا۔ عدالت میں ایک مہینہ بعد کی تاریخ پڑی تھی ستلی والا صفائی کے لیے نہیں آیا تو عدالت نے پندرہ دن بعد کی تاریخ مقرر کر دی۔

منورما کو عدالت جانا موت معلوم ہوتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ اُس نے یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ شرم کے مارے مری جا رہی تھی۔ عدالت کے سامنے اُسے اپنی درخواست کی بات دہرانی پڑی۔ بیرا سلیمان گواہی میں پیش ہوا۔ اُس نے وکیل کی جرح پر منورما کی باتوں کو الٹ پھیر کر دہرا دیا۔ جج صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بسا ہوا کنبہ ٹوٹ جائے۔ ایک بار پھر ستلی والا کو سمن بھیجا گیا۔ ستلی والا نے اپنا مہر بند بیان بھیج دیا کہ وہ کوئی صفائی نہیں دینا چاہتا تھا۔ طلاق منظور ہو گئی۔

منورما نے عدالت میں ستلی والا سے گزارہ دلانے کی درخواست نہیں کی تھی۔ عدالت نے خود ہی اسے تین سو روپے ماہوار گزارہ دینے کا حکم دے دیا تھا۔ منورما دوبارہ بیاہ نہ کرے تو ستلی والا کو ساری زندگی اسے تین سو روپے ماہوار دیتے رہنا ہوگا۔

کامریڈ نیتا منورما کے ساتھ عدالت گئی تھی۔ نیتا نے اپنی عادت کے مطابق، عدالت کا فیصلہ سُن کر عدالت کے سامنے ہی منورما کو مظالم سے نجات ملنے پر مبارک باد دے دی۔ منورما جھجک سے چپ تھی لیکن نیتا جوش میں بے چین سی ہو رہی تھی۔ وہ شرمائی ہوئی منورما کو بانہہ سے پکڑے سیدھے پارٹی آفس لے گئی اور اُس نے منورما کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ نیتا منورما کو ایسے سنبھالے ہوئے تھی۔ جیسے نئی بہو کو گھر میں بسانے کے لیے لا رہی ہو۔ منورما بھی جھجک سے نئی بہو کی طرح سمٹی ہوئی تھی۔

بہت سے کامریڈ اپنا کام چھوڑ کر سمٹی ہوئی منورما کو گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایش نے گردن اونچی کر کے بہت زور سے پکار کر کہا۔ "تو پھر...... اب؟" اُس نے محبت کرنے کے انداز میں دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

پارو نے ایش کے کندھے پر دھکا دے کر پھٹکارا۔ "ہٹ پاگل۔"

منگل بولا۔ "آخر کوئی تو اُمید رکھ سکتا ہے۔ کسی کے لیے تو موقع ہوگا۔"

کامریڈ اوک نے کہا۔ "نہیں نہیں ۔ یہ تگڑم نہیں چلے گا ۔ باقاعدہ سوئمبر ہوگا ۔ ہم بھی دھنش (کمان) اُٹھائیں گے ۔ ڈھلتی عمر میں ایک بار آزما کر دیکھیں ۔" اپنے مذاق سے خوش ہو کر اُس نے اپنے کھچڑی بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

مسز گوگرے اس ہنگامے سے پریشان ہو گئی تھی ۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے چشمے کے اوپر سے گھور کر پکار اُٹھی ۔ "یہ کیا بے وقوفی ہے کام کے وقت !"

بھوشن اور نیتا منورما کو سکریٹری کے پاس لے گئے ۔ سکریٹری کی جھکی ہوئی آنکھیں کاغذ پر سے اُٹھیں ۔ اُس کے بے حجامت چہرے پر مسکراہٹ آ گئی ۔ نیتا کی بات سنتے سنتے وہ ہتھیلی پر سورتی (تمباکو) کی چٹکی تیار کرنے لگا۔

سکریٹری نے منظوری دے دی ۔ "منورما عوامی ناٹک سنگھ (پیپلز تھئیٹرز ایسوسی ایشن) میں کام کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ اندھیری میں رہ سکے گی اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ روزانہ ٹرین سے اپنے کام پر آئے گی ۔"

نیتا نے اونچی آواز میں نے کہا۔ "کامریڈ، دیکھو اس پاگل کو ۔ عدالت نے اسے تین سو روپیہ ماہوار گزارہ دلایا ہے ۔ یہ کہتی ہے میں نہیں لوں گی ۔ کیوں نہیں لے گی ! ..... تم نے نہیں مانگا لیکن کورٹ دیتا ہے تو کیوں نہیں لے گی ۔ اس بدمعاش سے محبت ابھی باقی ہے !"

سکریٹری نے سورتی کی چٹکی نچلے ہونٹ کے نیچے دبا کر جواب دیا ۔ "اس کے کہنے سے کیا ہو ہے ۔ اسے پارٹی کو چالیس روپے ماہوار تنخواہ دینی ہوگی ۔ اس کی جو آمدنی ہے وہ پارٹی کی ہوگی ۔ اچھا ..... ،، اُس نے آنکھیں اپنے کام کی طرف کر لیں۔

منورما اس ہنگامے سے چھٹی پا کر اپنا ذاتی سامان لینے کے لیے ٹیکسی سے ویوز کریڈل پہنچی ۔ واپس آئی تو یاد آیا ۔ بھوشن نے پارٹی کے کچھ خفیہ کاغذات اسے سنبھال کر رکھنے کے لیے دیئے تھے اور اُس نے ایک بڑی الماری کے پیچھے چھپا کر رکھ دیئے تھے ۔ انھیں بھول آئی تھی ۔ وہ فوراً لوٹ پڑی۔

پہاڑن کے دل میں مسز ستلی والا کو ایک دفعہ دیکھنے کی تمنا ضرور تھی لیکن ڈر بھی تھا کہ جو عورت اتنے شریف آدمی کے ساتھ سدا جھگڑتی رہتی ہے ، اُسے دیکھتے ہی جانے کیا بول بیٹھے یا کیا کر بیٹھے ۔ اس ڈر سے پہاڑن نے ستلی والا کے گھر کو دیکھنے کے شوق کو کبھی دبا لیا تھا ۔ ستلی والا کو اپنی اور منورما کے طلاق کی منظوری کی خبر مل چکی تھی ۔ اُس نے گھر پر فون کر کے بیرے سلیمان سے پوچھ لیا کہ میم صاحب اپنا سامان لے کر جا چکی تھی ۔ اُس نے پہاڑن سے اصرار کیا کہ اس کے ساتھ ویوز کریڈل چلے اور اس کے

ساتھ کھانا بھی کھائے۔ پہاڑن کب سے اس دن کے انتظار میں تھی۔ پہاڑن نے اس دن کی ریہرسل بھی آدھے دن میں چھوڑ دی اور ستلی والا کے ساتھ تیسرے پہر مالا بار ہل چلی گئی۔

ستلی والا نے گاڑی مکان کے برآمدے کے ساتھ کھڑی کی اور پہاڑن کو سہارا دے کر گاڑی سے اُتار کر برآمدے میں لے جا رہا تھا کہ اندر سے منورما کچھ کاغذ اور کتابیں لیے سامنے والے کمرے سے آتی دکھائی دی۔ ستلی والا نے سوچا.... 'یہ کیا پھر آئی ہے؟' اُس نے منورما کو دیکھ کر بھی جیسے نہیں دیکھا۔

پہاڑن اب بھی اس جھگڑالو عورت کو وہیں کھڑی دیکھ کر سِٹپٹا گئی۔ اپنا ہاتھ ستلی والا کے ہاتھ سے چھڑا کر پہاڑن نے اُس عورت کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ منورما بھی اپنی جگہ جھجک گئی لیکن اُس نے پہاڑن کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی۔ اور پکار اُٹھی۔ "سوما!"

پہاڑن جیسے اچانک بجلی کے چھُو جانے سے چونک پڑی۔ اُس نے منورما کی طرف دیکھا۔ منورما ستلی والا کو نظر انداز کر کے اس کے نزدیک آ گئی تھی۔

پہاڑن نے منورما کو پہچانا اور کانپ اُٹھی۔ منورما ایک قدم اور آگے بڑھی۔ اور اُس نے پہاڑن کے گلے میں باہیں ڈال کر پکار لیا۔" سوما بہن۔"

پہاڑن کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ منورما نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ فرش پر بیٹھ گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ منورما گھبرا گئی۔ اپنے ہاتھ کے کاغذ اور کتابیں اس نے ایک طرف رکھ دیں اور پہاڑن کو اُٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ ستلی والا آگے بڑھ آیا۔ اُس نے پہاڑن کو کندھے سے سنبھالا اور منورما نے گھٹنوں سے۔ دونوں نے اُسے اُٹھا کر اندر پلنگ پر لٹا دیا۔

منورما نے بیرے کو پکار کر پانی مانگا۔ پہاڑن کے منھ پر چھینٹے دیے اور اخبار سے ہوا دینے لگی۔ دو منٹ اور بیت گئے مگر پہاڑن کو ہوش نہ آیا۔ منورما پریشانی سے پلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔ ستلی والا کی آواز سنائی دی۔ "تم جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو بلا لوں گا۔"

منورما ستلی والا کو دیکھے بغیر پلنگ سے ہٹ گئی۔ اُس نے اپنے کاغذ اور کتابیں اُٹھا لیں اور مکان سے چلی گئی۔ سر جھکائے سوچتی چلی جا رہی تھی: سوما ہی پہاڑن ہے..... اتنی تبدیلی ممکن ہے؟ آدمی کیا ہے، اور اس کے کتنے رُوپ ہو سکتے ہیں۔ ایک دن دھرم شالہ میں بھوشن اس کے یہاں سوما کو کتّوں کے ڈر سے کانپتی ہوئی بکری کی سی حالت میں لایا تھا۔ وہ دھن سنگھ کے لیے جان دے دینا چاہتی تھی۔ پولس کے ڈر سے اُس کے حمل کا اسقاط! اُس کا بازار جانے سے ڈرنا! بھیّا کی اُس پر زیادتی! بڑی بھابی کا ظلم۔ آج وہ دُنیا کو انگوٹھا دکھا رہی ہے۔ اپنا بدلہ لے رہی ہے..... کیا وہ ستلی والا کے

ساتھ خوش رہ سکے گی؟ کیا اتنی چالاک ہو گئی ہے؟"

منورما کے قدم عادت کے مطابق تبتی کی طرف اُٹھتے جا رہے تھے۔ لیکن تبتی پہنچ کر وہ دوسری راہ سے کینیڈی بیچ کی طرف لوٹ گئی اور سمندر کے کنارے بنی ہوئی دیوار پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ 'سوما ہی پہاڑن ہے۔ آدمی کو کوئی سمجھ سکتا ہے، پہچان سکتا ہے؟......' سورج ڈوب گیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ لیکن منورما بیٹھی رہی۔

منورما نے ہونٹوں سے سیٹی بجانے کی آواز سنی۔ گھوم کر دیکھا۔ کوئی آدمی اسے دیکھ کر سیٹی بجا رہا تھا۔ اُس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ وہ اُٹھی اور تیز چال سے سینڈھرسٹ روڈ کی طرف چل دی۔

پہاڑن کے بے ہوش ہونے کے آدھ گھنٹے کے بعد ڈاکٹر پہنچا۔ ڈاکٹر کے لگ بھگ ۱۵ منٹ تک دیکھ بھال کرنے اور دوا دینے کے بعد پہاڑن نے آنکھیں کھولیں۔ اُس کا رنگ سوکھے پتے کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور اُسے نہ پہچان کر سوالیہ نگاہوں سے سلی والا کی طرف دیکھنا۔

سلی والا نے مسکرا کر یقین دلایا۔ "گھبرائیے نہیں۔ یہ ہمارے دوست ڈاکٹر صاحب ہیں۔ اب آپ بالکل اچھی ہیں۔"

ڈاکٹر پہاڑن کو گرم دودھ یا چائے دینے اور بالکل چپ چاپ لیٹے رہنے کی ہدایت دے کر چلا گیا۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی پہاڑن نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ تو اسی وقت چلی گئی تھی۔" سلی والا نے پہاڑن کے بالوں پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ "ابھی چپ رہو۔"

"کہاں گئی ہے وہ؟"

ڈاکٹر پہاڑن کے لیے نیند کی دوا دے گیا تھا۔ سلی والا نے کہا۔ "ابھی گرم دودھ کے ساتھ یہ دوا کھا لو، گھبراؤ مت۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" پہاڑن زیادہ نہ بولے، اس لیے سلی والا پلنگ کے نزدیک سے ہٹ گیا۔ اُسے دوبارہ پہاڑن کی آواز سنائی دی۔ "سنیے! سنیے۔"

سلی والا پہاڑن کو بولنے سے بچانے کے لیے کمرے کے اندر نہیں آیا۔ لیکن خود اُلجھن اور بے چینی

کے ساتھ جیبوں میں ہاتھ ڈالے بالکونی میں ٹہلتا رہا اور حالت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دونوں کیا ایک دوسرے کو جانتی ہیں ؟ شاید بچپن کی سہیلیاں ہیں ۔ یا رشتہ دار ہیں ۔ پہاڑن چھپ کر گھر سے بھاگی ہوگی ! جو بھی ہو ! دونوں ملیں گی تو کیا منورما اس سے میری بات کہے گی ؟ پہاڑن اس پر یقین کرے گی یا میرا ؟ اس کے لیے میں نے اتنا کچھ کیا ہے ۔ اس فلم میں اُس کی کافی رقم لگی ہوئی ہے ۔ مہینے بھر کا اور معاملہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں سب سنبھال لوں گا ۔ اب میری حالت بھی ٹھیک ہے ۔ اُس میں اور اس میں فرق بھی تو ہے ۔ وہ بالکل جوان تھی ۔ اُس کے لیے ویسے ہی آدمی کی ضرورت تھی ۔"

ستلی والا نے اپنی الجھن میں دبے پاؤں اندر جاکر دیکھا ۔ پہاڑن دوا کے اثر سے سو گئی تھی ۔ اُس کی کلائی چھونے سے بخار معلوم ہوا ۔ پہاڑن کی نیند دو گھنٹے بعد ٹوٹی ۔ اُس نے ستلی والا سے پوچھا ۔ "کیا بجا ہے ؟"

ستلی والا نے جواب دیا ۔ "نو بج رہے ہیں ۔ گھبراؤ نہیں ۔ میں نے اسٹوڈیو کو فون کر دیا ہے ۔ تمہیں بخار ہے ۔ اسٹوڈیو نہیں جاسکو گی ۔"

"میں اپنے مکان پر جاؤں گی ۔" پہاڑن نے کہا ۔

"یہ بھی تمہارا ہی مکان ہے ۔ تمہارا بدن کچھ گرم ہے ۔ ایسی حالت میں ہوا لگنے کا ڈر ہے ۔ تمہارے لیے نرس بلادوں ؟"

"نہیں میں ٹھیک ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری طلاق اسی سے ہوئی ہے ؟" ستلی والا کی آنکھوں میں دیکھ کر پہاڑن نے پوچھ لیا ۔

"ہاں ۔ تم اسے کیسے جانتی ہو ؟"

پہاڑن نے ستلی والے کے سوال کا جواب نہ دے کر پوچھا ۔ "بیاہ کب ہوا تھا ؟"

"تمہیں بتایا تو تھا ۔ دو برس پہلے ۔"

"دو برس پہلے" پہاڑن نے سوچ کر پوچھا ۔ "یہ تم سے جھگڑتی رہتی تھی ؟"

"تم فکر نہ کرو ۔" ستلی والا نے پہاڑن کے سر پر ہاتھ پھیرا ۔

"اب وہ یہاں آئے گی ؟"

"کبھی نہیں ۔ کیوں تم اُس سے ملنا چاہتی ہو ؟"

پہاڑن نے سر ہلا کر انکار کر دیا ۔

پہاڑن چاہتی تھی کہ وہ اندھیری میں اپنے مکان پر چلی جائے ۔ لیکن بخار زیادہ ہونے کی وجہ سے

ڈاکٹر نے اُسے بستر سے ہلنے کی اجازت نہیں دی۔ ستلی والا بھی اُسے جانے نہ دیا اور سمجھاتا رہا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ستلی والا نے پہاڑن کو بخار کی زیادتی میں نیند میں آہستہ آہستہ بڑبڑاتے سنا۔ "نہیں میں سوما نہیں ہوں...... مجھے رہنے دو...... مجھے رہنے دو۔ برکت میرا کوئی نہیں۔"

ستلی والا بھانپ گیا کہ پہاڑن اپنی پچھلی باتوں کو ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے بھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ دل میں سوچا۔ اگر ضرورت ہوگی تو پہاڑن کے نوکر برکت سے معلوم ہو جائے گا۔

پہاڑن رات بھر اسٹوڈیو سے واپس نہ آئی تو اُس کی آیا اور مہاراجن پریشان ہوگئیں۔ اُنھوں نے برکت کے سامنے اپنی پریشانی ظاہر کی۔ برکت بھی فکر مند ہوگیا۔ رات میں دیر چاہے جتنی ہو جائے۔ تین بج جائیں یا چار۔ پہاڑن گھر ضرور لوٹ آتی تھی۔ برکت پہاڑن کا پتہ لگانے کے لیے آکریٹ اسٹوڈیو گیا۔ وہاں معلوم ہوا رات پہاڑن آئی ہی نہیں تھی۔ فون آیا تھا کہ بیمار ہے۔ اسٹوڈیو نہیں آئے گی۔ وہ کنچن اسٹوڈیو میں گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ پچھلے دن پہاڑن آدھا کام چھوڑ کر ستلی والا کے ساتھ چلی گئی تھی۔ برکت کا ماتھا ٹھنکا۔ لوگ کہہ رہے تھے ...... دونوں کی بہت گٹھ رہی ہے۔ شادی کریں گے .... برکت نے سوچا۔ اگر ستلی والا پہاڑن کو لے کر اُڑ گیا تو اس کا کیا ہوگا ؟" ہم نے اس ماور ...... کے لیے جان لڑا دی ہے۔ خطرہ مول لیا ہے۔"

برکت ستلی والا کے دفتر کا پتہ لگا کر فورٹ پہنچا۔ دفتر کے دروازے پر آزاد ہند فوج کے گڑھوالی سپاہی چوکیدار نے برکت کی پوشاک دیکھ کر اسے اندر نہ جانے دیا۔ اور کہہ دیا۔ "صاحب ابھی مکان سے نہیں آیا ہے۔"

برکت اپنی باہوں اور جانگھوں کے پٹھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا پریشانی سے دفتر کے سامنے چکر لگاتا رہا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد ستلی والا کی سرمئی رنگ کی گاڑی آئی۔

"پہاڑن کہاں ہے ؟" برکت نے ذرا تیز لہجے میں ستلی والا سے پوچھا۔

ستلی والا نے اُس کی تیز طبیعت کا اندازہ کر کے جواب دیا۔ "میم صاحب کی طبیعت خراب ہے۔"

برکت دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولا۔ "ہم اسے گھر لے جائیں گے۔"

"ابھی نہیں۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ ہم اُنھیں گھر پہنچا دیں گے۔ فکر مت کرو۔"

برکت نے ستلی والا کی راہ روک کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "ہم سے مت بنو۔ ہم سب

سمجھتے ہیں۔ کسی اور خیال میں مت رہنا۔ پہاڑن ہماری نکاحی عورت ہے۔ ہم تمہاری سب صاحبی جھاڑ کر رکھ دیں گے۔" برکت کی سانس سے شراب کی بو آرہی تھی۔ آنکھیں بھی لال تھیں۔

ستلی والا نے اپنے چوکیدار کی طرف دیکھا۔ چوکیدار نے آگے بڑھ کر برکت کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ایک طرف ڈھکیل دیا۔ "پیچھے ہٹو۔"

ستلی والا دفتر میں جا چھپا۔ برکت مونچھوں پر تاؤ دے دے کر گالیاں بکتا ہوا چلا گیا ...... سمجھ لیں گے!"

ستلی والا نے پہاڑن کی آیا اور مہاراجن کو خبر دے دی تھی کہ پہاڑن کو اسٹوڈیو میں بہت زور سے بخار آگیا تھا۔ دو چار روز میں گھر آجائے گی۔ فکر نہ کریں۔ وہ لوگ بڑی بے چینی سے پہاڑن کا انتظار کر رہی تھیں۔ انھوں نے پہاڑن کی بیماری کی خبر دے کر برکت کو یقین دلایا۔ لیکن برکت کو یقین نہ ہوا۔ اُسے شک تھا کہ ستلی والا نے پہاڑن کو اُڑا لیا ہے اور اُسے چھپائے ہوئے ہے۔ اُس کا خیال تھا، "شاید ان مادر ...... نے اِس کے ساتھ ایسا خراب سلوک کیا ہے کہ وہ اُٹھنے کے لائق نہیں ہے"۔ آیا اور مہاراجن کو مالکن کے بیمار ہونے کی پریشانی تھی۔ برکت کو صرف اپنا سہارا اُڑا لیے جانے کا غصّہ تھا۔

منورما کنیڈی بیچ سے واپس آئی تو اسے پتہ چلا کہ پارٹی کے دفتر سے اندھیری جانے والے سب لوگ سات بجے کی گاڑی سے جا چکے تھے۔ وہ اکیلی کہاں جاتی؟ "ریڈ فلیگ ہال" میں پارو کے ساتھ ہی ٹھہر گئی۔ اسے خیال نہ تھا کہ کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ پارو نے پوچھا تو یاد آیا۔ پارو اسے ایرانی ہوٹل میں لے گئی اور کچھ کھلا دیا۔ منورما اب تک سوما کے خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔

پارو نے خیال کیا کہ منورما طلاق کے صدمے سے اپنے ہوش میں نہ تھی۔ پارو نے اسے دلاسا تو دیا۔ لیکن سنسکار کے خلاف کام کرنے پر دکھی ہونے کے لیے پھٹکارا بھی۔

منورما کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ خاموش لیٹی رہی۔ دھرم شالہ میں اس کی کوٹھی پر سوما کے آنے سے لے کر لاہور میں بڑی بھابی اور ماں جی کا اسے نکلوا دینے جانے تک کی زندگی۔ سوما میں آہستہ آہستہ آتی ہوئی تبدیلی، اُس کے دماغ میں گھومتی رہی۔ اس سے پہلے منورما ان تبدیلیوں کو صاف طور پر نہیں دیکھ پائی تھی۔ جب بھوشن لاہور میں آخری بار آیا تھا۔ منورما نے سوما کو بلا کر اُس کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ وہ سوما کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اور جاتے وقت کہہ گیا تھا۔ "اب دھن سنگھ آئے بھی تو کیا یہ اُس کے ساتھ رہ سکے گی؟" اب وہ خود کتنی تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ اسے فوراً پہچان نہیں

سکی تھی۔

منورما صبح آٹھ بجے پارٹی آفس پہنچی۔ اُس نے پچھلی رات کا واقعہ بھوشن کو سنایا۔
بھوشن نے حیرت سے بھنویں سکوڑ کر پوچھا۔ "سچ! سوما ہی پہاڑن ہے!۔"
منورما اور بھوشن نے اُس شام 'من کا چور' فلم دیکھی۔ اور سوما کو پہاڑن کے رُوپ میں اداکاری کرتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ بھوشن بار بار کہہ اُٹھتا تھا۔ "آدمی کیا ہے؟ اس کے کتنے روپ ہوسکتے ہیں؟ کوئی نہیں کہہ سکتا۔"
منورما اور بھوشن سینما سے لوٹ رہے تھے۔ منورما ستلی والا کے یہاں سوما سے ملاقات ہو جانے کا واقعہ دہرانے لگی۔ بھوشن نے ٹوک کر پوچھا۔ "تم یہ سوچو۔ اگر اب دھن سنگھ لوٹ کر اس کے سامنے آئے تو کیا ہوگا؟"
منورما نے گہری سانس لی۔ "اس بے چاری کا کیا قصور ہے؟"
"قصور نہ سہی۔" بھوشن نے سوال کیا۔ "لیکن ہوگا کیا؟"
"کاش وہ نہیں آئے۔" منورما نے لمبی سانس کھینچی۔
منورما ایسی تکلیف محسوس کر رہی تھی، جیسے سوما اُس کی بیٹی یا چھوٹی بہن ہو۔ وہ سوما کی زندگی کے لیے خود ہی ذمہ دار ہو...... وہ بے ہوش کیوں ہوگئی؟ وہ سوما کو گلے لگا کر دلاسا دینا چاہتی تھی۔ اُس کی بات سننا چاہتی تھی۔ لاہور سے گھر سے نکال دیے جانے پر کیا ہوا تھا۔ اب کیسی بیت رہی ہے؟ بے چاری نے بہت دھوکا کھایا ہے۔ اب تو بچے۔ کاش اُسے بتایا جاسکتا کہ ستلی والا کیسا آدمی ہے۔
منورما نے سوچا کہ ویوز کریڈل میں جا کر پتہ چلائے۔ لیکن ستلی والا نے جس لہجے میں کہا تھا۔ "اب آپ جائیے!" وہ وہاں کیسے جاسکتی تھی۔ منورما نے دو بار ویوز کریڈل میں فون کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ستلی والا نے جانے فون کو کیا کر دیا کہ گھنٹی ہی نہ بجتی تھی۔ سوما سے ملنے کے شوق میں منورما نے بمبئی میں اُس وقت پہاڑن کی چلنے والی سب فلمیں دیکھ ڈالیں۔ منورما نے بے بس ہو کر ستلی والا کو انگریزی میں ایک خط لکھا۔
"ڈیر مسٹر ستلی والا
میں یہ جاننے کے لیے بہت بے چین ہوں کہ پہاڑن کا کیا حال ہے؟ اُمید ہے کہ اُسے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔ اُس سے کہیے گا کہ میں ایک بار اُس سے ملنے کے لیے بہت

بے چین ہوں۔ اگر ممکن ہو تو میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

تیسرے دن جواب ملا۔

"ڈیر لیڈی۔

آپ کے خط کا شکریہ۔ مس پہاڑن مزے میں ہیں۔ آپ کے پیغام کے جواب میں اُن کی عرض ہے کہ آپ اُن کی فکر نہ کریں۔ وہ اسے ہی خاص مہربانی سمجھیں گی۔ شکریہ۔"

منورما کے دل کو دھکا لگا۔ سوچا۔ "یہ ستلی والا کی حرکت ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے، سوما اب مجھ سے نہ ملنا چاہتی ہو۔ کتنی تبدیلی آگئی ہے۔ اُس کی حیثیت میں ...... اور وہ بے ہوش کیوں ہو گئی تھی؟ بہرحال وہ خوش رہے۔ منورما کو ستلی والا کے جواب سے اتنی بے عزتی محسوس ہوئی کہ اُس نے اُس کا ذکر بھوشن سے بھی نہیں کیا۔

منورما کو معلوم ہو گیا تھا کہ پہاڑن اندھیری میں رہتی ہے۔ لیکن ستلی والا کا خط پا کر پہاڑن کے یہاں جانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا۔ ممکن ہے ایسا خط سوما ہی نے لکھوایا ہو۔ وہ دُکھ بھرے دنوں کی یاد سے دور رہنا چاہتی ہو۔ اس میں اس کا کیا قصور؟ میں نے کبھی اس کا کچھ بگاڑا نہیں۔ لیکن وہ تو سارے سماج سے ڈری ہوئی ہے۔ اپنی نئی زندگی کو بچانا چاہتی ہوگی۔ اُسے پچھلی ہر بات سے ڈر لگتا ہوگا۔

صبح اندھیری میں چائے پی کر دفتر میں جانا۔ دوپہر کا کھانا کیمون میں۔ شام کے وقت سات بجے کی گاڑی سے سب کے ساتھ واپس اندھیری آجانا۔ منورما کا روز کا پروگرام ایسا تھا کہ بھوشن سے ملنے کا وقت کم ہی ملتا تھا۔ لیکن اطمینان تھا۔ دونوں نزدیک تھے۔ شام کے وقت دونوں اگر گھنٹہ دو گھنٹے ساتھ رہنا چاہتے تو منورما اپنی ٹولی سے بچھڑ جاتی تھی۔ کوئی کچھ کہتا نہ تھا۔ لیکن ساتھیوں کا دھیان اس طرف جاتا تو منورما کو جھجک ہوتی۔

پارٹی کے مرد عورت ساتھیوں میں محبت کا سلسلہ نہ چلتا ہو، ایسی بات نہ تھی۔ ساتھی ونکٹ اور پاروتی کے بیاہ کی مٹھائی کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ رمیش اور سونیتی کی محبت بھی چل رہی تھی۔ یہ سارے لوگ جانتے تھے۔ منورما اور بھوشن بھی آپس میں ان کی بات کر کے خوش ہوتے تھے۔ لیکن نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی بات اور تھی۔ منورما اپنے اخبار کی معاون مدیر اور بھوشن بھی بزرگ کا مربّی سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایسے مذاق کی صورت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ہو تو باقاعدہ پارٹی کو خبر دے کر بیاہ ہو۔ طلاق کے فوراً بعد بیاہ بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اتنی جلد منورما کے دل سے اس واقعہ کی تلخی بھی دور نہیں ہو سکتی تھی۔ کبھی وہ سوچتی کتنی تکلیفیں اُٹھانے کے بعد کھوشن سے نزدیک ہو پائی ہے۔ اب بھی کیوں ترستی رہے؟ پھر اِس بے پایاں خوشی کے تصور سے کانپ اُٹھتی..... ہائے اتنی جلدی کیسے ہو سکتی ہے؟

پہاڑن کا بخار تیسرے دن شام کے وقت اُتر گیا تھا۔ لیکن ستلی والا نے دو دن اور اپنے یہاں رو کے رکھا۔ اسے ڈر تھا کہ برکت کے کمینہ پن سے پہاڑن کو کوئی دوسری تکلیف نہ پہنچے۔ پہاڑن کو خبردار کرنے کے لیے اس نے برکت کے اپنے دفتر پر آنے کا واقعہ بتا دیا تھا اور پہاڑن کو اُس سے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔

"وہ بڑا کمینہ ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تم اُس سے بچ کر رہنا۔" پہاڑن نے ستلی والا کے لیے فکر مند ہو کر کہا۔

ستلی والا نے اسے اطمینان دلایا۔ "تم فکر نہ کرو۔ وہ ہم لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کا انتظام کر دوں گا۔"

پہاڑن اندھیری لوٹ کر اسٹوڈیو جانے لگی تھی۔ ستلی والا سے کبھی اسٹوڈیو میں ملاقات ہو جاتی تھی اور کبھی وہ اسٹوڈیو سے دیوز کریڈل ہو کر لوٹتی تھی۔ ستلی والا کو اُس نے اپنے یہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔ ضرورت ہوتی تو ستلی والا فون پر بات کر لیتا تھا۔

پہاڑن اور ستلی والا کے بیچ میں برکت ہی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ دونوں فکر مند تھے۔ کیسے کانٹے کو نکالا جائے؟ پہاڑن اب اس بدمعاش کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ستلی والا نے اطمینان دلایا۔ "گھبراؤ مت۔ یا تو وہ عمر بھر کے لیے جیل چلا جائے گا۔ یا پھر لامحدود سمندر ہے جس میں ممبئی کی لاکھوں لاشیں کھپ گئی ہیں۔"

پہاڑن کانپ اُٹھی۔ "نہ کہیں ایسا نہ کرنا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ تم پر کسی طرح کی آنچ نہ آئے۔ میں ایسے ہی اچھی ہوں۔"

برکت کا کمینہ پن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اُس نے ایک اور ساتھی کو بُلا کر رکھ لیا تھا۔ نیچے آنے جانے والوں کو ٹوک بیٹھتا۔ "کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" اسے شک تھا کہ ستلی والا دوسرے کے ہاتھ پیغام بھیجتا ہے۔ پہاڑن کے لیے یہ بے عزتی اور بے بسی ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔

دوبارہ ملاقات

دھن سنگھ آزاد ہند کے پینسٹھ سپاہیوں کے ساتھ بانکی پور جیل کیمپ سے رہا ہوا تھا۔ اُس نے معافی نہیں مانگی تھی اور نہ گرفتار ہونے پر جبراً آزاد ہند فوج میں بھرتی کر لیے جانے کا بہانہ کیا تھا۔ اس کی ساری تنخواہ ضبط کر لی گئی تھی۔ رہا ہونے پر اسے صرف پچیس روپے کرائے اور خوراک کے لیے ملے تھے۔

پٹنہ پہنچنے پر عوام نے آزاد ہند فوج کے لوگوں کو ہار پہنا کر اُن کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ جلسے میں اُن کی بہادریوں اور قربانیوں کی تعریف کی گئی۔ شام کے وقت کانگریس کی طرف سے سپاہیوں کو دعوت دی گئی۔ دوسرے دن بھی دونوں وقت دو بڑے آدمیوں نے دعوتیں دیں۔ اور جلسے میں آزاد ہند فوج کے بہادروں کو ہراول دستہ کہا گیا۔ ان کی تعریفیں کی گئیں۔

ساری عزّت اور توقیر پاتے وقت بھی دھن سنگھ کو ایک ہی فکر تھی۔ وہ جلد سے جلد پنجاب؛ دھرم شالہ لوٹ کر سوما کو ڈھونڈے۔ اب بھی انگریزی راج تھا۔ انگریزی راج کی پولس کا راج تھا۔ پنجاب اور دھرم شالہ وہ صرف نام اور بھیس بدل کر جا سکتا تھا۔ دھن سنگھ نے دل میں طے کیا کہ پہلے پٹنہ میں اپنے لیے کوئی محفوظ جگہ بنالے۔ پھر چپکے سے کانگڑا جا کر سوما کو لے آئے گا۔ لوگ کہتے تھے کانگریسی راج ہو گیا ہے لیکن اُسے کوئی فرق نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس نے مایوس ہو کر دل ہی دل میں کہا ؛ جیسی آزادی ملک بھر کو مل گئی ہے، ویسی ہی ہمیں بھی مل گئی ہے۔ جیسے سب نباہ کریں گے ویسے ہم بھی کر لیں گے۔،

خیر مقدم اور جلسوں کا طوفان جلد ہی ختم ہو گیا۔ دھن سنگھ ان لوگوں کے پاس مدد کے لیے پہنچا، جنھوں نے اس کی عزّت افزائی اور تعریف کی تھی۔ وہ خیرات نہیں چاہتا تھا۔ چاہتا تھا کہ اسے نوکری دلادی جائے۔ جلسے اور خیر مقدم کرنے والوں کو نوکری اور روزی ڈھونڈنے کا جھمیلا پسند نہیں آیا۔ اُسے رائے دی گئی: 'اپنے دیش اور اپنے لوگوں میں جا کر نوکری ڈھونڈنا اچھا ہوگا۔ نوکری میں جان پہچان اور ضمانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تمہارے گھر بار کو کون جانتا ہے۔'

دھن سنگھ نے عزّت، احترام اور خیر مقدم کے کھوکھلے پن سے مایوس ہو کر سوچا۔ وہ کیا کرے؟ جاننے پہچاننے والے لوگ تو کانگڑا اور دھرم شالہ میں ہی تھے۔ لیکن وہاں جانے کی ہمت نہ تھی۔ اس پریشانی

میں یاد آیا ارجن لال!

دھن سنگھ کان پور پہنچا۔ کان پور میں آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کے خیر مقدم، بھلائی اور قیام کے لیے کیمپ میں اچھا خاصہ انتظام تھا۔ دھن سنگھ وہاں نہ جاکر ارجن لال کا پتہ چلانے کے لیے پریڈ کے نزدیک کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں گنیش سے ملا۔ گنیش نے ارجن لال کا پتہ بتادیا۔ ارجن لال کانگریس کے نیے چناؤ میں مصروف دیہاتوں میں گھوم رہا تھا۔ دھن سنگھ گنیش کے پاس لوٹ آیا اور نوکری کی بات کرنے لگا۔ شام کے وقت گنیش اسے سینما دکھانے کے لیے لے گیا۔

کان پور میں 'جلتا گھونسلہ' فلم چل رہی تھی۔ دھن سنگھ نے دیماپور کیمپ میں دو چار بار سپاہیوں کو دکھائی جانے والی فلمیں دیکھی تھیں۔ آزاد ہند فوج میں، اور بعد میں لگ بھگ ایک برس جیل کیمپ میں اسے فلم دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ بڑے شوق سے فلم دیکھ رہا تھا۔ پہاڑن کو پردے پر دیکھ کر جیسے اُسے بجلی سی چھو گئی۔ اُس نے شک سے آنکھیں پھیلا کر پھر دیکھا، اور بہت دھیان سے دیکھا۔ بائیں گال کے نیچے جبڑے پر تل بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آواز بھی بالکل وہی تھی۔

فلم میں پہاڑن نے گایا۔" سا سوری، تیرا بٹیاری، میرے جوبن کو ہاتھ لگائے۔" آواز سوما کی سی لگی۔ دھن سنگھ کے لیے سکون سے بیٹھ کر فلم دیکھنا ممکن نہ رہا۔ پردے پر ہیرو پہاڑن کو تنہائی میں اپنی باہنوں میں لے رہا تھا اور پہاڑن شرما کر مسکرا رہی تھی۔

دھن سنگھ کا سر گھوم گیا۔ اسے پسینہ آ گیا۔

دھن سنگھ کی بے چینی دیکھ کر گنیش نے پوچھا۔" کیا بات ہے ساتھی؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟"

دھن سنگھ نے لمبی سانس لے کر جواب دیا۔" بہت زور سے سر میں درد ہو گیا ہے۔"

گنیش اُسے سینما سے آدھے میں ہی اُٹھا لایا۔ دھن سنگھ رات میں کھانا نہیں کھا سکا۔ پارٹی آفس میں واپس آکر چٹائی پر لیٹ گیا۔

دھن سنگھ نے گنیش سے پوچھا۔" یہ سینما کہاں بنتا ہے؟"

"یہ فلم بمبئی میں بنی ہے..... کیوں؟" گنیش نے پوچھا۔ دھن سنگھ کوئی جواب نہ دے کر چپ رہ گیا۔ گنیش نے اپنا سوال دہرایا۔ دھن سنگھ نے پوچھ لیا۔

"بمبئی کی گاڑی کس وقت جاتی ہے؟"

"صبح گیارہ ساڑھے گیارہ بجے۔ کیا بمبئی جانا چاہتے ہو۔ کیوں؟"

"سوچ رہا ہوں۔ بمبئی کا کرایہ کتنا ہوتا ہے؟" دھن سنگھ نے پوچھا۔

گنیش نے کرایہ بتا کر پوچھا۔ "کیا بمبئی میں تمہارے اپنے آدمی ہیں؟"

دھن سنگھ چُپ رہا۔ گنیش نے پھر سوال کیا۔ "ساتھی بول نہیں رہے ہو!"

"سر میں درد ہے۔ نیند آرہی ہے۔" جواب دے کر دھن سنگھ چپ ہوگیا۔ لیکن سوچتا رہا۔ کیا دو عورتیں بالکل ایک ہی رنگ رُوپ کی ہوسکتی ہیں۔ کیا یہی سب دیکھنے کے لیے میں نے قتل جیسا جرم کیا اور برباد ہوتا رہا۔

بمبئی کے سمندر میں دھن سنگھ ایسے آ ملا تھا جیسے پانی کی ایک بوند اتھاہ موجوں میں آ ملے اور اپنی راہ کھوجنے کی کوشش کرے۔ بمبئی میں اس کے لیے پاؤں ٹکانے کی جگہ نہ تھی۔ کوئی اُس کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ وہ فوجی وردی پہنے۔ بغل میں اپنا کل اثاثہ، ایک چادر دبائے عالی شان عمارتوں کے نیچے پھیلی ہوئی سڑکوں پر موٹروں کی آمدورفت کے بہاؤ میں، فٹ پاتھ پر بھیڑ نہ ختم ہونے والی ریل پیل میں سوما کو۔ پہاڑن کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔

دھن سنگھ نہیں جانتا تھا۔ پہاڑن کو کہاں ڈھونڈے؟ دیواروں پر سوما کی ناچتی ہوئی مسکراتی ہوئی تصویریں ہر جگہ اُس کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ 'دیکھو، یہاں ہوں میں! یہاں ہوں میں! پکڑو مجھے! جائے کی دوکانوں پر جگہ جگہ سوما کی آواز گراموفون سے سنائی دے جاتی تھی۔ 'کس گلے ڈالو بہیاں میرے سیّاں، اِس اِدھ کرکے پریت'۔ جیسے وہ ہر طرف سے دھن سنگھ کو پکار پکار کر للکار رہی تھی۔ 'یہ ہوں میں۔ یہاں ہوں میں، پکڑو مجھے!'

دھن سنگھ نے پہلے دکھائی دینے والے دس بارہ آدمیوں کو راستے میں روک کر پوچھا۔ 'بھائی پہاڑن کہاں رہتی ہے؟"

دھن سنگھ کے سوال کا یا تو جواب ہی نہیں ملا۔ یا ہاتھ ہلا کر انکار میں جواب ملا۔ زیادہ جواب میں مذاق کی مسکراہٹ ملی۔ وہ کھیت واڑی کے ایک سینما ہال کے پاس پہنچ گیا۔ شام کا شو شروع ہونے والا تھا۔ دیواروں اور بڑے بڑے تختوں پر پہاڑن کے تیکھے چتون سے دیکھتی تصویریں لگی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر اُس کے گانے بج رہے تھے۔ دھن سنگھ نے سوچا۔ یہ لوگ سوما کا سینما دیکھتے ہیں۔ انھیں اُس کی جگہ ضرور معلوم ہوگی۔ اُس نے کئی آدمیوں سے سوال کیا۔ لوگ مسکرا کر یا جھنجلاہٹ سے مُنہ پھیر لیتے تھے۔

ایک آدمی نے دھن سنگھ کو جواب دے دیا۔ "ابے کیا کرے گا پہاڑن کا گھر پوچھ کر، یہاں پانچ آنے کے ٹکٹ میں پہاڑن سے دو گھنٹے موج کر، اور اپنے گھر جاؤ۔" اِس بے عزّتی پر دھن سنگھ کے بدن

میں بجلی نہیں کوندی۔ اُسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ وہ ہونٹ دبائے چپ کھڑا رہا۔ کوئی راستہ نہ تھا۔ اُس نے پھر بھلے دکھائی دینے والے لوگوں سے اپنا سوال دہرانا شروع کر دیا۔

دھن سنگھ کو ایک شریف آدمی مل گیا۔ اُس نے بتا دیا۔ "پہاڑن اندھیری میں رہتی ہے۔" بھلے آدمی نے اُسے اندھیری کی راہ بھی بتا دی۔ "چرنی روڈ اسٹیشن سے گاڑی پکڑو۔ چار پیسے میں اندھیری پہنچ جاؤ گے۔"

دھن سنگھ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ اسٹیشن کا راستہ پوچھ کر وہ بجلی کی گاڑی میں جا بیٹھا، جو سرسر کرتی آتی ہے، اور کھڑی ہونے سے پہلے چل بھی دیتی ہے۔ وہ ہر اسٹیشن کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہیں اندھیری نکل نہ جائے۔ دوسرے ہی اسٹیشن پر پانچ چھ جوان لڑکیاں اور تین لڑکے سادہ کپڑے پہنے آپس میں بات چیت کرتے اس ڈبے میں آ گئے۔

دھن سنگھ کو ایک عورت کا چہرہ پہچانا سا لگا۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ چہرہ بہت بدل گیا تھا۔ لیکن یقینی طور پر منورما بی بی، لالہ جی کی لڑکی تھی۔ چہرے پر تھکن اور روکھاپن محسوس ہوا۔ شاید بیمار ہو لیکن اُداس نہ تھی۔ دھن سنگھ دھرم شالہ میں سوما کو ان کے گھر پر ہی چھوڑ آیا تھا۔ سوچا شاید یہ سب لوگ بمبئی میں آ گئے ہوں۔ سوما انھیں کے یہاں سینما کا کام کرتی ہوگی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ منورما بی بی کے ساتھ وہ سوما کے یہاں چلا جائے گا۔ منورما کی طرف سے اُس نے آنکھیں نہیں ہٹائیں۔ کہیں راہ سے پھر نہ بھٹک جائے۔ اندھیری میں منورما دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گاڑی سے اُتر گئی۔ دھن سنگھ بھی اُتر گیا۔ دھن سنگھ کی ہمت نہ ہوئی کہ منورما کو پکار لیتا۔ منورما دوسری لڑکیوں کے ساتھ بات چیت کرتی جا رہی تھی۔ دھن سنگھ اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دھن سنگھ ان لوگوں کے ساتھ اسٹیشن کے پُل سے پار ہو گیا۔ کچھ دوری پر وہ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ اسٹیشن کے پاس کی گھنی آبادی سے گزر کر وہ لوگ درختوں سے گھرے ایک بڑے بنگلے میں پہنچے۔ دھن سنگھ جانتا تھا کہ یہ لوگ دھرم شالہ میں بھی بنگلے میں رہتے تھے۔ منورما اندر چلی گئی۔ دھن سنگھ بنگلے کے برآمدے کے نیچے کھڑا چاروں طرف سوما کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کسی نے اسے ٹوکا نہیں۔ لیکن سوما اسے دکھائی نہیں دی۔

دھن سنگھ نے برآمدے میں ایک مرد کو دیکھ کر پکار لیا۔ "ذرا سوما کو بھیج دیجیے۔"

"کون سوما؟" اُس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

"سوما، پہاڑن"

"پہاڑن؟ اِدھر پہاڑن نہیں ہے۔ اُدھر دوسرے بازو جاؤ۔" وہ شخص اندر چلا جا رہا تھا کہ دھن سنگھ

نے پھر پکارا "منورما بی جی کو بلا دو۔"

"منورما کو تمہارا کیا نام بولوں گا؟"

دھن سنگھ نے سہمتے ہوئے اپنا نام بتا دیا۔

منورما آئی۔ گھبرائی ہوئی تھی۔ جیسے سانس رُک رہی ہو۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھن سنگھ کی طرف دیکھا اور پہچانا۔ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

دھن سنگھ دھیمے اور جھجکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سوما.....۔"

منورما اسے ہاتھ کے اشارے سے اندر بلا لے گئی۔ فرش پر بچھی دری پر دھن سنگھ کو بٹھا کر اُس کے نزدیک بیٹھ گئی۔ "تم کہاں تھے؟"

دھن سنگھ نے بغیر کسی جھجک کے سب کچھ بتا دیا۔ پھر پوچھا۔ "سوما کہاں ہے؟"

منورما نے اس کے سوال کا جواب نہ دے کر سوال کر دیا۔ "پہاڑ گئے تھے؟"

دھن سنگھ نے سر ہلا کر نہیں کہا۔

منورما نے پوچھا۔ "لاہور گئے تھے؟"

دھن سنگھ نے انکار میں سر ہلا دیا۔

منورما نے سوچ کر پوچھ لیا۔ "سینما دیکھ کر اس کا پتہ لگا!"

"ہاں۔ اُسے خبر کر دیجیے۔" دھن سنگھ نے بھروسے کے ساتھ سانس لیا۔

منورما نے اِس سوال کو ٹالنے کے لیے کہا۔ "سنو دھن سنگھ، اُس وقت سے تو کیا سے کیا ہو گیا۔ میں اب یہاں کمیونسٹ پارٹی میں، ایک اخبار میں کام کر رہی ہوں۔ اتنے برس سے لاہور نہیں گئی۔ وہاں کی کچھ بھی خبر نہیں۔" وہ جانتی تھی دھن سنگھ کے لیے یہ سب بے کار باتیں تھیں۔

منورما نے کہا۔ "سوما لاہور میں تو ہمارے ہی یہاں تھی۔ اب بمبئی میں ہے۔ کامریڈ بھوشن کو جانتے ہو نا۔ تمہیں وہی تو دھرم شالہ میں لائے تھے؟"

"جی!"

بھوشن یہاں بمبئی میں ہیں۔ سوما کا مکان شاید انھیں معلوم ہو گا۔ آج یہاں ٹھہرو۔ کل تمھیں ان سے ملا دوں گی۔ تم نے کھانا کھایا ہے؟"

دھن سنگھ نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"ٹھہرو!" منورما اندر چلی گئی۔ واپس آ کر دھن سنگھ کو اندر لے گئی۔ کئی مرد اور عورت چٹائیوں پر

قطار میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ دھن سنگھ کو ان کے ساتھ بٹھا دیا۔

منورما نے دھن سنگھ کو لیٹنے کے لیے ایک دری اور چادر دے دی تھی۔ دن بھر کا تھکا دھن سنگھ برآمدے میں لیٹتے پر فوراً سو گیا۔ منورما دوسری لڑکیوں کے ساتھ اندر، کمرے میں بجلی بجھا دی جانے کے بعد بھی اپنی مسہری ہی میں آنکھیں کھولے پڑی رہی۔

منورما دوسرے دن دھن سنگھ کو لے کر پارٹی آفس میں بھوشن کے پاس پہنچی۔ سوما کے لیے دھن سنگھ کی پریشانی ظاہر تھی۔ دونوں بہت پریشان تھے۔ کیا کیا جائے؟

بھوشن اور منورما دونوں انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ دھن سنگھ گھبرا کر کبھی ایک کی طرف دیکھتا اور کبھی دوسرے کی طرف۔ دونوں کی رائے تھی کہ دھن سنگھ کو سوما کے پاس پہنچانا ٹھیک نہیں۔ لیکن انکار کرتے نہ بنتا تھا۔ دھن سنگھ کو کیا کہتے؟ منورما نے بھوشن سے کہا۔ "وہ مجھے دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوگی؟"

بھوشن نے دھن سنگھ کو سمجھایا۔ "تم اسے چھوڑ گئے تھے تو اس کے لیے کوئی سہارا نہ تھا۔ ان لوگوں نے اسے بدنام کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ جوان عورت کو سہارا نہ ہو تو دنیا اُس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ تم تھے تو بھی لوگ اسے پریشان کرتے تھے۔ تمہارے پیچھے کیا حالت ہوئی ہوگی۔ روٹی کپڑے کی پریشانی، رہنے کی جگہ نہیں۔ در در ٹھوکریں کھاتی۔ ایک ایک کے ہاتھ بکتی پھرتی۔ اُس نے اب یہ کام کر لیا ہے۔ اُس کا بہت نام ہے۔ سنا ہے ایک لکھ پتی سے اُس کا بیاہ ہو رہا ہے۔ تم سوچو۔ تم جاؤ گے تو اُس کی کیا حالت ہوگی؟ وہ بے چاری اب کر بھی کیا سکتی ہے؟ اسے تمہاری کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔ تم نے کبھی خط تک نہیں لکھا جو اسے کوئی امید رہتی۔ وہ کرتی کیا؟ اُسے کیا کوئی الزام دے!"

دھن سنگھ کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ "آپ مجھے اس کا ٹھکانا بتا دیجیے۔ میں ایک بار اُس کے یہاں جاؤں گا۔ میں ایک بار اُس سے ملوں گا ضرور۔"

بھوشن نے سمجھایا۔ "فائدہ کیا ہوگا؟ تمہیں بُرا معلوم ہوگا۔ اُسے بُرا لگے گا۔ بہت ہوگا تو وہ دُکھی ہو کر زہر کھا لے گی۔ تم کیا یہی چاہتے ہو؟"

دھن سنگھ اور بھی بے تاب ہو گیا۔ "آپ جانتے ہیں میں نے اس کے لیے کیا نہیں کیا؟ نوکری سے گیا۔ جیل کاٹی۔ خون کیے۔ پھر جیل کاٹی۔ پھر بن بن کا پانی پیا۔ پھر جیل کاٹی۔ میں دیکھوں سہی، مجھے وہ کیا جواب دیتی ہے۔"

منورما نے بھوشن کو انگریزی میں کہہ دیا: "یہ آدمی اب بھی اس سے اتنی محبت کرتا ہے۔ ایک دن سوما بھی اس کے لیے جان دینے کو تیار تھی۔ ممکن ہے وہ سب کچھ مجبوری میں کر رہی ہو۔ اس کے دل میں اِس کے لیے محبت زندہ ہو تو وہ اس کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتی ہے۔ تم ان کے راستے میں رُکاوٹ کیوں بن رہے ہو؟" منورما ایک سانس میں کہہ گئی۔

بھوشن نے دانت سے ہونٹ کاٹ کر انکار میں سر ہلا دیا۔

منورما نے رُندھی ہوئی آواز میں اصرار کیا: "آخر اِس آدمی کے ساتھ تم اتنا بڑا ظلم کیوں کر رہے ہو؟ اُسے ایک موقع دو۔"

بھوشن نے منورما کی وحشت زدہ آنکھوں سے آنکھیں بچاکر جواب دیا: "انجام کے لیے ذمّہ دار تم ہوں گی!"

"ہاں!" منورما نے مان لیا: "لیکن میری رائے ہے کہ تم اِس کے ساتھ جاؤ۔ کوئی بات ہوگی تو تم سنبھال سکتے ہو۔ تم ہی نے ۱۹۴۶ء میں انھیں ملایا تھا۔"

بھوشن نہ چاہنے کے باوجود دوپہر بعد دھن سنگھ کو لے کر اندھیری گیا۔

برکت کو شک تھا کہ ستلی والا پہاڑن کو اُڑا لے جانے کی کوشش میں ہے۔ اور اسے اپنے آزاد ہند فوج کے سپاہی چوکیدار سے پٹوانے کی سازش کر رہا ہے۔ اِس لیے برکت نے امین کو بُلاکر اندھیری میں اپنے ساتھ ٹھہرا لیا تھا۔ اسے زہر نہ کھلا دیا جائے۔ اِس خوف سے وہ پہاڑن کے گھر کا کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔ برکت اور امین میں سے ایک آدمی ہر وقت پہرے پر بیٹھا رہتا تھا۔

امین حفاظت کے لیے برآمدے کے کونے میں کھاٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک آدمی کو فوجی وردی میں اور دوسرے کو معمولی کھدر کے کپڑے پہنے بنگلے کے اندر آتے دیکھ کر چونکا۔

بھوشن نے امین سے کہا: "بھیا مس پہاڑن سے ملیں گے۔"

"بڑے آئے ملنے والے۔" امین نے جواب دیا: "خبردار چلے جاؤ اُلٹے پاؤں۔"

دھن سنگھ بھوشن کے ساتھ ایک گنوار آدمی کی گستاخی دیکھ کر آگے بڑھ گیا اور ڈانٹ کر بولا: "زبان سنبھال کر بولو۔" دھن سنگھ جوش میں برآمدے میں چڑھ گیا۔

امین پاس پڑا ہوا ڈنڈا اُٹھاکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے پکارا: "برکت میاں جلدی آنا۔۔ اور آگے

بڑھ کر اپنے ڈنڈے سے دھن سنگھ کے سینے پر ایک ٹھوکا دے کر کہا۔ "پیچھے ہٹو۔"

دھن سنگھ نے ایک ہاتھ سے امین کا ڈنڈا چھین کر دوسرے ہاتھ سے کرارا طمانچہ اس کی کن پٹی پر جڑ دیا۔ امین کا بدن بس ایسا ویسا ہی تھا۔ نشے سے اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ وہ طمانچہ کھا کر لڑھک گیا۔ سر پتھر کے فرش پر ٹکرانے سے امین چلا اُٹھا۔ "مار ڈالا! مار ڈالا!"

بھوشن دو تین قدم پیچھے ہٹا۔ وہ دھن سنگھ اور امین میں بیچ بچاؤ کرنے کے لیے آگے لپکا کہ بائیں طرف کی کوٹھری سے برکت نکل آیا۔ اپنے ساتھی کو مار کر گرا ہوا دیکھ کر اُس نے اپنے تہمد سے ایک چھرا کھینچ لیا اور دھن سنگھ پر ٹوٹ پڑا۔ دھن سنگھ اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش میں فرش پر پھسل گیا۔ برکت دھن سنگھ پر چھرے سے وار کر چکا تھا۔ بھوشن کے بیچ میں آجانے سے چھرا بھوشن کے کندھے پر پڑ گیا۔

دھن سنگھ سنبھل کر اُٹھا اور ڈنڈا لے کر برکت پر جھپٹا۔ لیکن برکت خون بہتا دیکھ کر پکڑ لیے جانے کے ڈر سے بنگلے کے پھاٹک سے باہر بھاگ گیا۔

دھن سنگھ بھوشن کی مدد کے لیے جھکا۔ چھرا ہنسلی کے پاس چار انگلی گہرا دھنس گیا تھا۔ بہت سا خون بہہ گیا تھا۔ پہاڑن کی آیا جھگڑا سن کر برآمدے میں آگئی۔ خون دیکھ کر وہ چلا اُٹھی۔ آیا کی چیخ سُن کر پہاڑن نکل آئی۔ ایک آدمی کو سپاہی کی وردی پہنے اور دوسرے کو خون سے لت پت دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

دھن سنگھ بھوشن کے زخم پر ہاتھ رکھ کر خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خون بہہ جانے سے بھوشن کا سر چکرا گیا تھا۔ وہ کھمبے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا تھا۔

بھوشن نے پہاڑن کی گھبراہٹ دیکھ کر اُس سے کہا۔ "سوما گھبراؤ مت۔ تم نے پہچانا نہیں؟ میں بھوشن ہوں۔ یہ دھن سنگھ ہے۔"

پہاڑن نے سہارے کے لیے دونوں ہاتھوں سے کواڑ کو تھام لیا۔ گہری سانسوں کی وجہ سے اس کا سینہ جوار بھاٹے کی لہر کی طرح اُٹھ بیٹھ رہا تھا۔

اندر کے کمرے سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ گھنٹی رُکنے پر آیا نے پہاڑن کو پکارا۔ "میم صاحب! صاحب بول رہے ہیں۔"

آیا نے پہاڑن کو گھبراہٹ میں بدحواس دیکھ کر فون پر جواب دیا۔ "حضور، برکت بنگلے پر خون کر کے بھاگ گیا ہے۔ میم صاحب بہت گھبرائی ہوئی ہیں۔"

"یہ دھن سنگھ ہے سوما۔" بھوشن نے تکلیف کے باوجود مسکرانے کی کوشش کی۔

دھن سنگھ آنکھیں پھاڑے سوما کی طرف دیکھ رہا تھا۔
سوما کی نگاہیں فرش پر تھیں اور اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اُس نے کواڑ کو اور زور سے پکڑ لیا۔

"پہچانا نہیں سوما!" بھوشن نے پھر سوال کیا۔
سوما نے پتھرائی آنکھیں بھوشن کی طرف اُٹھا کر جواب دیا۔" آپ لوگ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں؟ میں سوما نہیں ہوں۔ میں نہیں ہوں سوما۔" اُس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ گالوں پر دو بوند آنسو بہہ آئے تھے۔

"ٹھیک کہتی ہو تم سوما نہیں ہو۔" بھوشن کی آواز سخت ہو گئی۔ پہاڑن اندر جانے کے لیے گھوم گئی۔
"مس پہاڑن۔" بھوشن نے پھر پکارا۔" یہ حادثہ تمہارے یہاں ہوا ہے۔ تم مفت میں پھنسو گی۔ اگر تم اپنی گاڑی دے دو تو یہ آدمی مجھے ہسپتال پہنچا دے گا۔"
"گاڑی لے جائیے۔" پہاڑن نے کہا۔ اور دیوار کا سہارا لے کر اندر چلی گئی۔
دھن سنگھ نے آیا سے پوچھا۔"گاڑی کہاں ہے؟"
آیا نے ڈرائیور کو گاڑی کے لیے پکارا۔
دھن سنگھ بھوشن کو سنبھالے گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسی وقت ایک بڑی سی سرمئی رنگ کی گاڑی بنگلے میں آئی۔
ستلی والا نے گاڑی سے اُتر کر ایک سرسری نظر واقعہ پر ڈالی اور اندر چلا گیا۔ اُس نے آیا سے بات کی۔ پھر پہاڑن سے تفصیل پوچھی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سوچتے ہوئے کمرے کے دو چکر لگائے۔ اُس نے آیا کو پہاڑن کی گاڑی دینے کے لیے منع کر دیا۔ اور پولس کو فون کر دیا۔"مس پہاڑن کے مکان پر غنڈوں میں مار پیٹ ہو گئی ہے۔ چھرا چل گیا ہے۔ ایک آدمی زخمی پڑا ہے۔ مہربانی کر کے جلدی آ کر حالات کو سنبھالیے۔"
چند منٹ میں پولس آ گئی۔ انسپکٹر نے آیا کا بیان لیا۔ پہاڑن کا بھی بیان لیا گیا۔ ستلی والا داروغہ کو ساری باتیں انگریزی سمجھا رہا تھا

بھوشن نے انگریزی میں تردید کر دی۔"یہ سب بکواس ہے جھوٹ ہے۔"
داروغہ نے اُسے اطمینان دلایا۔" میں آپ کا بھی بیان لوں گا۔ ٹھہریئے۔"
پولس نے بھوشن کو گاڑی میں ہسپتال پہنچا دیا اور دھن سنگھ کو حراست میں لے لیا۔

منورما اور دوسرے لوگ فون پر خبر پاکر ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی۔ چوٹ لگنے سے بہت دیر تک خون نکلتے رہنے سے بھوشن کی حالت تشویش ناک ہوگئی تھی۔ زخم سے خون میں کسی طرح کا زہر بھی چلا گیا تھا۔ اسے انجکشن لگائے جا رہے تھے۔ لیکن حالت سُدھر نہیں رہی تھی۔

منورما جذباتی چوٹ سے ایک دم بے جان اور پریشان سی ہو رہی تھی۔ وہ دو ساتھیوں کے ساتھ بھوشن کے پلنگ کے پاس بیٹھی تھی۔ بھوشن نیم بے ہوشی کے عالم میں بار بار دہرا رہا تھا "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا" کبھی وہ کچھ اور بڑبڑانے لگتا۔ بھوشن کی بات دوسروں کے لیے صاف تھی۔ لیکن منورما کو یاد تھا۔ بھوشن نے کہا تھا۔ "انجام کے لیے ذمّہ دار تم ہوگی۔"

ڈاکٹر نے بھوشن کے بدن میں خون چڑھانے کا انتظام کیا۔ کامریڈ آور ے اور منورما خون دینے کے لیے تیار ہوگئے۔ ڈاکٹر نے ایک ساتھی کا خون لے لیا۔ لیکن خون بھوشن کے بدن میں چڑھانے سے پہلے اچانک اُس کی حالت خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر نے خون دینا بے کار سمجھا۔ لیکن ساتھیوں کے اصرار سے خون دے دیا گیا۔

پارٹی سکریٹری جوشی اور بی۔ ٹی۔ دفتر سے ہسپتال پہنچے۔ وہ منورما سے واقعہ کی وجہ اور تفصیل جاننا چاہتے تھے لیکن بول نہیں سکتی تھی۔

بھوشن کو آخری علاج کی شکل میں آکسیجن دیا جا رہا تھا۔ کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھنے والا ایک ڈاکٹر بھوشن کی نبض ہاتھ میں لیے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھوشن کا ہاتھ آہستہ سے پلنگ پر رکھ دیا۔ اور سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولا۔ "ختم۔"

منورما بھوشن کے پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھی تھی۔ وہ اُٹھی اور وارڈ کے برآمدے کی طرف جھپٹی۔ وارڈ دوسری منزل پر تھا۔ جوشی نے اس سے تیز چال سے بڑھ کر برآمدے کی طرف جاتی ہوئی منورما کی بانہہ زور سے تھام لی اور پیچھے کھینچ لیا۔ جوشی نے اپنی مچی ہوئی آنکھیں پھیلا کر ڈانٹا۔ "ساتھی! اس سے بڑے کام کے لیے تمہیں زندہ رہنا ہے۔"

منورما بے ہوش ہوگئی۔

منورما کو ہوش آیا تو دھن سنگھ کی فکر ہوئی۔ پارٹی سے تعلق رکھنے والے وکیلوں کے ذریعے اُس نے ضمانت پر دھن سنگھ کی رہائی کی کوشش کی۔ وکیلوں کو پولس سے پتہ چلا کہ دھن سنگھ نے بھوشن پر کسی طرح آنچ نہ آنے دینے کے لیے اپنی ساری کہانی سچ سچ بیان کر دی تھی۔ بمبئی کی پولس برکت کی تلاش کر رہی تھی۔ اور دھن سنگھ پانچ برس پہلے پنجاب دھرم شالہ میں قتل کا الزام قبول

کرنے کی وجہ سے حراست میں تھا۔ اس کی ضمانت دھرم شالہ کی عدالت سے ہی ہو سکتی تھی۔
منورما کی دماغی اور جسمانی حالت کی وجہ سے اسے پارٹی کوارٹر میں ایک کمرے میں چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا۔ سومتی نے اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لے لی تھی۔ پارٹی کا ڈاکٹر اُسے بار بار دوا دے رہا تھا۔ اُسے سکریٹری کا پیغام دے دیا گیا تھا کہ جب وہ خود کو صحت مند محسوس کرے تو سکریٹری اس سے مل کر واقعے کی پوری تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔
منورما سے جیسے بھی بنا، اُس نے بھوشن کو دھن سنگھ کے ساتھ پہاڑن کے یہاں بھیجنے اور پہاڑن اور دھن سنگھ کی پُرانی کہانی سکریٹری کو بتا دی۔ منورما کے سامنے کوئی ساتھی کچھ نہ کہتا تھا۔ لیکن برآمدے سے بات چیت اُس کے کانوں میں پہنچتی تھی۔ پارٹی کے نیتا لوگ خفا تھے۔ اُن کی رائے میں بھوشن جیسے پارٹی کے ذمہ دار شخص کو پارٹی کی رائے لیے بغیر ایسے کام میں پھنسنا مناسب نہ تھا۔ پارٹی کے مخالف کسی پارٹی کے ممبر کی زندگی کے واقعے کو لے کر پارٹی پر الزام لگانے سے باز نہیں رہیں گے۔ نومبر کے مہینے میں پارٹی کے دفتر پر حملہ ہونے کے وقت سے کمیونسٹ مخالف اخباروں نے کیا کیا نہیں لکھا تھا۔ ممبروں کے شخصی طور طریقے سے بھی پوری پارٹی پر اثر پڑتا ہے۔ منورما سُن کر چُپ تھی۔
صبح کے روزانہ اخباروں کو بانٹنے کا کام کامریڈ بھونسلے کرتا تھا۔ بھونسلے نے بیمار منورما سے ہمدردی کر کے ایک اخبار سب سے پہلے اُسے دے دیا تھا۔ سخت کمیونسٹ مخالف اخبار کے پہلے ہی صفحے پر خبر تھی۔
مشہور کمیونسٹ نیتا کامریڈ بھوشن ایک غنڈے سے جھگڑے میں زخمی ہو کر ہسپتال میں.....؛ اس کے بعد نیچے تفصیل تھی۔
"معلوم ہوا ہے کہ ایکٹرس مس پہاڑن کے لیے مقامی غنڈوں اور کامریڈ بھوشن میں بہت دنوں سے جھگڑا چل رہا تھا۔ کامریڈ بھوشن نے اپنے ایک غنڈے دوست کو پنجاب سے بلا کر مقامی غنڈوں پر حملہ کیا اور خود زخمی ہو گیا۔ پروڈیوسر سُری ستلی والا نے واقعے کی خبر پاکر پولس کو بلانے اور حالت کو سنبھالنے میں ہمت اور عقل مندی کا ثبوت دیا۔ بھوشن ہسپتال میں ہے۔ مقامی غنڈے فرار ہو گئے ہیں۔ بھوشن کا دوست حراست میں لے لیا گیا ہے۔ کمیونسٹوں نے بھوشن کے دوست کی ضمانت کرانی چاہی لیکن ضمانت منظور نہیں ہوئی۔" خبر پڑھ کر اخبار منورما کے ہاتھ سے گر گیا۔
ساتھی سومیتی نے آکر دیکھا۔ منورما بے ہوش پڑی تھی۔ فوراً ڈاکٹر کو بُلایا گیا۔ اخبار پڑھ کر

منورما کے بے ہوش ہونے کا اندازہ ہوگیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد منورما نے آنکھیں کھولیں۔ پہلی بات اُس کے کان میں پڑی۔ باہر برآمدے میں کوئی بھونسلے پر ناراض ہو رہا تھا۔

"تم نے اخبار اُسے دیا کیوں ؟"

بھونسلے نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ساتھی بیمار ہے۔ اُس کا دل بہلانے کے لیے اخبار دیا تھا۔"

منورما پھر بے ہوش ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر پریشان تھا۔ اسے کب ہوش آئے گا ؟ آئے گا بھی یا نہیں؟ بیماری کی حالت میں دل پر چوٹ لگنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

